تحریکِ جد و جہاد

بطورِ

موضوعِ سخن

خواجہ منظور حسین

نیشنل بک فاؤنڈیشن

تحریکِ جد و جہاد

بطورِ

موضوعِ سخن

خواجہ منظور حسین

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اشاعت : اول

تعداد : گیارہ سو

قیمت : ۷۸ روپے

ناشر : نیشنل بک فاؤنڈیشن—فروری ۱۹۷۸

طابع : سید اظہارالحسن رضوی

مطبع : مطبعِ عالیہ، ۱۲۰، ٹمپل روڈ، لاہور

نذرِ سہیل

جواں مرگ سہیل افتخار (۲۰ مئی ۱۹۴۰ - ۴ مئی ۱۹۷۱) کی بہت سی دل پذیر خوبیوں میں فنونِ لطیفہ، ادب اور تاریخ سے شغف بھی شامل تھا۔ وہ بہت چاہتا تھا کہ جو چیزیں میرے کاغذوں میں سال ہا سال سے بکھری پڑی تھیں، ان میں سے کوئی چیز ترتیب دے کر میں اسے دیتا، اور وہ اپنے ذوق کے مطابق اسے چھپواتا۔ میرے دل پر اس کا بڑا بوجھ ہے کہ، اس تعلقِ خاطر کے باوجود جو مجھے عزیزِ مرحوم سے تھا، اس کی یہ محبت بھری فرمایش پوری کرنے سے قاصر رہا۔ وہ زندہ ہوتا تو یہ اوراق میں اسی کے حوالے کرتا، اور اب بھی بڑے حسرت بھرے دل سے اسی کی نذر کرتا ہوں

ترتیبِ مطالب

۷

۸

تعارف

ہماری زبان میں شاعری اور تاریخ کے باہمی تعلق پر کچھ نظری نوعیت کی قیل و قال تو کبھی کبھار ہوتی رہی ہے ، مگر کوی اہم تاریخی واقعہ ، اپنے پورے سیاق و سباق میں ، خود شاعری ، بالخصوص غزل کی اشارت و عبارت سے برآمد کرنے اور یہ دیکھنے دکھانے کی کوشش نہیں کی گیی کہ یہ شاعری کا موضوع کیسے بنا اور اس کا اظہار کن کن پیرایوں میں ہوا - اس تالیف کی دیدہ ریزی کا اصل مدعا اپنے اس دیرینہ اندازے کو مستحکم کرنا ہے کہ ہمارے سب قابلِ لحاظ شاعر ، اپنے کلام کے خالص داخلی اور روایتی اجزا کے پہلو بہ پہلو ، تاریخی حالات و معاملات پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے ، اور اپنے اپنے رنگ میں ، کیف و کم کے مختلف مدارج کے ساتھ ، انھیں اپنے فکرِ سخن کا موضوع بناتے رہے ہیں -

ان اوراق میں پہلی بار ذوق ، مومن ، شیفتہ ، آتش اور ناسخ کے کلام سے تحریکِ جدوجہاد اور اس کے متعلقات کے بارے میں ان شاعروں کے متنوع تاثرات اخذ کیے گیے ہیں - اسی تاریخی اور شعری تناظر میں سید احمد شہید ، شاہ اسماعیل شہید اور مولوی فضلِ حق کے ساتھ غالب کے رشتوں کی پیچ در پیچ گتھیاں کھولی

گیی ہیں ، اور ان کی شاعری کے لفظی و معنوی در و بست کو ٹٹول کے ، ان کے جذباتی اور فکری اتار چڑھاو کی روداد اور اس کے نفسی مضمنات کا تجزیہ کیا گیا ہے - اس سلسلے میں بعض تصفیہ طلب متعلقہ امور بھی زیرِ غور لاےگیے ہیں - آخر میں اقبال کے بعض اشاروں ، کنایوں کو کرید کے دکھایا ہے کہ سید صاحب اور شاہ صاحب اور ان کی تحریک کا شمار بھی ان گونا گوں موثرات میں ہے جن سے اقبال نے اکتسابِ جذب و فکر کیا - یہاں یہ اضافہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ یہ فیضان اسی نوعیت کا تھا جو انہوں نے ٹیپو سلطان شہید سے حاصل کیا - اس اثراندوزی کی ایک چشم دید شہادت حال ہی میں بہم پہنچی ہے - اس سے اقبال کے مزاج میں رقت اور صلابت ، سوز اور ساز کی یک جای کا بھی بڑا معنی خیز اظہار ہوتا ہے :

'اقبال کے پیشِ نظر جنوبی ہند کے اس طویل سفر کا ایک مقصد اس مردِ مجاہد کے روضے کی زیارت بھی تھا - وہ دو اڑھای گھنٹے تک اس کے اندر بند ہو کر مراقبہ کرتے رہے - اقبال اسے خودی کا ایک مثالی نمونہ اور مظہر جانتے تھے - فاتحہ اور مراقبے کے بعد باہر نکلے تو شدتِ گریہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سوج گیی تھیں - کچھ دیر بعد . . . میسور کے درباری موسیقار علی جان نے نہایت دل گداز انداز میں کلامِ اقبال سنایا - اشکباری کا سلسلہ ایک بار پھر

جاری ہو گیا ۔ حاضرین اتنے متاثر ہوے کہ ان پر بھی رقت طاری ہو گیی ۔ یہ سلسلہ دیر تک قایم رہا ۔ جب گانا ختم ہوا اور طبیعت ذرا اعتدال پر آی تو (ایک صاحب) نے اقبال سے دریافت کیا کہ 'آپ روضۂ سلطانِ شہید میں اتنی دیر راز و نیاز میں مصروف رہے' آپ کو وہاں سے کیا فیض حاصل ہوا ؟' اقبال نے جواب دیا : 'میرا ایک لمحہ بھی وہاں بے کار نہیں گزرا ۔ ایک پیغام تو یہ ملا ہے :

در جہان نہ توان اگر مردانہ زیست
ہم چو مردان ، جان سپردن زندگیست'[1]

''جاوید نامہ'' کے یہ شعر ، جو پیرِ روم کی زبان سے ادا کرائے گیے ہیں ، شاہد ہیں کہ اقبال کے قلب و نظر میں ٹیپو سلطان کا کیا مقام تھا :

آن شہیدانِ محبت را امام :
آبروے ہند و چین و روم و شام

نامش از خورشید و مہ تابندہ تر
خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر

---

[1] محمد عبداللہ قریشی : 'داستانے از دکن آوردہ ام'
'صحیفہ' اقبال نمبر ۱

عشق رازے بود : بر صحرا نہاد :
تو نہ دانی جان چہ مشتاقانہ داد ؟

از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین
قصرِ سلطان وارثِ جذبِ حسین

جس شوق اور مستعدی سے مطبعِ عالیہ کے بانی
سید اظہارالحسن رضوی نے ان اوراق کی چھپای کا اہتمام کیا ، اس
کے لیے میں ان کا بے حد ممنون ہوں - اس کام میں جو کسر رہ گیی ،
اس میں قصور اہلِ مطبع ہی کا نہیں ، میرا بھی ہے -

لاہور
۱۰ فروری ۱۹۷۸   خ م ح

۱

تمہید

ایک مشترک مخرج و موضوعِ سخن کی تلاش

میں اس جستجو میں ایک عرصے تک غلطاں و پیچاں رہا کہ اُن جذبات اور خیالات کے سرچشمے تک پہنچوں جو غالب اور اُن کے ہم عصر شاعروں کے دل و دماغ میں پکتے اور اُن کے کلام میں اُبلتے رہے۔ اندرونی شہادت نے تو مدت ہوئی میری نظر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی تھی، کہ یہ منبعِ فیض سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید ہی ہیں۔ مگر اس کی کوئی خارجی شہادت، سوائے مومن کی سید صاحب سے بیعت اور اُن کی تحریک پر بعض صریح اشعار کے، کسی صورت ہاتھ نہیں آتی تھی۔ یہ گتھی ۱۹۳۲ میں کھلی جب میں نے پہلی بار دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد کی اس سال کی اشاعت کے صفحہ ۱۷۹ پر یہ اندراج پڑھا:

'فرماتے تھے: جوانی کا عالم تھا اور طبعیت میں جوش۔ وہی دن تھے کہ مدرسہ' غازی الدین خاں کے وسیع کوٹھے پر مشاعرے ہوتے تھے۔ نواب امیر خاں سرکار سے عہد نامے کے لیے دہلی میں آئے۔ شہر کے لوگ دیکھنے کو دوڑے کہ باہر پنڈارے کا لشکر

پڑا ہے' - ہم بھی مدرسے گئے - - - - کوٹھے پر جا بیٹھے - دور تک خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے - ہم نے حسبِ حال یہ غزل کہی - کئی دن کے بعد مشاعرہ ہوا - لشکر کے لوگ (مدرسے کی مسجد میں نماز پڑھنے آیا کرتے تھے - انھیں بھی مشاعرے کی خبر ہوئی کہ رات کو جلسہ ہے - سب آئے - دوستوں کی فرمائش سے ہم نے یہ غزل پڑھی - بے چارے برسوں صحرا نوردی میں تھے اور اسلام کے نام سے ہر کام کرتے تھے - اب خطِ صلح میں آ کر اسے چھوڑنا تھا - سب دل شکستہ تھے - اکثر اشعار اُن کی صورت حال دکھاتے تھے - بڑی تعریفیں ہوئیں اور ص والے شعر پر تو، اللہ اللہ، خوب غلغلے اور ولولے ہوئے - بات سنائی نہ دیتی تھی :

موئے سرِ مارانِ سیہ کا ایک سراسر لشکر ہے
مانگ جو ہے اک مارِ سفید، اس لشکر کا سر لشکر ہے[۲]

چشمِ جاناں کا مژگاں سے تجمل دیکھو تو
اترا پشت پہ ماہی کے، کیا لے کے سمندر لشکر ہے!

[۱] اس کی فوجِ مژہ و چشم سے کر خوف، اے دل!
لشکر اترا لبِ دریا پر ہے پنڈاروں کا
شاہ نصیر

[۲] آزاد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ امیر خاں کے لشکر کا وہی بچا کھچا حصہ تھا جسے نہتا کرکے اپنے حال پہ چھوڑ دیا گیا تھا - 'سر لشکر' کو 'مارِ سفید' اس ہلاکت خیز کارروائی کی رعایت سے کہا گیا ہے جو اُس نے خود اپنی فوج کے خلاف اپنے نئے حلیف 'گوروں' سے کرائی -

ہوئے دل مظلوم ہمارا کیوں نہ شہیدِ دشتِ بلا ؟
درپے اُس کے شامیوں کا زلفِ معنبر لشکر ہے[1]

ص گاہ ہجومِ یاس میں ہے ، گاہ ہجومِ حسرت میں :
ہے یہ مردِ سپاہی پیشہ : پھرتا لشکر لشکر ہے

میں وہ شاہِ کشورِ غم ہوں ، یارو ، جس کے ساتھ سدا
فوجیں اشک کی موجیں ہیں ، اور بہتا سمندر لشکر ہے

ہوئے امامِ برحق پیدا ، ذوق ، اگر تو دیکھے کبھی
ہوتا گرد اسلامیوں کا سبحۂ گوہر لشکر ہے[2]

اس موضوع کے سیاق و سباق میں اس پر پورے غور و تامل کے بعد ، مجھے کامل یقین ہوگیا کہ جو کنجی میں اتنے عرصے تک شعر و ادب کے گوشے گوشے میں ڈھونڈتا رہا ، وہ آخر ہاتھ لگ گئی -

یہی واقعہ اس مبحث کے سارے متعلقات کا نقطۂ آغاز ہے - اس سانحے کی پوری روداد شاعروں تک امیر خاں کے مشیر و معتمدِ خاص اور اُس کے لشکر کے مذہبی رہ نما کی زبانی پہنچی ، جب وہ امیر خاں کی انگریزوں سے متابعت اور اُس کے لشکرِ جرار کی درہمی برہمی کے بعد ، اس سے قطع تعلق کرکے دہلی چلے آئے ،

---

[1] اس شعر کی در و بست تو یہی چاہتی ہے کہ یہ شہادتِ بالاکوٹ کے بعد کہا گیا ہو - آزاد کے ذہن اور حافظے نے استاد کا دیوان مرتب کرتے وقت جواب دینا شروع کر دیا تھا - بعید نہیں کہ ذوق نے یہ شعر بعد میں بڑھایا ہو -
[2] امیر خاں کے لشکر کے روحانی پیشوا ، حضرت سید احمد -

اور ولی اللہی خاندان کے چشم و چراغ ، شاہ عبدالعزیز کی اجازت سے ، آن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے ، اور آن کی مثال اور اثر سے ، مومن اور ذوق نے آن کی تقلید کی[۱] - غالب کو اس زمرے میں براہِ راست شاہ اسماعیل کھینچ کر لائے - سید صاحب اور شاہ صاحب نے ان سب کو اپنی تحریک کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا اور ، قوتِ عمل سے عاری پا کر ، قلم سے اس کے نقیب اور مبلغ بننے کی خدمت تفویض کی - بہ قولِ غالب :

محبت ہر دلے را کز نزاکت سرگران یابد
سبک در دامِ ذوقِ نالۂ مرغِ سحر گیرد

غالب نے اس خدمت پر مامور کیے جانے اور اس کی بجا آوری کا ذکر بھی کیا ہے :

برما خراجِ طبعِ روانے نہادہ ای

بھی تم بہ قلم کارِ تیغ ، و این کارے است
شگرف و نغز و پسندیدۂ اولو الالباب

---

[۱] "مرشدِ وقت" شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں ان اکابر خاندان ولی اللہی کا کسی دوسرے کی بیعت میں داخل ہونا معمولی واقعہ نہ تھا - اس کا بڑا چرچا ہوا - جوق در جوق علماء و فضلا و صالحین بیعت ہونے لگے -"

سید ابوالحسن علی : "سیرتِ سید احمد شہید" ۱۲۲

سرفروشوں کے اگر آپ طلب گار ہوے
تو گراں ہووے گی وہ جنس کہ کم یاب نہیں

کیا فتنۂ محشر کو قدر یار سے نسبت ؟
ہے خاص کشی ولولۂ عام نہ ہوگا   مومن

اس پس منظر میں اقبال کا کلام ٹٹولنے اور کھنگالنے سے ایک اور انکشاف ہوا ، اور وہ یہ تھا کہ ان کے جذب و فکر کا بھی ایک دھارا اسی سرچشمے سے پھوٹتا ہے - اس ضمن میں ان کے کلام سے جو کچھ برآمد ہوا ، اس سے اس تالیف کے آخری حصے میں بحث کی جائے گی -

اس موضوع کی پہلی کڑی تک میری نظر چونکہ استاد ذوق کی بدولت پہنچی ، اس لیے چھان بین آن ہی کے کلام سے شروع کرتا ہوں -

امیر خاں کی سپر افگنی اور انگریزوں سے مصالحت

ہم عصر شعرا کا غم و غصہ

ذوق :

دلِ آہنیں جب ہوا موم اس کا
ہم الفت کو اعجازِ داؤد سمجھے

کیا جب کہ تجھ سے محبت کا سودا
ہوا گر زیاں بھی ، تو ہم سود سمجھے

آزاد نے اپنے استاد کا ما فی الضمیر واضح کرنے کے لیے ان اشعار میں یہ تبدیلی کی :

ہمارا جو دل ہوگیا موم آن پر
ہم الفت کو اعجازِ داؤد سمجھے

کیا دل کا بازارِ الفت میں سودا
زیاں کو ہم، اے ذوق، یاں سود سمجھے

[1] آزاد کی یہ اصلاحیں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے مرتبہ دیوان سے لی گئی ہیں -

'دل آہنیں' انھوں نے فنی ضرورت سے ، اور از راہِ مصلحت ، نکال دیا جو ذوق نے جری اسیر خان کے لیے استعمال کیا تھا - 'اعجازِ داؤد' جنرل سر ڈیوڈ اوکٹر لونی کا تھا جس نے اُسے 'موم' کیا - ذوق نے مصالحت کی گفت و شنید کا یوں نقشہ کھینچا ہے گویا اس موقعے پر وہ خود موجود تھے :

خط کہاں آغاز ہے پشتِ لبِ دل دار پر
خضر[۴] ہے ملنے کو آیا عیسیٰ مریم کے پاس[۱]

واہ رے پیکِ اجل! دیکھیے ترے مکر و فریب
کھینچ کے سہراب کو یوں لائے تو رستم کے پاس!

آزاد کی اصلاح نے دوسرے شعر کو فاتح و مفتوح کی رعایت سے زیادہ حسبِ حال بنا دیا ہے :

واہ صیادِ اجل ، اور واہ صیادی کا پیچ !
کھنچ کے ہے اسفند یار آیا کہاں رستم کے پاس !

---

[۱] 'خضر' کی علامت ، اپنے قافلے کے رہ بر ہونے کی حیثیت سے ، اسیر خاں کے لیے اکثر استعمال کی گئی ہے :

وہ مثل ہے : ناؤ یہ کس نے ڈبوئی ؟ خضر نے
لے گیا حظِ ذقن دل کو سوے گرداب کھینچ

جو لذت آشناے مرگ ہوتا خضر ، تو وہ بھی
نہ پیتا آبِ حیواں ، ڈوب مرتا آب حیواں میں — ذوق

نقشِ پاے خضر یاں سدِ سکندر ہو گیا — غالب

'آغازِ خط' سے مراد ہے 'خطِ صلح' کی خاطر امیر خاں کی جنرل اوکٹر لونی¹ سے ملاقات ، جو اس کے زوال کا پیش خیمہ بنی - اس کی فوج کے جاں باز سردار اور سپاہ اس یک جای کو اسی نظر سے دیکھتے تھے اور جہاں تک اُن سے بن پڑا ، وہ اس کی زبان اور پھر تلوار سے مزاحمت کرتے رہے - اُن کی مخالفت کے اشارے ان اشعار میں موجود ہیں :

باز آیا دیکھنے سے نہ آتش رخوں کے دل
سو بار آبلے آسے آنکھیں دکھا چکے

---

¹ اسے دلی والوں نے 'اختر لونی' بنا لیا - امیر خاں کی سپر افگنی کی رو داد میں اس نام کے پہلے جز کی رعایت سے شاعروں نے جو فائدہ اُٹھایا ہے، اس کی چند مثالیں یہ ہیں :

خورشید وار ، چرخ پہ چمکا کوئی تو کیا؟
اختر کو پھر جو دیکھا تو زیرِ زمیں گیا — ذوق

اختر کو داغِ سایۂ بالِ ہما کہوں — غالب

(یعنی 'اختر' نے سید صاحب کا امیر خاں کو بادشاہ بنانے کا منصوبہ خاک میں ملا دیا)

غالب کے ایک فارسی مصرعے میں سید صاحب کے اس مشورے کی گونج ہے کہ امیر خاں 'اختر' سے ٹکر لے :

بہ قہر کامِ دلِ خویشتن ز اختر کش

ایک اور شعر میں 'ستیزہ کاریِ اختر' کا ماتم کیا ہے :

دست از جفاے گردشِ گردون بہ سر زنم
آہ از ستیزہ کاریِ اختر برآورم

اب خاک کے ہیں ڈھیر گر اس خرابے میں
پہلے تو ہم بھی خاک بہت سی اُڑا چکے

آزاد نے اس موضوع پر یہ شعر بھی ذوق سے منسوب کیے ہیں :

سادہ رخوں سے کی جو محبت ، تیری ہی تھی یہ سادہ دلی :
منہ چڑھ کے اس شوخ کے ، کالا منہ ، اے خال ، کیا

شمع نمط ، ہر خارِ جنوں کی انگلی پگھلی جاتی ہے
آبلوں میں تیزاب تھا گر ، تو ناحق ان کو پامال کیا

سید صاحب نے امیر خاں کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ اس لشکر کو درہم برہم نہ کرے جسے انھوں نے بڑی محنتِ شاقہ سے تربیت دے کر اسے تختِ سلطنت پر بٹھانے کے لیے تیار کیا ہے ، اور اس خوش فہمی[1] میں نہ رہے کہ انگریزوں سے اسے کوئی

---

[1] انگریزوں کے بارے میں زوال پذیر عناصر کی اس خوش فہمی پر ذوق نے یہ فقرہ چست کیا ہے :

ترے بیمار کو گر اپنے جینے کی تمنا ہو
فلک پر سن کے ہنستے ہنستے شادی مرگ عیسیٰ ہو!

فیض پہنچے گا، اور اسے غیرت و حمیت کا راستہ دکھایا :

تو نگیں توڑ نہ دل کا، کہ بڑی کاوش سے
اسم کو میں نے ترے کندہ کیا ہے اس میں[1]

شیشۂ سبزِ فلک سے نہ طلب گرمئے عیش :
مے کہاں اس میں ہے؟ زہراب بھرا ہے اس میں

خضر ساقی ہو تو میں جام نہ لوں، گر جانوں
کہ نہیں جام میں مے، آبِ بقا ہے اس میں

امیر خاں کی اس ناعاقبت اندیشی پر ذوق نے سید صاحب کے حسرت آمیز غم کی ترجمانی یوں کی ہے :

طلبِ حق میں اگر بادیہ پیما ہوتا
میرا ہر آبلۂ پا یدِ بیضا ہوتا

خاک ہو جاتا اگر راہِ خدا میں، بخدا
تو نہ سر سنگِ درِ دیر و کلیسا ہوتا

طاقتِ پائے جنوں کم نہ اگر ہو جاتی
ہاتھ ہوتا مرا، اور دامنِ صحرا ہوتا

---

[1] توڑے ہے عجزِ تنک حوصلہ بر روئے زمیں
سجدہ تمثال وہ آینہ، کہیں جس کو جبیں

جوشِ دوزخ ہے خزانِ چمنِ خلدِ بریں

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آینہ، تمثال دار تھا　　غالب

قدرتِ حق سے عجب کیا جو مری رہ کا غبار
رونقِ افسرِ اسکندر و دارا ہوتا

ذوق کے اس مصرعے میں :

نگیں پر نام لکھ دوں تو نکل کے گھر سے باہر ہو

'نگیں پر نام لکھنے' سے اُس منصوبے کی طرف اشارا ہے جو سید صاحب نے امیر خاں کو دلی کے تخت پر بٹھانے کا بنایا تھا ، چونکہ انگریزوں کو ملک سے نکالنے کا جو کام وہ اُس سے لینا چاہتے تھے ، وہ کمپنی کے وظیفہ خوار مغل بادشاہ کے زیرِ سایہ سرانجام نہیں پا سکتا تھا :

یہ میں کہاں جو تاب سہِ سیم تن میں ہے؟
پردا سا عنکبوت کا سقفِ کہن میں ہے

جو دل کہ لا نہ سکتا تھا چینِ جبیں کی تاب
زیرِ شکنجہ زلفِ شکن در شکن میں ہے

اپنی ہی فوج کے کشت و خون ، انگریزوں کا سایۂ عاطفت ڈھونڈنے ، اور جد و جہد کو ناکام بنانے پر امیر خاں کے خلاف یہ جذبات بھی سید صاحب ہی کے ہیں :

دل کا سا ہوتا گر درِ غلطاں کو اضطراب
پھرتا تمام دامنِ ساحل میں لوٹتا

بے آبِ تیغ ، ماہیِ بے آب کی طرح
اے ذوق ، دل ہے سینۂ بسمل میں لوٹتا

ملے اکسیر اگر اس کشت و خوں سے ، میں نہ لوں ہرگز:
مرے مذہب میں خوں کرنا ہے کشتہ کرنا پارے کا

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گردابِ بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

گھسے سب ناخنِ تدبیر ، اور ٹوٹی سرِ سوزن
مگر تھا دل میں جو کانٹا ، نہ سینے سے کبھو نکلا

اسے عیار پایا یار سمجھے ، ذوق ، ہم جس کو :
جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا ، وہ عدو نکلا

اس لعن طعن کی بوچھاڑ میں بھی سید صاحب ہی کا غم و غصہ جھلکتا ہے :

لذت کو تیغِ عشق کی سن سن کے بوالہوس
آ کر ملخ سا حلق بریدوں میں مل گیا

گر بعدِ فقر بھی سگِ دنیا ہوا فقیر
کم بخت پاک ہو کے پلیدوں میں مل گیا

چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا

بھاگا مجنوں مری وحشت سے بگولے کی طرح
سامنے میرے ذرا بھی نہ بھگوڑا اٹکا'

جنوں سے میرے مجنوں بھاگتا جیسے بگولا ہے
کہ میں صورت ہوں وحشت کی ، وہ یوں ہی اک ہیولا ہے

زیادہ ہوتا ہے پیری میں فربہ نفسِ امارہ :
یہ بالوں کی سفیدی شیر ہے اس مارِ رہ زن کو

کمندِ نام و شہرت کھینچ لائی ہے عدم سے بھی
لپٹ کر ، مثلِ طوقِ فاختہ ، عنقا کی گردن کو

یہ شہرت نام کی بھی وہ بلا ہے پیچ ہستی کا
کہ صحرائے عدم میں گردنِ عنقا کا پھندا ہو

ہم ہیں وہ گرم روِ راہِ فنا ، جوں خورشید
سایہ تک بھاگ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو

ذوق

سایہ میرا مجھ سے ، مثلِ دود ، بھاگے ہے، اسد!
پاس مجھ آتش بہ جاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے؟

غالب

ذوق نے ، کہ خود ایک سپاہی زادے تھے ، امیر خاں کے دل شکستہ لشکریوں کے جذبات کی جس دل سوزی سے ترجمانی کی ہے ، اس کا اندازہ اس غزل کے علاوہ جس کے ذریعے ہماری رسائی ان معاملات تک ہوئی ، ان اشعار سے بھی ہوتا ہے :

ہر صید کی کمر سے گئی ٹوٹ جس گھڑی
ٹوٹی کمانِ دل برِ ناوک فگن کی شاخ

آخر یہ دست گیریِ تیشہ نے پھل دیا:
کی قطع نخلِ آرزوے کوہ کن کی شاخ

یہ موجِ خوں رواں نہیں ، شاید ہے رو رہا
تیشہ ، سر اپنا رکھ کے سرِ کوہ کن کے پاس

رہی ہر طرح سے ، صیدی کے کبوتر کی طرح
ہاتھ سے اس بتِ بے درد کے ایذا ہم کو

ٹپکے ہے ، جاے عرق ، ہر بنِ مو سے پیکاں :
یہ ہدف کس نے کیا تیرِ بلا کا ہم کو؟

دل میں تھے قطرۂ خوں چند ، سو مانندِ انار
نہ رہے وہ بھی ، جب الفت نے نچوڑا ہم کو

آن پہنچی سرِ گردابِ فنا کشتیِ عمر :
ہر نفس بادِ مخالف کا ہے جھوکا ہم کو

اہلِ لشکر کے دل پر سب سے زیادہ چوٹ اس کی تھی کہ امیر خاں نے اپنے حوصلہ مند سرداروں کی روک تھام کے باوجود، اپنا سارا فوجی ساز و سامان اور لشکر کا دل نکال کے انگریزوں کے حوالے کر دیا[1] :

تیر و پیکاں جتنے تھے دل میں ، دے اس کو نکال :
اپنے ہاتھوں گھر لٹانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی ، گر پڑے ہم آپ سے :
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

واں ہلے ابرو ، یہاں پھیری گلے پر ہم نے تیغ :
بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

---

[1] اور یوں ، بقولِ مومن :

اپنی ہی فوج بن گئی لشکر غنیم کا

[2] جنرل اوکٹر لونی نے جس حسنِ تدبیر سے امیر خاں سے یہ کام کرایا ، غالب نے اس کی داد دی ہے :

نازم اواے پر فنش ، کز گشتگان در مخزنش
گنجے ز مغفر گشتہ پر ، گنجے ز جوشن گشتہ جمع

اس جان و دل کے معاوضے میں اسے حاصل کیا ہوا ؟ ٹونک کی دو گز زمین![1]

خوں کے دریا بہ گیے ، عالم تہ و بالا ہوے
اے سکندر ، کس لیے ؟ دو گز زمیں کے واسطے !

'سکندر' کی اس افتاد پر سب شاعروں نے اسی طرح خون کے آنسو بہاے ہیں جیسے کہ ذوق نے :

ہے غم سے ہنوز آینہ بادیدۂ پر آب
اسکندرِ رومی کی بھی روداد غضب ہے !

خوب روے رات ہم سنسان ہامون دیکھ کر :
یاد آیا ہم کو مجنوں ، بیدِ مجنوں دیکھ کر[2]

'بیدِ مجنوں' سرنگونی کی مناسبت سے -

---

[1] غالب نے اس حقیر سودے پر جد و جہد کی تباہ کاری کو ترجیح دی ہے :

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب:
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں !

[2] نظر جو آ جاے بیدِ مجنوں تو روؤں مجنوں کی یاد میں خوں :
جو دیکھوں تیشہ تو سر کو پھوڑوں، خیال بندھ جاے کوہ کن کا
آتش

سید صاحب نے اس واقعے کا ہر پہلو اپنے خاص خاص عیقدت مند شاعروں کو اس خوبی سے سمجھایا کہ انگریزوں کی فوجی اور سیاسی حکمت عملی ، جس کے خلاف وہ نبرد آزما تھے ، ان پر آینہ ہوگئی :

فلک وارستہ پھرنے دے ہے کوئی پر خروشوں کو؟
گیا ہی آخرش زنجیر سے پیلِ دماں باندھا

پنجۂ شانہ کو دیتا ہے فلک کب ناخن ؟
جانتا ہے کہ یہ ہے عقدہ کشائی کرتا!

انگریزوں نے سراج الدولہ ، ٹیپو سلطان اور سید صاحب کی 'عقدہ کشای' کی تدبیروں کو کن چالوں سے ناکام بنایا ، ان میں بصیرت شاعروں نے سید صاحب اور شاہ صاحب کے 'آینہ' تصویر نما'

---

۱ ' امیر خاں آخری دور کے آزاد ہندوستانی امیروں میں سب سے بڑھ کر طاقت ور تھا ۔ ایک موقع پر اس کے پاس چالیس ہزار جاں باز جمع ہوگئے تھے اور ایک سو پندرہ توپیں تھیں - اتنی عظیم الشان قوت کو انگریز قلبِ ہند میں آزاد چھوڑنے کے روادار نہ ہو سکتے تھے ، لیکن انھیں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ امیر خاں سے کھلے میدان میں ٹکرائیں ، اس لیے کہ جانتے تھے من چلا آدمی ہے ، مقابلے پر ڈٹ جائے گا تو ممکن ہے دوسری ملکی قوتیں بھی ، جو بہ ظاہر دب گئی تھیں ، ابھر آئیں اور ہمیں بستر بوریا باندھ کر ہندوستان سے نکل جانا پڑے ۔' مہر : ''سید احمد شہید'' ۸۹

کی بدولت حاصل کی :

ظاہر ہے ، اسد ، حالِ شہیدانِ گزشتہ :
تیغِ صنم آینۂ تصویر نما ہے غالب

کیا دورِ جام ہو ، کہے جب سر پہ دورِ چرخ :
گر چاک پر پھرے ، تو میں ساغر کو توڑ دوں ؟ ذوق

تشنہ کامِ عشق ہوں ، گر خاک سے میری بنے
آب جوں جوں بھرے ، وں وں اور ساغر خشک ہو
مومن

آنکھ اٹھا کر تو ذرا دیکھ ، کہ زیرِ افلاک
جو ہے سرکش ، وہ نگوں سار نظر آتا ہے ذوق

کس کو پیوندِ زمیں کرتی نہیں رفتارِ ناز؟
کون سا سرکش تمھاری خاکِ پا ہوتا نہیں؟

کون گردن ہے جہاں میں جو تہِ خنجر نہیں ؟
کون سا مینائے مے ، اے محتسب ، بے سر نہیں؟

سر رہے یا جائے ، کچھ ہم مے کشوں کو ڈر نہیں
آتش

ایک نا انصافی

ذوق کے اس پہلو کی تشریح و توضیح کے بعد اس نا انصافی کی شکایت بے جا نہ سمجھی جائے گی جو ان کے ساتھ بالعموم کی

جاتی رہی ہے - اس کی صرف چند مثالیں دی جاتی ہیں:

'ذوق 'گرمی اندیشہ' نہیں رکھتے' پروفیسر آل احمد سرور

'ذوق کی آواز میں ایک رقاقت، پتلا پن اور ہلکا پن ہے'
فراق

'ذوق کے یہاں غالب عنصر جمود ہے'
ڈاکٹر خورشید الاسلام[1]

'ذوق اتنے بڑے دل و دماغ کے شاعر نہ تھے جو ایک قوم کے غم کا احساس کرتے اور بے قرار ہو جاتے ۔ ایک عہد کے دکھ کو سمجھتے اور سوگوار ہو جاتے'
ڈاکٹر قاضی عبدالستار

'ذوق کی شاعری ایک ایسے قلتِ خون کی مریض ہے جس کا چلو بھر خون بھی اب خشک ہو رہا ہو'
ڈاکٹر اختر اورینوی

'قلتِ خون، کا شکار ذوق کے عہد کا معاشرہ تو ضرور تھا، مگر اس میں کچھ سرگرمِ فکر و عمل عناصر بھی تھے- ذوق کی اپنی رگوں میں خون کی کوئی کمی نہ تھی - یہ اور بات ہے کہ یہ خون، اور سب شاعروں کی طرح، صرف ان کی زبان سے ٹپکتا رہا اور

---

[1] صایب اور بیدل کے حرکی عنصر کو نظر انداز کرکے، اس ناقد نے انھیں بھی 'جمود' کے الزام میں لپیٹ لیا ہے -

بہ قولِ غالب ، آنکھ سے نہ ٹپکا ۔ وہ کلام جس پر ڈاکٹر اختر اورینوی کا محاکمہ مبنی معلوم ہوتا ہے ، یہ ہے :

ہم اول ہی سے خود کو نابود سمجھے

یاں جان ہی بدن میں نہیں ، نبض کیا چلے ؟

دونوں جہاں سے دستِ تمنا اٹھا لیا

پانی طبیب دے ہے ہمیں کیا بجھا ہوا ؟
یاں دل ہے زندگی سے ہمارا بجھا ہوا

مگر انھوں نے وہ کلام نظر انداز کر دیا جس میں اس مضمحل صورتِ حال کے خلاف شدید ردِ عمل ظاہر کیا گیا ہے :

سرعت ہے نبض کی رگِ سنگِ مزار میں

ہر دم دلِ خوں گشتہ میں اک جوش فزوں ہے

کہاں بجھی ہے تہ خاکِ میری آتشِ دل ؟

جل کے میں خاک ہوا ، تو بھی رہا دل مضطر
یہ وہ سیماب ہے کشتہ نہ ہوا ، پر نہ ہوا

پھر آہِ سرد ہوئی دل میں شعلہ ور :
لو ، پھر بھڑک اٹھا یہ فتیلہ بجھا ہوا

ہم آپ جل بجھے ، مگر اس دل کی آگ کو
سینے میں ہم نے ، ذوق ، نہ پایا بجھا ہوا

زنجیر میں بھی ، نالۂ زنجیر کی طرح
جوشِ جنوں سے رہتے ہیں جولانیوں میں ہم[1]

حلقۂ زنجیر میں بھی دل رہا پا در رکاب :
توسنِ وحشت ہمارا گرمِ جولاں ہی رہا

سہمیزِ سرِ خار سے نکلا
کچھ توسنِ وحشت کا قدم اور زیادہ

مومن :

امیر خاں کے ہتھیار ڈالنے اور انھیں دشمنوں کی نذر کرنے پر مومن نے اپنے رنگ میں ان ہی جذبات کا اظہار کیا ہے جو ان کے دل و دماغ میں بھی ، اور شاعروں کی طرح ، سید صاحب اور

---

[1] باز می رقصد جنون در حلقۂ زنجیر ما
باز در کوے خرابی می کند تعمیر ما
ظہوری

شاہ صاحب نے اتار دیے تھے - بلکہ ان معاملات میں تو انھیں تحریک کے داعیوں سے خصوصی تقرب حاصل تھا - دیوان کی پہلی ہی غزل میں سید صاحب سے انتہائی ارادت مندی کے ساتھ انھوں نے اس سانحے پر اپنے غم و اندوہ کا اظہار کیا ہے ، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں اس کی کس قدر اہمیت تھی :

نہ دے تیغِ زباں کیوں کر شکستِ رنگ کے طعنے
کہ صف ہائے خرد پر حملہ ہے فوجِ خجالت کا ؟

سرشکِ اعترافِ عجز نے الماس ریزی کی :
جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خونِ کشتہ طاقت کا

بچاؤں آبلہ پائی کو کیوں کر خارِ ماہی سے
کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے ، یا رب ، پاؤں دقت کا ؟

(سمندر پار سے آنے والوں کی کاوش و پرخاش کو 'خارِ ماہی' کہا ہے) -

انھیں بھی قلق اسی کا ہے کہ ملک گیری کا جو منصوبہ سید صاحب ، امیر خاں کی وساطت سے ، پورا کرنا چاہتے تھے ، وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا :

جو گریہ تر نہ کر دیتا ، تو جیسے نالہ کھینچا تھا
چمن میں ، کوہ میں ، صحرا میں آتش جابہ جا لگتی

(گریہ : امیر خاں کا ہمت ہار کے سرنگوں ہو جانا)

نسیمِ مصر کا دم پیرِ کنعاں کا ہے کو بھرتا
اگر کوچے کی تیرے خاک آلودہ ہوا لگتی

(نسیمِ مصر : انگریز ؛ 'پیرِ کنعاں' : امیر خاں جو اس وقت معمر ہو چکا تھا ؛ خاک آلودہ ہوا : سید صاحب کا محاذِ جد وجہد)

کیے تھے کاٹ کاٹ آلودہ خوں سے ہاتھ یاں اپنے
وہاں دستِ عدو سے پاؤں میں تھی شب حنا لگتی

(خود اپنی طاقت کا خون کرنا اور دشمن کے ہاتھوں خود کو نقل و حرکت سے محروم کرانا ۔ انگریزوں کی رنگت کی رعایت سے اُن کی نشان دہی اکثر شاعروں نے 'حنا' سے کی ہے) -

تھے دشت میں ہم راہ سرے آبلۂ چند
سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا

زندہ نہ ہوا ، ہائے ، دلِ مردہ ، اگرچہ
تھا شورِ قیامت سے فزوں ولولہ اپنا !

کیا ٹھہرے فوجِ غم کے مقابل فغان و آہ ؟
جمتے نہیں ہیں لشکرِ برباد کے قدم

مصالحت کے بعد ، سید صاحب کی اس پیش گوئی کے مطابق کہ اپنی فوجی قوت کو برباد کرکے :

بیٹھا کفِ افسوس ملے گا پسِ کشتن
امیر خاں کی 'مشتے بعد از صلح' پشیمانی :

دھوتا ہے عہد نامۂ غیر اپنا حال دیکھ
آبِ حیا نے خطِ جبیں کیا مٹا دیا ؟

مگر رقیبوں نے سر اٹھایا ، کہ یہ نہ ہوتا تو، بے مروت!
نظر سے ظاہر حیا نہ ہوتی، حیا سے گردن میں خم نہ ہوتا

کچھ اپنے ہی نصیب کی خوبی تھی ! بعدِ مرگ
ہنگامۂ محبتِ اغیار کم ہوا

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب :
تجھے ، اے زندگی ، لاؤں کہاں سے ؟

'زندگی' یعنی پرانی قوت و شوکت جو خود تلف کی ۔

سید صاحب کا امیر خاں کو سمجھانا کہ جد و جہد سے ہاتھ نہ کھینچے ، انگریزوں سے پناہ نہ مانگے ، دشمنوں کے کہنے میں آ کر لشکر کو برباد نہ کرے ، ورنہ سخت پچھتائے گا :

اے ستم پیشہ ، مرے بعد کہاں نشۂ عشق ؟
دیکھ، خمیازۂ حسرت ہے یہ شمشیر ، نہ کھینچ !

باقی ہے شوقِ چاکِ گریباں ابھی مجھے
بس، اے رفوگر، اپنی انامل کو تھامنا!

مت مانگیو اماں بتوں سے، کہ ہے حرام
مومن، زبانِ بیہُدہ سایل کو تھامنا!

سنگِ در سے ترے نکالی آگ
ہم نے دشمن کا گھر جلانے کو

(ق)

چل کے کعبے میں سجدہ کر، مومن!
چھوڑ اس بت کے آستانے کو

نقشِ پاے رقیب کی محراب
نہیں زیبندہ سر جھکانے کو

اے زہرہ چہر، دشمنِ منحوس کو نہ دیکھ
نالے بہیں گے خون کے اس فتح باب میں

(یوں کچھ نہ ہو، امید تو ہے انقلاب میں)

دیکھ، اغواے رقیباں سے نہ تلوار لگا

بیٹھا کفِ افسوس ملے گا پسِ کشتن :
غیروں سے بھی، ظالم، تو مرے ساتھ اُٹھا ہاتھ

انگریزوں سے مصالحت کے فیصلے پر سید صاحب کا غم و غصہ اور علیحدگی :

ہے نگاہِ لطف غیروں پر ، تو بندہ جائے ہے
یہ ستم ، اے بے مروت ، کس سے دیکھا جائے ہے ؟

رشکِ دشمن نے بنا دی جان پر ، اے بے وفا !
کب تلک کوئی نہ بگڑے ؟ حال بگڑا جائے ہے

تاب و طاقت ، صبر و راحت، جان و ایمان ، عقل و ہوش
ہائے کیا کہیے ، کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے!

دیکھیے انجام کیا ہو : ہوسِ صورت پرست
شیخِ صنعاں کی طرح ، سوے کلیسا جائے ہے

متابعت کے بعد ایک بار پھر امیر خاں کی سید صاحب سے ملاقات اور سید صاحب کا اُس کو بتانا کہ اُس نے کتنی نادانی سے کام لیا :

اندیشۂ پایانِ جفا کرنا تھا
نادان ، ذرا پاسِ وفا کرنا تھا

غیروں کے لیے ہاتھ سے کھویا ہم کو
کیا تم نے کیا اور ، آہ ، کیا کرنا تھا !

میں نے تم کو دل دیا ، تم نے مجھے رسوا کیا :
میں نے تم سے کیا کیا ، اور تم نے مجھ سے کیا کیا !

ایک بھی میری نہ مانی ، لاکھ سر پٹکا کیا

عبث الفت بڑھی تم کو ، وہ کب دیتا تھا دم تم پر ؟
یہ مجھ کو دیکھ کر دشمن کلیجا تھام لیتا تھا

(چونکہ فوج میں جذبۂ جد و جہاد پھونکنے والے سید صاحب ہی تھے ، اور یہ سارا نور ظہور ان ہی کے دم قدم سے تھا)

اگر مومن ہی ہو مومن، ولے میں تو نہ مانوں گا
جو عہدِ دوستی وہ دشمنِ اسلام لیتا تھا

کس کو ہے ذوقِ تلخ کامی ، لیک
جنگ بن کچھ مزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا !

امیر خاں کی قیادت میں اہلِ لشکر کا انگریزوں سے طاقت آزمای کا جذبہ :

اے تندخو ، آجا تمہیں تیغا کمر سے باندھ کر :
تن مدتوں سے ہم کفن پھرتے ہیں سر سے باندھ کر !

یا وہ ڈبوئیں گے زمیں ، یا ہم ڈبوئیں گے فلک :
آجائے تو روتے ہیں ہم شرط ابرِ تر سے باندھ کر !

امیر خاں کی بزدلی سے اس آرزو کا پورا نہ ہونا :

پائے طلب شکستہ ، نہ کوتاہ دستِ شوق :
ہم بھی ستم کریں جو وہ نازک کمر نہ ہو

اپنے لشکر کو خود ہی درہم برہم کرنے کا عبرت ناک انجام : 'دستِ حسرت' : 'کفِ افسوس' :

پھرتے قتل سے ، قاتل ، نہ کیوں غیروں کو عبرت ہو
ہم جوہر سے جوہر تیغ کا جب دستِ حسرت ہو ؟!

تیری پابوسی سے اپنی خاک بھی مایوس ہے :
نقشِ پا پر نقشِ پا ، ظالم ، کفِ افسوس ہے

' قہر ہے پھرنا نگاہِ یار کا :
الاماں اس بازگشتی تیر سے !
مومن

جی ہی ، مانندِ نشانِ کفِ پا ، بیٹھ گیا
پاؤں کیا کوچے سے اُس ہوش رُبا کے اُٹھے

(گو کہ ہم صفحہ ہستی پہ تھے اک حرفِ غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے)

جنوں میں بھلا کوئی کیا خاک اڑائے
کہ اک جوش ہی میں زمیں ہو چکی![1]

ثوابت ہیں سیار[2] ، مثلِ شرر
مری آہ کرسی نشیں ہو چکی!

('کرسی نشیں' سے اشارہ امیر خاں کو تخت پر متمکن کرنے کے منصوبے سے ہے ، جو اُس کے عدمِ استقلال نے خاک میں ملا دیا)

جد و جہد سے دست بردار ہو کر اپنی فوج کو دشمن کے حوالے کرنا :

آغشتہ بہ خوں ہاتھ کو ، لو ، پونچھتے ہیں وہ :
الٹے کفِ جلاد میں دامن ہے ہمارا!

---

[1] کچھ خیال آیا تھا وحشت کا ، کہ صحرا جل گیا
غالب

انگریزوں کے دل میں کچھ ، زباں پر کچھ :

کیا یہ مطلب ہے کہ ، برعکسِ وفا ، ہوگی جفا
جو تمہارے عہد نامے میں خطِ معکوس ہے ؟

انگریزوں سے رابطے کی بدولت سرنگوں ہو کر 'جل بجھنا'

غیرتِ آمد شدِ دشمن سے تلووں سے اگی :
جل بجھیں گے اب ، کہ حالِ مشعلِ منکوس ہے

امیر خاں کی دشمن نوازی اور بدسلوکی سے عاجز آ کر لشکر کا انگریزوں کی طرف رجوع :

ظالم ، وہ بے وفا ہے عدو ، جس کے رشک سے
اتنا کچھ آ گیا خلل اپنے نباہ میں

دست بوسی پر کرو ، ہاں ، قتل اپنے ہاتھ سے :
سچ تو کہتے ہیں ، قبول انصاف غیروں کا ہمیں !

[بند کرنے کو قفس میں ، دام سے چھوڑا ہمیں]

اس حال کو پہنچے ترے غصے سے ، کہ اب ہم
راضی ہیں ، گر اعدا بھی کریں فیصلہ اپنا

(سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا)

انجام : انگریزوں کی محکومی :

ہم یقینی جوشِ وحشت سے فلک پر پہنچتے
خارِ دامن گیر پر عیسیٰ کی سوزن ہو گیا

پاؤں زنداں سے اٹھے کیا ، سر اٹھا سکتے نہیں :
حلقۂ زنجیر آخر طوقِ گردن ہو گیا

سپر افگنی کے وقت اپنے مستقبل کے بارے میں سپاہ کے خدشے :

دامنِ قاتل کو وقتِ قتل کیونکر چھوڑتے ؟
بے کسی سے جان تھی اپنی کفن کی فکر میں

اس کا قلق کہ امیر خاں انگریزوں کی دوستی کے فریب میں آ کر انہیں ملک و قوم کا چمن اجاڑنے کا موقع دے رہا ہے :

وہمِ عشقِ لالہ رو میں داغِ دل کیا کیا کھلے
جان کر گل چیں کو تاراجِ چمن کی فکر میں !

مومن اس سانحے کو اپنی دو عشقیہ مثنویوں ('شکایتِ ستم' اور 'قصۂ غم') تک میں کھینچ لائے ہیں ۔ یہ باتیں اس وقت کھلم کھلا مربوط طریقے سے بیان کرنا خطرے سے خالی نہ تھا :

چشم کشای کوہ کنی ہے
اب جو کھلے تو بند زباں ہو

چنانچہ انھیں مثنویوں میں ادھر ادھر بکھیر دیا ہے، تاکہ

حال سے بے خبر رہیں غماز

میں نے انھیں ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی ہے۔ مثنوی 'قصہ غم' میں یہ واقعہ اس شکل میں پیش کیا گیا ہے:

گر سنیے تو کچھ بیاں کروں میں
اک رازِ نہاں عیاں کروں میں

آلودۂ درد ہے فسانہ
افسانۂ درد آفریں ہے

سید صاحب اور امیر خاں کی یک جہتی:

ہم دم وہ مرا، میں اس کا دم ساز:
وہ میرا، میں اس کا ہم راز

دو یک دل و یک زبان گویا
دو قالب اور ایک جان گویا

پیمان نباہ کے بہم تھے
سو عہد وفا کے دم بہ دم تھے

تھی لحمک لحمی حد سے افزوں
اللہ رے جوشِ گرمیِ خوں!

جوں ناز و نیاز دونوں باہم
جوں معنی و لفظ دونوں توام

امیر خاں کا انگریزوں سے مراسم پیدا کرنا :

ناگاہ

آنکھ آفتِ جاں سے لڑائی
اک ترچھی نگہ کی برچھی کھائی

اک بت کا ہوا وہ آستاں بوس

دیکھی جو ادھر سے یوں لگاوٹ
سمجھا نہ کہ سب ہے یہ بناوٹ

الفت ہے کہاں ؟ کہاں ہے یاری ؟
باتیں یہ فریب کی ہیں ساری

ہیں سب یہ فریب دینے کے رنگ
ہیں دام میں اپنے لینے کے ڈھنگ

ہے اتنی جو گرمیِ ملاقات
ہے اولِ عشق کی مدارات

آغاز میں پائے جو یہ آرام
سوچا نہ کہ کیا ہے اس کا انجام

سمجھا کہ سدا نبھے گی یوں ہی
یہ مہر و وفا نبھے گی یوں ہی

کٹ جائے گی یوں ہی زندگانی
اب مجھ کو ہے عیشِ جاودانی

چند ایسے خیالِ خام میں وہ
آتے ہی بس آیا دام میں وہ

جب ہو گیا مرتبہ یقیں کا
بس پھر تو یہ ہو رہا وہیں کا

سید صاحب سے قطع تعلق :

ہم سے بھی رہی نہ پھر تو وہ بات
یک مرتبہ ترک کی ملاقات

مثنوی 'شکایتِ ستم' میں جو پہلے لکھی گئی سید صاحب کی اس اہتمامِ حجت کا بیان ہے جو انھوں نے امیر خاں کو مصالحت سے روکنے کے لیے کی :

جا کے اس سے کہا کہ ، اے ناداں !
بے خبر ، کس طرف ہے تیرا دھیاں ؟

خیر ہے ؟ کچھ خیالِ مفسدہ ہے ؟
کس شر انگیز کا یہ شعبدہ ہے ؟

کچھ سنا؟ اب بھی چھوڑ دے یہ خیال
خواب ہو جائے نا پریشاں حال

عزت و شانِ خانداں کو دیکھ
جاہِ ہم اوجِ آسماں کو دیکھ

جوں زمیں ، بس ذلیل و خوار نہ ہو
دلِ احباب کا غبار نہ ہو

دورِ گردوں سے مدعا پامال
دستِ حسرت کفِ دعائے وصال

ہندوے چرخ نے تباہ کیا [1]
روزِ روشن سیہ تباہ کیا

دورِ لیل و نہار نے مارا
ستمِ روزگار نے مارا

بگڑے ایام کس قدر ، افسوس !
بن گئی کیسی جان پر ، افسوس !

---

[1] امیر خاں کا وکیل نرنجن لال جس کی معرفت معاہدے کی شرایط طے ہوئیں -

مصالحت پر اہلِ لشکر کے 'تیر بارانِ طعنہ و تشنیع' :

بے مزا ہو کر نمک کو بے وفا کہنے لگے ہیں :
کھل گئے زخموں کے منہ، مس کو برا کہنے لگے ہیں ؟

طعنہ حرفِ نصیحت آلودہ
طرزِ تفہیم وحشت آلودہ

منہ میں آیا سو ناصحوں نے کہا
پاس کیا ہو، وہ ننگ ہی نہ رہا ؟

نہ کی اس جوشِ جاں گدازی میں
تو تھی کچھ زباں درازی میں

بد زبانوں نے آکے منہ پہ کہا :
جا، کہ تو اپنے کام کا نہ رہا

ہم کو بدنام کر دیا تو نے
اے زبوں کار، کیا کیا تو نے !

کہیں کس منہ سے جائیں گے اب ہم ؟
ہائے کیا منہ دکھائیں گے اب ہم !

تجھ سے بے نام و ننگ کو کیا عیب ؟
دل لگا کر ہمیں لگایا عیب

ہم سمجھتے تھے اب تلک معصوم
یہ سیہ کاریاں نہ تھیں معلوم !

ہم سمجھتے تھے گھر کی آبادی
تو نے کی ہائے خانہ بربادی !

باعثِ عبرتِ جہاں تو ہوا
ہائے کیا ننگِ خانماں تو ہوا !

کیسی قسمت ہماری پھوٹ گئی !
تیرے ملنے کی آس ٹوٹ گئی

جوں فلک ، کج روی سے باز آ تو
پھر نہ ہم راہِ ماہ سیما تو

مومن ، آ تو بھی اپنے نام پہ جا :
نام کو ان بتوں کے آگ لگا !

امیر خاں نے سید صاحب کی بات نہ مانی - اس پر انھوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا :

بات کہنے میں اس نے کام کیا
قصۂ دوستی تمام کیا

پھر کوئی ملنے کی طرح نہ ہوئی
صلح اب کے کسی طرح نہ ہوئی

میں بھی ناچار ہو چلا آیا :
قصہ بر عکسِ مدعا پایا

مصالحت پر سید صاحب کے جذبات :

سجدۂ شکر نے نہ کی تاثیر
کیسی اپنی الٹ گئی تقدیر !

سیرِ اختر سے ہوں میں سرگشتہ
نہ پھرے ہائے محبتِ برگشتہ !

سیرِ مریخ نے کیا ہے ہلاک[1]

کیا پامال سیرِ اختر نے
پاؤں پھیلائے نحسِ اکبر نے

ہو گئی رجعت ، آہ ، گردوں کو[2]

[1] جنرل 'اختر لونی' کی تگ و تاز ، امیر خاں کے گرد گھیرا ڈالنا ۔
[2] الاماں اس بازگشتی تیر سے !

راہ پر اپنی آسماں نہ رہا :
زہرہ ، برجیس کا قراں نہ رہا

فکر و تدبیر و چارہ تھے باہم
مشورے کر رہے تھے کیا کیا ہم !

'مومن کی مثنویوں . . . میں اخلاق یا تمدنی یا مذہبی مضمون کا نشان نہیں پایا جاتا ہے ۔ ان کی کوئی مثنوی ایسی نہیں دکھائی دیتی ہے جو خس کے برابر مفیدِ معاشرت ہو یا جس سے بال برابر بھی فایدۂ عقبیٰ مرتب ہو ۔' سید امداد امام اثر : ''کاشف الحقائق''

مثنویوں کے خارجی پہلو پر غور کرنے کے بعد خود رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ اس محاکمے میں ، جہاں تک ان کے 'مضمون' کی نوعیت اور اس کے 'مفیدِ معاشرت' ہونے کا تعلق ہے ، کتنا وزن ہے ۔

ان مثنویوں کی طرح ، مومن نے ایسے مطالب دوسرے اصنافِ سخن میں بھی داخل کر دیے ہیں جو ان کے عنوان سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے ۔ اس کی دو مثالیں دی جاتی ہیں ، ایک مرثیے سے اور دوسری قصیدے سے ۔ پہلی سید احمد شہید کا انگریزوں کے خلاف وار خالی جانے سے تعلق رکھتی ہے اور

دوسری ان کے عقائد سے مولوی فضل حق کی مخاصمت ہے :

گردش پہ اپنی ناز ہے پھر روزگار کو :
اس چشمِ رشکِ فتنۂ دوراں کو کیا ہوا ؟

دعویٰ ہے شوخیوں کا غزالانِ دشت کو :
اس خوش نظر کی جنبشِ مژگاں کو کیا ہوا ؟

وہ کج ادا صنمِ خود پسند کافر کیش
کہ جس کے زعم میں باطل حق اور حق باطل

وہ فتنہ گر بتِ ناحق شناس ، نا انصاف
جو فرضِ عین گنے کینِ داورِ عادل

غالب :

امیر خاں کی سپر افگنی کا شعر کے ایمائی پیرائے میں ذکر سب سے پہلے غالب کی نو دریافت بیاض میں ملتا ہے :

سازشِ صلحِ بتاں میں ہے نہاں جنگیدن
نغمہ و چنگ ہیں جوں تیر و کماں فہمیدن

فوجی ساز و سامان انگریزوں کی نذر کرکے امیر خاں کا خود نہتا ہو جانا :

سراسر عجز ہو کر ، خانہ ، مانندِ کماں ، خالی

امیرِ لشکر کا اپنا پرانا جذبہ جد و جہد ترک کرکے خود اپنی جوشیلی سپاہ کا خون بہانا :

کرے ہے رہ رواں سے خضرِ راہِ عشق جلادی :
ہوا ہے موجہ ریگِ رواں شمشیرِ فولادی

امیر خاں کی پست ہمتی اور کم ظرفی :

تنک ظرفوں کا رتبہ جہد سے برتر نہیں ہوتا
نہیں ہے حوصلہ پامردِ کثرتِ تکلیف
تھکا (جب) قطرۂ بے دست و پا بالا دویدن سے
ہوا چرخِ خمیدہ ناتواں بارِ علایق سے

امیر خاں عمر اور جذبہ دونوں لحاظ سے مضمحل ہوچکا تھا، اسی لیے 'بارِ علایق' سے جھک گیا'۔

میں جو گردوں کو بہ میزانِ طبیعت تولا
تھا یہ کم وزن کہ ہم سنگِ کفِ خاک چڑھا

یہ حکم سید صاحب نے اپنے بے مہر و وفا رفیق پر لگایا ہے۔

' ناکامی کی ایک وجہ نسخہ' بھوپال میں یہ بیان کی ہے :
دزد اگر ہو خانگی تو پاس باں مجبور ہے

ایک شعر میں کہنا یہ چاہا ہے کہ 'سادہ رو' 'ویران کار' انگریزوں نے خطِ صلح کی شرایط سے خانہ ویرانی کی طرح ڈالی ہے، مگر نواجون شاعر کا مطلب پوری طرح لفظوں میں نہیں سمایا :

کرے ہے حسنِ ویران کار روے سادہ رویاں پر
غبارِ خط سے تعمیرِ بناے خانہ بربادی

آزادی سے لگاو اور ناکامی کی چوٹ :

نظر بندِ تصور ہے قفس سے لطفِ آزادی :
شکستِ آرزو کے رنگ کی کرتا ہوں صیادی

اگلے شعر میں سید صاحب کے پیچ و تاب اور حسرت و تاسف کی ترجمانی کی ہے :

چنار آسا ، عدم سے بادلِ پر آتش آیا ہوں
تہی آغوشیِ دستِ تمنا کا ہوں فریادی

آخری شعر میں انگریزوں کی ترکتاز اور دست برد پر اظہارِ غم ہے :

اسد ، از بس کہ فوجِ درد و غم سرگرمِ جولاں ہے[1]
غبارِ راہِ ویرانی ہے ملکِ دل کی آبادی

انگریزوں سے تعلق پیدا کرنے کا خمیازہ : سرنگونی و محرومی

ہے رشتۂ جاں ، فرطِ کشش سے
مانندِ نبضِ دستِ بریدہ

مطلب ہے ربط سے رگ وپے کی خمیدگی
گلشن کو رنگِ گل سے ، ہے درخوں تپیدگی

دیکھا نہیں ہے ہم نے بہ عشقِ بتاں ، اسد !
غیر از شکستہ حالی و حسرت کشیدگی[2]

---

[1] نہ دیدہ ای کہ ز آمد شدِ سپاہِ فرنگ
فرو گرفت زمین را تشنجِ اعصاب ؟

بالشکر اژدر شکنِ قاف شگافش
ہر سوختہ اختر کہ بہ پیکار برآمد

یا چہرہ شد ، تیغ و دوم ارسرو رو خورد
یا قلعہ نشین گشت و بہ زنہاد برآمد

غالب

[2] شب کہ تھا نظارگی روئے بتاں کا ، اے اسد !
گر گیا بامِ فلک سے صبح طشتِ ماہ تاب

نسخہ بھوپال

کئی اشعار میں سید صاحب کے احساسِ ناکامی کی ترجمانی کی ہے :

پیدا ہوئے ہیں ہم الم آبادِ جہاں میں
فرسودنِ پائے طلب و دستِ ہوس کو

خاکِ عاشق بس کہ ہے فرسودۂ پروازِ شوق :
جادۂ ہر دشت تارِ دامنِ قاتل ہوا

ہم آئے ہیں ، غالب ، رہِ اقلیمِ عدم سے :
یہ تیرگیِ حال لباسِ سفری ہے

انگریزوں سے مداوا طلبی کی خفت اور ذلت :

شرمندۂ الفت ہوں مداوا طلبی سے

خیالِ شربتِ عیسیٰ گدازِ ترجبینی ہے

ایک شعر میں امیر خاں کے شکستہ خاطر لشکر کے ترجمانی بعینہٖ اسی پیرائے میں کی گئی ہے جس طرح آزاد نے ذوق کی زبانی کی ہے :

ہوئے ہیں رہ رواں دل خستہ شرمِ نارسائی سے
کہ دستِ آرزو نے یک قلم پائے طلب کاٹے

ہزیمت کے باوجود ، حوصلہ اور از سرِ نو تنظیم :

نہ دیجے پاسِ ضبطِ آرزو وقتِ شکستن بھی

پریشانی ، اسد ، در پردہ ہے سامانِ جمعیت
کہ ہے آبادیِ صحرا ، ہجومِ خانہ بردوشاں

نہیں ہے خالی آرایش سے بے سامانیِ عاشق :
شکستِ حال انداز آفرینِ کج کلاہی ہے

ہر چند امید دور تر ہو
اے حوصلہ ، سعی بیش تر کر

سید صاحب کے حلقے میں ولی اللہی خاندان کے ممتاز افراد کی شمولیت :

حلقۂ گیسو کھلا دورِ خطِ رخسار پر :
ہالۂ دیگر بہ گردِ ہالۂ مہ ہو گیا

[1] رقصم بہ ذوقِ روے او چون بنیم اندر کوے او
ہم رفتہ نفت و بوریا ، ہم سنگ و آہن گشتہ جمع

بے دست گم کردہ ام ، کہ ہنوز از ہواے وصل
شورے ست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

مولوی عبدالحئی اور شاہ صاحب کا فرطِ عقیدت سے سید صاحب کی باگ تھامنا :

صفا و شوخی و اندازِ حسن پابہ رکاب[1]:
خطِ سیاہ سے ہے گردِ کارواں پیدا

'خطِ سیاہ' سید صاحب کی رنگت کی رعایت سے ، جس کی طرف ان اشعار میں بھی اشارہ ملتا ہے :

اسد ، تاثیرِ صافی ہائے حیرت جلوہ پرور ہو
گر آبِ چشمۂ آینہ ہووے عکس زنگی کا

خمِ رنگِ سیاہ از حلقۂ ہائے چشمِ آہو تھا

(شاہ صاحب کا) غالب کو حلقے میں شامل ہونے کا مشورہ :

اے اسد ، واشدنِ عقدۂ غم گر چاہے
حضرتِ زلف میں ، جوں شانہ ، دلِ چاک چڑھا

اب ہم امیر خاں کی سرنگونی کے موضوع پر کچھ اور شعر نسخۂ بھوپال سے نقل کرتے ہیں :

---

[1] مولانا عبدالحئی ، مولانا اسماعیل کا یہ حال تھا کہ سواری کے ساتھ پیدل چلتے ، لگام تھامتے ، جوتیاں اٹھاتے ، آپ (سید صاحب) سوتے تو وہ ساری رات جاگتے ، (''سیرت'' ۱۴۵) - .. ..

سید صاحب کی کوشش کہ امیر خاں اپنے فروغ کے عالم میں مصالحت سے باز رہے :

بہ وقتِ کعبہ جوئیہا جرس کرتا ہے ناقوسی
کہ صحرا فصلِ گل میں رشک ہے بت خانۂ چیں کا

ہے غیرتِ الفت کہ ، اسد ، اس کی ادا پر
گر دیدہ و دل صلح کریں ، جنگ نکالوں

کاشانۂ ہستی کہ ، برانداختنی ہے
یاں سوختنی چارہ گرِ ساختنی ہے

ہے عرضِ شکست آینۂ جرأتِ عاشق
جز آہ ، کہ سر لشکرِ وحشت علمی ہے

امیر خاں کو اپنی فوج کے جذبات نظر انداز کرنے اور جد و جہد سے دست بردار ہونے پر غیرت دلانا :

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے ؟
کل تلک تیرا بھی دل مہرو وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظار صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

شیرافگنی پر غم و غصہ :

دھمکی میں مر گیا جو، نہ بابِ نبرد تھا :
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

اسد، مت رکھ تعجب خر دماغی ہائے منعم سے
کہ یہ نامرد بھی شیرافگنِ میدانِ قالی ہے

دولت کی خاطر نام و ناموس کو بٹا لگانا : اپنی بجائے دہلی پر 'اختر' (لونی) کا تسلط قائم کرانا :

گرمیِ دولت ہوئی آتش زنِ نامِ نکو :
خانۂ خاتم میں یاقوتِ نگیں اختر ہوا

('منعم' اور 'دولت' امیر خاں کے نام کی رعایت سے) -

خطِ صلح سے امیر خاں کی قوت کا خاتمہ :

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا :
ظاہرا خط تیرے کاغذ کا غلط بردار ہے

صلح کی ذلت و رسوائی :

حیف، اے ننگِ تمنا، کہ بے عرضِ حیا
یک عرق آینہ بر جبہۂ سایل باندھا!

یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سایل باندھا

اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل مت پوچھ :
جو گرہ آپ نہ کھولی ، اُسے مشکل باندھا

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا :
دریا ، زمین کو عرقِ انفعال ہے[1]

ہوا شرمِ تہی دستی سے وہ بھی سرنگوں آخر :
بس، اے زخمِ جگر، اب دیکھ لی شورش نمک داں کی!

امیر خاں کی چیدہ فوج کا انگریزوں کے تصرف میں آنا :

نصیبِ آستیں ہے حاصلِ روے عرق آگیں :
چنے ہے کہکشاں خرمن سے مہ کے خوشہ پرویں کا

('کہکشاں' 'اختر لونی' کے نام کے پہلے جز کی رعایت سے)

قطرہ ہاے خونِ بسمل زیبِ داماں ہیں، اسد!
ہے تماشا کردنی گل چینیِ جلاد یاں

ہوے ہیں بخیہ ہاے زخم جوہر تیغِ دشمن میں

---

[1] جمنا کا کنارہ ، جہاں امیر خاں کا برہم شدہ لشکر آ کے اترا ۔

'کالے' لشکریوں کا 'گوروں' کی سپاہ میں شامل ہو جانا :

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو :
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں دل میں

صلح کے بعد بھی سید صاحب اور ان کی معتقد سپاہ کا جذبۂ جنگ جوئی برقرار :

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت :
نقشِ پا میں ہے وہی گرمیِ رفتار ہنوز

نکلتی ہے تپش میں بسملوں کی برق کی شوخی :
غرض اب تک خیالِ گرمیِ رفتارِ قاتل ہے

(یہ 'قاتل' خود امیرِ لشکر ہے جس کی 'گرمیِ رفتار' کا خیال سپاہ کے دل سے کسی طرح نہیں نکلتا)

ناکامی کا قلق :

سرا سر تاختن کرشش جہت یک عرصہ جولاں تھا :
ہوا واماندگی سے رہ رواں کی فرق منزل کا

نہ پائی وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم نے :
عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں :
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا!

(یہ 'جوہرِ اندیشہ' سید صاحب کا تھا)

اس پر حیرت کہ قافلہ سالار خود آگے بڑھنے میں مزاحم ہو :

حیرتِ اندازِ رہ بر ہے عناں گیر ، اے اسد!
نقشِ پائے خضر یاں سدِّ سکندر ہو گیا

سید صاحب کا خواب اور اسی کی معکوس تعبیر :

سید صاحب کو خواب میں بشارت ملی تھی کہ ان کے زیرِ ہدایت ، امیر خاں کی استعانت سے ، مسلمانوں کی کھوئی ہوئی قوت و شوکت بحال ہو گی - سارا لشکر ان کا معتقد تھا ، اور اسی توقع پر سرگرمِ عمل تھا :

ز شوقت بے قراری آرزو خارا نهادان را

بہ حرفے حلقہ در گوش افگنی آزاد مردان را :
بہ خوابے مغز در شور آوری بالین پناہان را

غالب نے اس اثر کو مولوی فضلِ حق کے نقطۂ نظر سے بھی بیان کیا ہے :

خواب است و جمِ ہمتِ آوارہ بنیشان

جب سید صاحب کی یہ بشارت پوری نہ ہوئی تو مخالفوں نے ، جن میں اپنے اور بیگانے دونوں شامل تھے ، بغلیں بجائیں ، اور عقیدت مندوں کو ناکامی کے اسباب پر غور کرنا پڑا ۔ غالب نے اس 'خوابِ پریشاں' کا ذکر کئی جگہ کیا ہے ۔ آنھیں اس پر مولوی فضلِ حق کے طعنے ضرور سننے پڑتے ہوں گے :

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خرام اس کا :
صبح موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا !

سید صاحب کی 'دو عالم آگہی' اور 'دل جمعی' کے باوصف ، خواب کا پورا نہ ہونا :

دو عالم آگہی سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے :
باوجودِ دل جمعی ، خوابِ گل پریشاں ہے

ناکامی کا سبب : اسعد خاں کی غفلت اور کم حوصلگی :

بے ستوں خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے

ضعف نے باندھا ہے پیمانِ گراں خوابی ، اسد!

حصول آساں تھا ، لیکن خوابِ خسرو نے گرانی کی

اے ہمہ خوابِ گراں ، حوصلہ بدنام ہے

غالب نے ان میں سے بعض مصرعوں میں خود اپنی کم حوصلگی پر بھی چوٹ کی ہے -

اب ہم کچھ ایسے اشعار نقل کرتے ہیں جن میں امیر خاں کے میدان سے منہ موڑنے پر سید صاحب کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے -

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے :
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ، ہے چراغاں مجھ سے

بے کسی ہائے شبِ ہجر کی حسرت ، ہے ہے!
سایۂ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے ، اسد!
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

بس کہ ہوں ، غالب ، اسیری میں بھی آتش زیرِ پا:
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

دل نہیں ، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار :
اس چراغاں کا ، کروں کیا ، کارفرما جل گیا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا :
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اب میں ہوں، اور ماتمِ یک شہرِ آرزو :
توڑا جو تو نے آئنہ، تمثال دار تھا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ :
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا :
کام میں میرے ہے جو فتنہ، کہ برپا نہ ہوا

(سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا :
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ، کہ دریا نہ ہوا)

[illegible] دیکھے، کرتا ہوں اس کو یاد، اسد!
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد :
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد!

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع :
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

نہ کی سامانِ عیش وجاہ نے تدبیر وحشت کی :
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

سرنگونی کا تاثر فارسی کلام میں :

امیر خاں کا انگریزوں سے ہم سری اور ٹکر لینے کا دعوی اور اس کا عبرت ناک انجام :

شب ارچہ با تو بہ دعوی نما نمای داشت
بہ روز طشتِ مہ از بامِ آسماں افتاد[1]

انگریزوں کے غلبے پر پیچ و تاب :

ز رشکِ غیر بہ دل خون فتاد ناگہ ، و من
بہ خون تپم ، کہ چہ افتاد تا چناں افتاد !

امیر خاں کا انگریزوں کے دام میں گرفتار ہونا اور اپنے مسلک سے رو گردانی :

تو گستردی بہ صحرا دام ، و از رشکِ گرفتاری
کفِ خاکم ، بہ رنگِ قمریِ بسمل ، پر افشاں شد

---

[1] گر گیا بامِ فلک سے صبح طشتِ آفتاب

خدا را ، اے بتان ، گردِ دلش گردیدنی دارد :
دریغا آبروے دیر ، گر غالب مسلمان شد!

امیر خاں کا اپنی سپاہ کو انگریزوں سے نبرد آزمائی سے زبردستی روکنا : سید صاحب کے اس مشورے کی حمایت کہ ابھی اس کا موقع ہاتھ سے نہیں گیا :

شرم کن آخر ، اے حیا ، این ہمہ دار و گر چیست ؟
خاطرِ غمزہ باز جو ، رخصتِ ترکتاز دہ

لشکر کے دل میں اپنی پرانی سہم جوئی کی خلش آمیز یاد :

چون آبگینہ اے بہ جگر در شکستہ ایم
آن چشمہ چشمہ لذتِ زخمِ خدنگ را

امیر خاں کا انگریزوں کے آگے آنکھیں اور سر جھکانا ، اس کی سپاہ کی سرکشی :

نگاہش شرم گین باشد ، چو مژگان سرکش است : آرے
فرو ماند سپہ دارے کہ برگردد سپاہ از وے

مقاومت ترک کر کے وفاداری اختیار کرنے کی ذلت :

شوخے کہ خود ز نامِ وفا ننگ داشتے
برباد می دہد بہ وفا ننگ و نام را

ادائے دل ستانی رفتہ از یاد :
ہوائے جان فشانی در سرش بین!

برقے کہ جان ہا سوختے ، دل از جفا سردش بہ بین!

سید صاحب کی مجاہدانہ عالی ہمتی اور امیر خاں کی کم حوصلگی :

شوقِ بلندی گرائے پایۂ منصور جست :
حوصلۂ نارسا بے بہ سرِ تیر برد

(بس کہ از آب و گلم رغبتِ تعمیر برد)

بہ بر کہ خونی و رہ زن بہ پایہ منصور است :
بدین حضیضِ طبیعی بہ اوجِ دار چہ حظ ؟

یہ شعر ایک لحاظ سے امیر خاں کے بارے میں سید صاحب کے جذبے کی ترجمانی کرتا ہے ، مگر اس کا ایک پہلو اور بھی ہے - پہلے مصرعے میں سید صاحب کے بارے میں مولوی فضلِ حق کی رائے جوں کی توں بیان کر دی ہے - دوسرے مصرعے میں اعتراض کا رخ مطعون کی طرف سے پھیر کر طناز کی طرف کر دیا ہے :

پست فطرت لوگ مجاہدانہ ولولے کے سوز و سرور کو کہاں سمجھ سکتے ہیں ؟

سخت کوشی کے بعد امیر خاں کا انگریزوں سے مقابلے کی تاب نہ لانا :

زمانہ حوصلہ نہ گرفت ، وکوہ کن جان داد :
چہ نرم شانہ گزشت و چہ سخت کوش آمد !

دمِ مردن بہ رشکم سخت گیرد
فراخی ہائے عیشِ سخت جاناں !

چہ بے برگی است جان دادن بہ زخمے زان دمِ خنجر !
بلا کستم فراخی ہائے عیشِ سخت جاناں را !

امیر خاں کا جد و جہد سے دست کش ہونا اور سید صاحب کا موردِ اعتراض بننا :

سرگرمِ سہر شد دلِ چرخِ ستیزہ جو
چندان کہ داغ کرد جبینِ ستارہ را

اپنے (ہندو) وکیل کے بہکانے سے اپنے لشکر کی مبارز طلبی کے باوجود ، اسے ہتھیار ڈالنے پر زبردستی مجبور کر کے درہم برہم کرنا :

بہ خونم دست و تیغ آلود جانان :
بہ آموزان وکیلِ بے زبانان !

فغاں تا مے گساران دجلہ نوشان !
دریغا ساقیان اندازہ دانان !

امیر خاں کی دوں ہمتی کی بدولت اس کے لشکر کی انگریزوں کے ہاتھوں ذلت و رسوائی :

بہ غیرت می گدازد در خجالت گہِ تاثیرم
زبون دیدن ز دستِ شیشہ سازان کہساران را

امیر خاں کی سپر اندازی پر شاعروں کی لعن طعن :

سازِ بدنامیِ رہزن شدن است
آہ ازان خستہ کہ از پویہ بہ رہ وا ماند !

سید صاحب کے زیرِ سایۂ امیر خاں کے ذریعے، جاہ و جلال کی باز یابی کی امید پوری نہ ہونا :

بہ فرقِ ما اگرش ناگہاں گزر افتد
چو گرد ، سایہ ز بال و پرِ ہما ریزد

بہ روے عقدۂ کارم، بہ شکلِ برگِ خزان
ز لرزہ ناخنِ دستِ گرہ کشا ریزد
(ہما : سید صاحب؛ گرہ کشا : امیر خاں)

امیر خاں سے غیر حقیقی توقعات وابستہ کرنا :

آن چہ ناید از ہما ، چشم از کبوتر داشتم!

امیر خاں کا عروج و زوال :

داغم ز رشکِ شوکتِ صنعان ، ولے چہ سود ؟
آن دست گہِ طاعتِ ہفتاد سال کو ؟

گوی بہ من : کسے کہ ز دشمن رسیدہ ، کو؟
آن پیر زالِ ہست بے پےِ قد خمیدہ کو ؟

غالب نے اپنے مافیہ کے بارے میں نثر میں بھی اسی قسم کے پیچیدہ اشارے چھوڑے ہیں جن سے نظم میں کام لیا ہے۔ 'خاتمہ' دیوانِ فارسی ، میں یہ عبارت شامل ہے :

'رخشے بدان تو سنے کہ عنانش موے و مشامش بوے برنہ تافتے ، و از شموسی گام بہ درازی نہ نہادہ ، جز بہ پہنا نہ شتافتے ، از ترسندہ دلی عنانش کشیدہ. . . . .

چون پارۂ از راہ ، بدین گونہ کہ برشمردم ، بریدہ شد ، و روز بلند گشت ، ہم جوشِ تندیِ توسن فرو نشت ، وہم دست و پاے سوار از عنان ورکاب خستگی پذیر آمد۔ تابِ نیم روز مغز در سرِ سوار گداخت ، و تفتگیِ ریگ بیابان نعل در پاے تگاور نرم کرد۔ رایض را دم و

کرہ را قدم بہ گداز آمد ، ہم آن بہ آخر گرایید و ہم این را بہ بستۂ نیاز آمد - توانائی بہ چارہ سگالیِ تو سنے سر آمد، و در ہنگامِ گسستہ دمی خستگی روے آورد - چہ می سرایم ؟ چہ می سنجی ؟"

یہ الجھے ہوئے پیرائے میں امیر خاں کی سپر افگنی کی روداد ہے -

آتش

آتش کا مزاج :

آتش کے شعری مزاج کے بارے میں جو قابلِ لحاظ خیالات ظاہر کیے گئے ہیں ، ان میں سے کچھ یہ ہیں :

"کلام کا رنگ بہت مردانہ ہے . . . . حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب ایک وقت کسی لشکر سے متعلق تھے ۔"[1]

''کاشف الحقایق''

'خواجہ صاحب کے کلام کی ایک موثر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقیرانہ اور آزادانہ شان پائی جاتی ہے . . . . اس فقیرانہ شان نے ان کے کلام میں مردانگی کے جوہر پیدا کر دیے ہیں ، جس کا اظہار وہ نہایت جوش کے ساتھ کرتے ہیں ۔'

''شعر الہند''

---

[1] یہ اشعار اسی تعلق پر مبنی معلوم ہوتے ہیں :

چہرے کو اپنے سواروں میں بھی ہم لکھوا چکے

کبھی کچھ کام بھی تو آے تیری ہمتِ عالی
مگر چہرا ہی لکھوایا ہے، اے آتش، سواروں میں؟

فراق نے آتش کی 'ہمک اور لہک'، 'گرما گرمی اور کڑک' کی اور پروفیسر سرور نے 'پھیلنے اور چھا جانے کی کیفیت' کی طرف متوجہ کیا ہے ۔ یہ تاثرات خلیل الرحمن اعظمی صاحب کے ''مقدمہ' کلامِ آتش'' میں یوں ادا کیے گئے ہیں :

'غزل کی یہ دھن اور یہ لے ، یہ ہما ہمی اور یہ للکار ، یہ معرکہ آرائی اور جاں سپاری ، یہ نشہ اور یہ ترنگ ، آواز کا یہ گاڑھا پن اور یہ دھمک شعرائے ماضی کی تمام مانوس آوازوں سے علیحدہ ہے ۔'[1]

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے آتش کی زندگی کی اس روش کی طرف اشارہ کیا ہے جو ایک حد تک ان کے آہنگ میں دخیل ہوئی :

'تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جوانی میں زیادہ وقت آوارگی اور آزاد منشی میں گزرا اور بانکے مشہور ہوگئے ۔ تیغ زنی بھی سیکھی اور اس میں یہ حالت ہوئی کہ بات بات پر تلوار کھینچ لیتے تھے . . . . جب تک جوانی رہی ، بانکپن اور شوریدہ سری کا سلسلہ جاری رہا ۔'

نیر مسعود صاحب نے رجب علی سرور پر اپنی تالیف میں بانکوں کے طور طریقوں کی یہ جھلک دکھائی ہے :

---

[1] بالکل علیحدہ ہے کہ نہیں ، اس میں گفتگو کی بڑی گنجائش ہے ۔

'مظلوم کی حمایت میں ظالم سے بھڑ جاتا؛ حریفوں کو ان کی تعداد کا خیال کیے بغیر سر بازار للکار دینا؛ جو ان سے مدد طلب کرے، اس کے لیے جان تک دینے سے دریغ نہ کرنا؛ ایک وضع مقرر کر کے مرتے دم تک اس پر قائم رہنا؛ غیرت و خود داری پر لمحہ بھر کے لیے آنچ نہ آنے دینا. . . . یہ سب خصوصیتیں تھیں جنھوں نے ان کو ایک افسانوی حیثیت دے دی. . . . ان کی بہادری شجاعت سے گزر کر تہور کی حد میں داخل ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ سے شہر میں آئے دن کشت و خون اور معرکہ آرائیاں ہوا کرتی تھیں اور ان کے دم سے لکھنؤ امن و امان کے دنوں میں بھی تلواروں کی جھنکار، قرابینوں کے دھماکوں اور جنگی نعروں سے گونجا کرتا تھا۔'

پروفیسر سرور نے لکھا ہے:

'آتش پر لکھنؤ سے زیادہ خود ان کی شخصیت کا پرتو پڑا ہے۔'

اس بیان میں ایک تو یہ واضح نہیں کہ 'لکھنؤ' سے کیا مراد لی گئی ہے۔ دوسرے، مواد خارجی ہو کہ داخلی، اس سے شاعر کیا اور کس ڈھنگ سے کام لیتا ہے، اس کی شخصیت تو بہر حال اس عمل میں جھلکے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ یہ فیصلہ

کرنے کے لیے کہ دونوں موثرات میں کس کا 'پرتو' کلام پر زیادہ پڑا ہے اور کس کا کم ، پڑھنے والے کا فرض ہے کہ وہ ان کو کلام کے اندر سے نکال کر ، جہاں تک بن پڑے ، الگ الگ کرے اور پھر دیکھے کہ وہ ایک دوسرے پر کس طور سے اور کس حد تک اثر انداز ہوئے ۔ اس کے بعد ہی دونوں کی مقدار اور کیف و کم پر کوئی معتبر حکم لگایا جا سکتا ہے ۔

یہ تو سچ ہے کہ اچھی شاعری وہی ہے جس میں ، بہ قول آتش ،

مطلب کتاب کا نہیں باہر کتاب سے

مگر ، جیسا کہ خود آتش نے تسلیم کیا ہے ، یہ بھی ہوتا ہے کہ

مطلب دقیق تھا : نہ سمایا کتاب میں

'دقیق' ہونے کے علاوہ ، مطلب کی اور بھی صورتیں ہیں جو اس کے 'سمانے' میں مانع آتی ہیں ، جن میں لکھنے والے کا عجزِ بیان بھی شامل ہے ۔ مگر ایسا کوئی شاعر ، حتیٰ کہ بڑے سے بڑا ڈراما نویس تک ، نہیں گزرا جس کا سارا کلام اس حد تک کافی بالذات ہو کہ اس کے مافیہ تک پہنچنے کے لیے کسی باہر کے اشارے یا سہارے کی مطلق ضرورت نہ پیش آئے ۔ غزل کا تانا بانا بھی اکثر خارجیات ہی کے تار و پود سے گوندھا گیا ہے ۔ اس تک رسائی نہ

ہو تو غزل کا وہ حصہ کیسے سمجھ میں آ سکتا ہے جس میں یہ پیوست یا دخیل ہے؟ ہمارا موجودہ سروکار آتش کے سب شعری عوامل سے نہیں - ہم ان کے کلام کو صرف یہ دیکھنے کے لیے ٹٹولیں گے کہ اس میں سے تحریکِ جد و جہاد کے بارے میں کیا برآمد ہوتا ہے اور ان کا آہنگ کس حد تک اس کا مرہون اور آئینہ دار ہے -

امیر خاں کی سپرافگنی اور اس کے متعلقات کا اشارتی اظہار

'ابرو' :

امیر خاں پر سید صاحب کا اثر زائل ہونا :

تشبیہہ نئی دوں ترے گیسوے رسا کو :
اترا ہوا چلہ کہوں ابرو کے کماں کا

امیر خاں پر قابو پا کر اس کے ایما سے انگریزوں کے ہاتھوں اس کے لشکر کی پاسالی :

قبضہ ہے اس پر تمھارے حسن سے خوں ریز کا:
کام ابرو کے اشارے سے ہو تیغِ تیز کا

(بھولتی آنکھیں نہیں اک دم تجھے، اے شہسوار!
یاد تیری دل سے کرتی ہے خلش مہمیز کا)

اے ترک ، تیرے قبضے میں ابرو سی تیغ ہے :
چن چن کے شوق سے تو سرِ بے گناہ کاٹ

(ترک : انگریز ؛ ابرو : امیر خاں ؛ بے گناہ : امیر خاں کے جاں باز وفادار لشکری)

'ابروے یار' :

امیر خاں کے لشکر کے لیے سید صاحب باعث تقویت :

ابروے یار سے قوت ہے مژہ کو ساری :
تیر کے واسطے سب زورِ کماں ہوتا ہے

نہیں غم تیغِ ابروے صنم سے قتل ہونے کا :
شہادت بھی بہ منزل فتح کے ہے مردِ غازی کو

(ہماری خاک کو ، اے شہ سوارو ، عرش دکھلایا :
خدا ہمت زیادہ دے تمھاری ترکتازی کو !)

'ابر و کماں' :

امیر خاں کا اپنے لشکر کے جذبۂ جد و جہاد سے فائدہ نہ پانا :

تیرِ نگہ سے تیرے کیا کیا شکار ہوتا
تو صید گہ میں ، اے ابر و کماں ، نہ ٹھہرا

'ابروے خم دار' :

امیر خاں کو سپر افگنی سے باز رہنے کا مشورہ :

نہ چیں ، اے ترکِ بے رحم ، ابروے خم دار میں آے :
لگا خامی کا دھبّا ، بل جہاں تلوار میں آے

امیر خاں کی کم حوصلگی پر پھبتیاں :

کہاں سے دی کبھی تشبیہ ہم نے ، تیر سے کج ہے :
کسی ہیں پھبتیاں اس ابروئے خم دار پر کیا کیا!

(شہادت خواہ تڑپے ہیں تری تلوار پر کیا کیا!)[1]

اپنے لشکر پر امیر خاں کی انگریزوں سے زیادہ سفاکی :

تیغ سے وہ ابروئے خم دار ہے خوں ریز تر[2]

'ابروئے کج' :

امیر خاں کا انگریزوں سے اپنی طاقت کا چراغ خود گل کرانا :

ابروئے کج سے خونِ عشاق کیا عجب ہے
تلوار نے نشانِ لشکر مٹا دیے ہیں[3]

(رویا ہوں یاد کرکے میں تیری تند خوی
صرصر نے جب چراغِ روشن بجھا دیے ہیں)

---

[1] آرزو مندِ شہادت مرگیے حسرت سے ، یار!
بے گنہ جب تیغ سے تیری ہمارا خوں ہوا!

[2] خوں تیغ زنوں کے دمِ شمشیر سے ٹپکے
کیا کیا نہ کہاں دار ترے تیر سے ٹپکے!

'ابرو و مژگاں' :

انگریزوں کے دانت امیر خاں کی سپاہ اور اسلحہ پر :

ابرو و مژگاں معما ہے جو تو سمجھے اسے :
ترکِ حسنِ یار کو تیر و کماں درکار ہے

(قیمتِ دل ان بتوں سے کیا سمجھ کر لیجیے؟
رہزنوں کو مفت سالِ کارواں درکار ہے)

'برگشتہ مژگاں' :

امیر خاں کے انگریزوں سے ساز باز پر سید صاحب کا پیچ و تاب :

وہ جانے گا ہماری حالتِ دل ، جس نے دیکھا ہے
اشارہ ابروئے پیوستہ سے برگشتہ مژگاں کا

امیر خاں کا انگریزوں سے بھی زیادہ اپنی فوج کے خون کا پیاسا ہونا :

دشمن ابرو سے زیادہ ہے وہ برگشتہ مژہ :
زخمِ شمشیر سے ہے زخم غضب خنجر کا

امیر خاں کی زیادتی سے بد دل ہو کر اہلِ لشکر کا منصوبہ'

جہاد سے منہ موڑنا :

عاشقوں سے ٹیڑھے رہنے کی سزا آخر ملی :
چشم سے برگشتہ تیرے موے مژگاں ہو گیے

(کیا نفاق انگیز چلتی ہے زمانے میں ہوا
سیکڑوں مجموعۂ صحبت پریشاں ہو گیے)

'ابرو و مژگان' :

انگریزوں کے خلاف فوجی نقل و حرکت میں سید صاحب کی امیر خاں سے بڑھ کر حوصلہ مندی :

سبقت اس ابرو کو جنبش میں ہے مژگاں سے :
تیر سے چلتی ہے آگے یہ کہاں چار قدم

'مژگاں' :

امیرِ لشکر کا اپنے لشکر کو درہم برہم کرنا :

الحذر گردشِ چشمِ سیہِ جاناں سے !
درہم اک خلق ہے برہم زدنِ مژگاں سے
خشم گیں آنکھ دکھائی جسے ، وہ قتل ہوا
برچھیاں چل گئیں ، اے ترک ، تری مژگاں سے

لشکر کا احساسِ محرومی :

کام آخر نہ ہوا اپنا صفِ مژگاں سے :
حسرتِ تیر لیے جاتے ہیں تر کشستاں سے

سید صاحب کی تربیت شدہ ہوئی فوج کا انگریزوں کے تصرف میں آنا اور ان کے خلاف لڑنے کی بجائے اپنوں کی خوں ریزی میں شریک ہونا :

مرغِ دل مارا پڑا چشمِ سیاہِ یار سے :
پنجۂ مژگاں اسے شاہیں کا چنگل ہوگیا

عاشقوں کے مرغِ دل کے خونِ ناحق کے لیے
پنجۂ مژگانِ جاناں پنجۂ شاہیں ہوا

سید صاحب اور ان کے برگزیدہ مجاہد :

مردمِ دیدہ رہے سایۂ مژگاں کے تلے:
زیست کا لطف ملا خنجرِ براں کے تلے

درسِ مقاومت :

عاشقوں سے یہ اشارا ہے تری مژگاں کا :
اس صفِ جنگ میں جو ٹھیت رہا ، رستم ہے

'جنبشِ مژگاں' :

انگریزوں کی فوجی نقل و حرکت سے امیر خاں کی ترکی تمام :

جنبشِ مژگاں سے وہ خوں خوار کھیلے گا شکار

جنبشِ ان مژگاں نے کی، دل پر چھری سی چل گئی:
مرغِ بسمل کی طرح آخر تڑپ کر ہوگیا

(کشورِ دل کو کیا غارت خطِ شب رنگ نے :
گردِ لشکر ، میں جسے سمجھا تھا لشکر ، ہوگیا)

صفِ مژگاں کی جنبش نے غبارِ خط کیا پیدا :
نمودِ گرد کی بنیاد ہے تحریکِ لشکر سے

یہ اشارہ جنبشِ مژگاں سے اس گل رو کا ہے :
دم نکل جاتا ہے سودای کا اس نشتر کے ساتھ

(کوہ ، مثلِ کاہ ، اڑتے پھرتے ہیں ٹھوکر کے ساتھ)

امیر خاں کی سپر افگنی اور اس سے ان بن کے بعد سید صاحب کا باقی ماندہ لشکر کی قیادت سنبھالنا :

صفِ مژگاں کی جنبش کا کیا اقبال نے کشتہ :
شہیدوں کے ہوئے سالار جب ہم سے تمن بگڑا

امیر خاں کی دوں ہمتی پر اس کے جاں باز ساتھیوں کے غم اور غصے کی ترجمانی آتش نے کئی جگہ طنز و تعریض کے بڑے چبھتے ہوئے پیرائے میں کی ہے :

آرزو رہ گئی اس کوچے میں پامالی کی :
دھوم ہی دھوم فقط چرخِ ستم گار کی تھی!

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا :
جو چیرا ، تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا !

قطرۂ اشک میں سرخی کا کہیں نام نہیں :
لہو تیرا بھی ہوا، اے دلِ ناکام ، سفید !

'مجنوں' :

امیر خاں کا اپنے لیے زمین حاصل کر کے اسی سے چمٹ جانا اور ساتھے پر کلنک کا ٹیکا لگانا :

زمیں پکڑی تو پھر ہرگز نہ چھوڑی بیدِ مجنوں نے :
نشانِ داغِ مجنوں رہ گیا صحرا کے دامن پر

شانِ عشق اولی ہے : مجنوں دود مانِ عشق سے
نا خلف ، نا قابل و نالائق و ناکارہ تھا

(اپنا دیوانہ تھا : اپنے واسطے آوارہ تھا)

نظر جو آئے بیدِ مجنوں، تو روؤں مجنوں کی یاد میں خوں

'کوہ و کن' :

(خاک ڈال آنکھوں میں میری ، قافلہ جاتا رہا
توڑ کر تارِ نگہ کا سلسلہ جاتا رہا)

جانبِ کہسار جا نکلا جو میں ، تو کوہ کن
اپنا تیشہ میرے سر سے مار کر جاتا رہا

جو دیکھوں تیشہ تو سر کو پھوڑوں : خیال بندہ جاے کوہ کن کا

(خراب مٹی نہ ہو کسی کی ، کوئی نہ مردودِ دوستاں ہو :
جدا ہوا شاخ سے جو پتا ، غبارِ خاطر بنا چمن کا)

جانِ شیریں مزدِ جوے شیر میں تیشے کو دی :
حوصلے سے اپنے باہر کوہ کن بے چارہ تھا

(جو حباب آیا نظر ، اک واژگوں نظارہ تھا)

غنیم کی بجاے اپنا سر پھوڑنا :

تکلف کیا جو کھوی جانِ شیریں پھوڑ کر سر کو ؟
جو غیرت تھی ، تو پھر خسرو سے ہوتا کوہ کن بگڑا

پھوڑنا تیشے سے اپنا سر نہ تھا، اے کوہ کن!
چھیننا شیریں کو تھا، پرویز کا سر توڑ کر

(ہاتھ پر سید نے بٹھلا لیا، پر توڑ کر)

ہی جو تیشہ زنی ہے تو ایک دن سننا
گرے گی اینٹ کہ گھر اپنا، توڑ کر، سنی

سر پھوڑ کے مر جائیں اس تیشہ زنی سے!

'جنوں' :

نہ دیکھ حوصلہ، جو چاہے لے لے داغِ جنوں :
بہارِ گل میں یہ سودا گراں نہیں ہوتا

سید صاحب امیر خاں کے لشکر میں :

نہ میں دم جب تک رہا، تیرے جلو میں، اے جنوں!
میں گریباں چاک بھی باندھے ہوئے دامن رہا

امیر خاں کا سید صاحب کے صائب مشورے پر عمل نہ کرنا :

گریباں پھاڑ کر دیوانے نے زنجیر کیوں پہنی ؟
کرے کیا عقل دخل اس میں ؟ جنوں کا کارخانہ ہے

امیر خاں کی خلل اندازی :

سمجھتے تھے نہ ہم اتنا در انداز، اے جنوں، تجھ کو:
گریباں سے تعلق ہو گیا موقوف دامن کا

(آستیں وہ ہوں کہ مربوط گریباں سے نہیں
وہ گریباں ہوں جسے قرب نہیں دامان سے)

'قیس و فرہاد' :

قیس و فرہاد سے دل دادہ' ہزاروں ، آتش !
تیشہ بے کار رہے گا ، نہ سلاسل خالی

'کوہ کن و مجنوں' :

سید صاحب اور شاہ صاحب کے بارے میں ان کے شدید ترین مخالف ، مولوی فضل حق کے خیال کی ترجمانی بھی آتش نے ان ہی نشانات سے کی ہے :

بحثِ علمِ عشق کے قابل نہ تھا دونوں میں ایک :
کوہ کن بے مغز تھا ؛ مجنوں جو تھا ، دیوانہ تھا

'آبلہ و خار' :

انگریزوں سے نبرد آزمائی کا ولولہ اور اس کی ناکامی :

رہِ صحرا میں جنوں کیوں نہ رکھے سرگشتہ ؟
جستجو آبلہ پایوں کو ترے خار کی تھی

(آرزو رہ گئی اس کوچے میں پامالی کی :
دھوم ہی دھوم فقط چرخِ ستم گر کی تھی !)

امیر خاں کی فوجی قوت و عزم دیکھ کر انگریزوں کی **خلش** :

جلا دیتی ہے اپنی گرم رفتاری بیاباں کو :
کھٹکتے ہیں ہمارے آبلے خارِ بیاباں کو

گیا ہوں بعد مدت کے جو میں دیوانہ صحرا میں
پڑی ہے آبلوں پر آنکھ نوکِ خار کی کیا کیا !

خلش کرے نہ مرے دل سے وہ مژہ کیونکر ؟
شکستِ آبلہ ہے فتح خار کے نزدیک

حریفوں کے علاوہ ، امیر خاں کی خود اپنے لشکر سے کشاکش :

آبلوں سے خارِ صحرا ہی نہیں مر کھینچتے
بید کے پتے بھی مجنوں پر ہیں خنجر کھینچتے

لشکر کی برہمی کا سارا الزام امیر خاں پر ڈالا گیا ، **حالانکہ** اس میں انگریزوں کا بھی ہاتھ تھا ، **جنھوں** نے اس کے **موثر ترین**

عنصر پر اپنا قبضہ جما لیا :

خارِ صحرا پر کسی نے تہمتِ دزدی نہ کی :
پاؤں کا مجنوں کے کیا کیا آبلہ جاتا رہا !
(دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا)

آبلے پاؤں کے کیا تو نے ہمارے توڑے
خارِ صحرائے جنوں ، عرش کے تارے توڑے

سہم کی ناکامی کا قلق :

خاک چھانی ہم سبک روحوں نے ، مثلِ گرد باد
وادیِ پر خار سے تلوے سلامت لے گیے

رہ گیا چاک سے وحشت میں گریباں خالی
لے چلے خار سے ہم گوشۂ داماں خالی

کوتہی کرتے ہیں راہِ دشتِ وحشت میں قدم
آبلہ پای کے ہاتھوں مغزِ سر میں داغ ہے

نا کامی کے باوجود بدستور دم خم :

سر کشی زیبا ہے ہم دیوانگانِ عشق کو
خم ہوئی ہے سیکڑوں کانٹوں کی گردن زیرِ پا

خار کا کھٹکا نہیں رکھتے ہیں ہم آتش قدم :
موم ہو جاوے اگر آجائے آہن زیرِ پا

رنگِ گل سے خوں ہمارے آبلوں کا شوخ ہے :
نقشِ پا سے پھولتا جاتا ہے گلشن زیرِ پا

گرمِ رفتاری سے ہر آبلہ اک اخگر ہے :
پاؤں سے میرے تہی کرتے ہیں پہلو کانٹے

پا خراشی ہے مری کوہ کنی سے افزوں :
چھلے پیدا تو کریں قوتِ بازو کانٹے !

امیر لشکر کا اپنے جوشیلے لشکر کی خود روک تھام کرنا :

بائے سمند الجھا ہوا ہے رکاب سے

حرارت ہوتی ہے سردار سے افزوں سپاہی میں :
زیادہ تر مزاجِ یار سے زلفوں میں بل پایا

احمیر نہنہ دیکھا : دستِ خشک و پائے شل پایا)

جوشِ وحشت میں بھی چڑھ کے نہ اس پر دوڑا :
لے گیے حسرتِ خارِ سرِ دیوار قدم

بیڑیاں ان کو پہنائیں ، قصور ان کا کیا ؟
میں گنہ گارِ جنوں ہوں کہ گنہ گار قدم ؟

پیچھے ہٹا نہ کوچہ قاتل سے اپنا پاؤں
سر سے تڑپ کے چار قدم آگے دھڑ گیا

امیرِ لشکر کا لشکر کو سرنگونی پر مجبور کرنا : لشکر کا پیچ و تاب :

چٹانے کو جو سنگ ، اے ترک ، اسے تو نے گھسیٹا ہے :
شہادت خواہ تڑپے ہیں تری تلوار پر کیا کیا !

جل گیا آگ میں اپنی میں ، مانندِ چنار
پیستے رہ گیے دانت ارہ و سوہان کیا کیا !

'روح و جسم' :

سید صاحب اور امیر خاں کی یک جای اور علیحدگی :

نفسِ شقی بھی روح کے ہم راہ تن میں ہے
یوسف کے ساتھ ، گرگ بھی اس پیرہن میں ہے

ایذا میں روح ہے تنِ خانہ خراب سے :
پائے سمند الجھا ہوا ہے رکاب سے

رہ جانا پیچھے جسم کا جاں سے عجب نہیں :
کس کارواں کی گرد پسِ کارواں نہ تھی ؟

دوستی نبھتی نہیں ہرگز فرو مایہ کے ساتھ :
روح جنت کو گئی ، جسمِ گلی یاں رہ گیا

(چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ :
ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا ، واں رہ گیا)

'جان و دل' :

دل چھٹ کے جاں سے، گور کی منزل میں رہ گیا
کیسا رفیق ساتھ سے مشکل میں رہ گیا !

(وہ داغ ہے جو دامنِ ساحل میں رہ گیا)

'روح و دل' :

سید صاحب کی رفاقت چھوڑ کر امیر خاں کی بے حقیقتی :

عزیز روح کے دم تک ہے کالبد دل کا :
خراب حال ہے، بے مغز جب ہوا چھلکا

'روح و قالب' :

انگریزوں کی تفرقہ اندازی :

روح قالب سے جدا کرتا ہے، قالب روح سے :
ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے یہ تیرے ناز کا

(سید صاحب کے اعجاز پر انگریزوں کے جادو کا غالب آنا :

زندہ ان آنکھوں کے کشتے کو نہ وہ لب کر سکے:
اس فسوں پر زور چل سکتا نہیں اعجاز کا)

'سلسلہ' :

سید صاحب کے تربیت یافتہ لشکر کا بکھرنا :

توڑ کر تارِ نگہ کا سلسلہ جاتا رہا :

خاک ڈال آنکھوں میں میری، قافلہ جاتا رہا

سلسلہ سودا زدوں کا درہم و برہم ہوا

'زنجیر' :

امیر خاں کا انگریزوں سے مرعوب ہو کر سپر افگن ہونا :

دکھائی چشمِ غزالاں نے حلقۂ زنجیر:
ہمیں تو گوشۂ صحرا بھی قید خانہ ہوا

سید صاحب کی تحریکِ حریت :

اب قدم سے ہے مرے خانۂ زنجیر آباد :
مجھے وحشت نے کیا سلسلہ جنباں پیدا

شیروں کو سلسلہ تری زنجیر سے ہوا

امیر خاں کے انگریزوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کے بعد ، جد و جہاد کا رخ سکھوں کی طرف ہونا :

لباسِ سرخ پہن کر جو وہ جواں نکلا[1]
پناہ مانگتا مریخِ آسماں نکلا

وہ زلف ہو گئی زنجیر اپنے سودے کی :
کہاں سے جا کے ہے یہ سلسلہ کہاں نکلا !

جہاد کی دعوت پر لبیک :

مردانِ عشق زلف کے پھندے میں پھنس گیے :
شیروں کو سلسلہ تری زنجیر سے ہوا

دامن و گریباں :

سید صاحب اور امیر خاں :

دم میں دم جب تک رہا، تیرے جلو میں، اے جنوں !
میں گریباں چاک بھی باندھے ہوئے دامن رہا

---

[1] پہنے پھرے لباس سپاہِ فرنگ سرخ آتش

امیر خاں کی خلل اندازی سے دامن و گریباں میں بے تعلقی :

سمجھتے تھے نہ ہم اتنا در انداز ، اے جنوں تجھ کو
گریباں سے تعلق ہو گیا موقوف دامن کا

آستیں وہ ہوں کہ مربوط گریباں سے نہیں :
وہ گریباں ہوں جسے قرب نہیں دامن سے

ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جوڑنا :

اڑ چکے پرزے جو اڑنے تھے گریباں کے مرے :
بس نہ اب سلسلۂ جنبشِ دامن ٹوٹے !

'خط' :

(خطِ صلح کی رعایت سے)

خطِ صلح کی مخالفت :

رخسارِ یار پر ہے کسے آرزوے خط ؟
ہو رو سیاہ اس کا جو چاہے زوالِ دوست !

خط نکلنے پر صفا چاہے جو یار، آتش، کہاں ؟
صاف ہونے میں ہمارے اب تامل ہو گیا[1]

---

[1] صاف دل خاک ہو اس کافرِ کمینہ جو سے
نکلے جب صلح کی باتوں میں بھی شر کا پہلو
آتش

امیر خاں کے لشکر کا انگریزوں کی پشت پناہ اور ان کا آلۂ کار بننا :

پناہِ چشمِ رقیبانِ بد نگاہ ہوا :
خط ان غداروں کے اوپر بجائے جوشن تھا

(دل و جگر ہوئے قوتِ فراقِ یار آخر:
برائے شحنۂ حاکم ہمارا خرمن تھا)

امیر خاں کے ہاتھوں سید صاحب کے تربیت دیے ہوئے لشکر کی بربادی :

کشورِ دل کو کیا غارت خطِ شب رنگ نے :
گردِ لشکر ، میں جسے سمجھا تھا لشکر، ہو گیا

خطِ صلح ، امیر خاں کے زوال کا پیش خیمہ اور سید صاحب کے لیے مصائب کا آغاز :

غبارِ خط سے وہ انداز و نازِ حسن کہاں!
نمودِ گرد ہے باقی ، مگر سپاہ نہیں

خط کا آغاز ہوا اس رخِ نورانی پر :
چل بسی صبحِ وطن ، شامِ غریباں آئی

خط سے رہا نہ حسنِ رخِ یار کا فروغ :
بجھنے نے اس چراغ کے دل کو بجھا دیا

(کافر سے بھی نہ ہو جو کیا نازِ حسن نے
عاشق کے دل کو توڑ کے ، کعبے کو ڈھا دیا)

ٹوٹنا اور جڑنا :

سید صاحب کا امیر خاں کو مشورہ کہ ان سے تربیت پایا ہوا لشکر تتر بتر نہ کرے :

کمندِ زلف کا ٹوٹے نہ تار ، اے شانے !

تار اس زلفِ معنبر کا نہ توڑ ، اے شانے !

اس مشورے پر عمل نہ کرنے کا خمیازہ :

شانہ ٹوٹا ، گیسوے تارِ معنبر توڑ کر

پھل نہیں پاتا کوئی شاخِ صنوبر توڑ کر
(ہاتھ پر صیاد نے بٹھلا لیا ، پر توڑ کر)

توڑ کر تارِ نگہ کا سلسلہ جاتا رہا
خاک ڈال آنکھوں میں میری ، قافلہ جاتا رہا

امیر خاں کا ٹوٹ کر غنیم سے تعلق پیدا کرنا :

فکرِ درماں جو کروں ، دردِ جگر پیدا ہو :
متفق خار سے ہو ، پاؤں میں سوزن ٹوٹے

اس بنا پر سید صاحب کا امیر خاں سے تعلق ٹوٹنا :

سمجھتے تھے نہ ہم اتنا در انداز ، اے جنوں ، تجھ کو :
گریباں سے تعلق ہو گیا موقوف دامن کا

سید صاحب کا تحریک کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر جوڑنا :

اڑ چکے پرزے جو اڑنے تھے گریباں کے مرے
بس نہ اب سلسلۂ جنبشِ دامن ٹوٹے

انگریزوں سے مصالحت کے خلاف امیر خاں کو سید صاحب کی تلقین :

خونِ ناحق کا مرے کھینچیے گا خمیازہ :
ہاتھ ملیے گا بہت ، مل کے حنا ، میرے بعد

کلہِ کج نہیں رہنے کی تمھارے سر پر :
تنگ و چست ایسی نہ ہووے گی قبا میرے بعد

مختصر ہووے گی یہ زلفِ رسا میرے بعد

رنگِ رخسارِ گل و لالہ دگرگوں ہو گا :
نہ رہے گی یہ گلستان کی ہوا میرے بعد

آستانِ یار سے اٹھنے کا قصد ، آتش ، نہ کر
چھوڑ کر اس در کو ، سر دیوار سے ٹکرایے گا

نگاہِ نازِ بتاں سے نہ چشمِ زخم بھی رکھ :
کسی کا یار نہیں فتنہ، زمانہ ہوا

امیر خاں کی گوشہ گیری کا خمیازہ :

گوشہ گیری سے ہے معدومی مجھے مقصودِ دل :
ٹوٹ جاتا ہے نگیں کھدتے ہی میرے نام کا

(سر کشی آخر فرومایہ کو دیتی ہے شکست :
ٹوٹتا ہے نخل پر انجام خشتِ خام کا)

عزلت گزینی کا جو میں نے کیا ارادہ
کنجِ لحد سے بہتر کوئی مکاں نہ ٹھہرا

(تیرِ نگہ کے تیرے کیا کیا شکار ہوتے!
توصیدگاہ میں ، اے ابرو کماں ، نہ ٹھہرا)

رعونت کون سی شے پر ہے ان عزلت گزینوں کو؟
حصیرِ کہنہ دیکھا ، دستِ خشک و پاے شل پایا

(غضب ہے منزلِ ہستی میں آسایش طلب ہونا :
ہجومِ خواب سے رہ رو نے ہے آخر خلل پایا)

آبلے پاؤں کے کیا تو نے ہمارے توڑے
خارِ صحراے جنوں ، عرش کے تارے توڑے

کنجِ عزلت میں بٹھایا ہے خدا نے ، آتش!
اب جو تم یاں سے ہلے ، پاؤں تمھارے توڑے!

امیر خاں کی ادھوری جد و جہد :

تیرِ نگہ سے تیری کیا کیا شکار ہوتے!
تو صید گہ میں ، اے ابرو کماں ، نہ ٹھہرا

ہاتھ قاتل کا مرے ، خنجر تک آ کر رہ گیا :
کہنیوں تک آستینوں کو چڑھا کر رہ گیا

ہو چکی تھی میرے نالوں سے قیادت آشکار
خواب سے سرِ فتنۂ محشر اٹھا کر رہ گیا

کر چکی تھی موسمِ گل کی ہوا نشتر طلب
خون جتنا تھا بدن میں ، جوش کھا کر رہ گیا

کارواں یاروں کا پہنچا منزلِ مقصود تک
میں ، بگولے کی طرح ، خاک اڑا کر رہ گیا

(شمع ساں ، اظہار کا یارا نہ آتش کو ہوا
سرگذشت اپنی زباں تک اپنی لا کر رہ گیا)

کام آخر نہ ہوا اپنا صفِ مژگاں سے :
حسرتِ تیر لیے جاتے ہیں ترکستان سے

گردشِ بخت ہے یا گردشِ پرکار ، آتش ؟
پاؤں اٹھتا نہیں اس گردشِ دوران سے

واہ رے شانے کی قسمت! کس کو یہ معلوم تھا
پنجۂ شل سے کھلیں گے عقدہ ہائے موے دوست

دو مریں گے زخمِ کاری سے ، تو حسرت سے ہزار
چار تلواروں میں شل ہو جائے گا بازوے دوست[1]

یاد کر کے اپنی بربادی کو رو دیتے ہیں ہم
جب اڑاتی ہے ہوائے تند خاکِ کوے دوست

---

[1] ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
ایک بھی لگنے نہ پایا زخمِ کاری ، ہائے ہائے! غالب

امیر خاں اور انگریز ('حنا')

امیر خاں کا اپنی جوشیلی سپاہ کا ساتھ چھوڑ کر انگریزوں کی پناہ لینا :

ممکن ہوا نہ خونِ شہیداں کو دست رس :
نکلا نہ پائے یار حنا کے حصار سے[1]

(بیہودہ خاک اڑانے سے کیا حاصل ، اے صبا !
ناوک فگن سوار ہو پیدا غبار سے !)

امیر خاں کے فروغ پر انگریزوں کا پیچ و تاب :

حنا پس پس گئی ہے دست و پائے یار پر کیا کیا !

انگریزوں کے ایما سے لشکر کا کشت و خوں :

اپنے خوں کی بو ہمیں آتی ہے تجھ سے ، اے نسیم !
ہاتھ مہندی سے کسی محبوب کا رنگیں ہوا

(آرزو مندِ شہادت مر گیے غیرت سے ، یار !
بے گنہہ جب تیغ سے تیری ہمارا خوں ہوا)

---

[1] اس روپوشی کی ایک وجہ :

بے وجہ عاشقوں سے نہ منہ ، اے صنم ، چھپا
بے جرم و بے قصور نہ حقِ سپاہ کاٹ

جنرل 'اختر لونی' کے اشارے پر لشکر کی برہمی :

ہمارا کوکبِ طالع مگر چہرہ تھا دشمن کا

کیا قتل اس نے کہنے سے رقیبِ تیرہ باطن کے :
رکھا گردن پہ اپنی دوست نے احسان دشمن کا

(سمجھتے تھے نہ ہم اتنا در انداز، اے جنوں، تجھ کو :
گریباں سے تعلق ہو گیا موقوف دامن کا)

کیا اک آن میں تیغِ جفا نے صاف دو ٹکڑے :
گماں ہی رہ گیا دشمن کو، آتش، اپنے جوشن کا

ایک دوسرے کے فروغ پر حریف قوتوں کا رشک و حسد[1] :

بغض و حسد سے پایا صحرا کو بھی نہ خالی :
ساکھو جلا ہے کیا کیا پھولا جو ڈھاک بن میں!

زمیں کو زلزلہ آیا جو میری بے قراری سے
ستارے کیسے کیسے پھڑکے! کیا کیا آسماں کھٹکا!

فزوں ہوتا ہے جمعیت سے زیرِ آسماں کھٹکا

---

[1] یہ حریف اُس وقت امیر خاں، مرہٹے اور انگریز تھے۔

دوست دشمن نے کیے قتل کے ساماں کیا کیا!
جانِ مشتاق کے پیدا ہوئے خواہاں کیا کیا!

اپنے لشکر کو برباد اور برہم کرانے کے بعد امیر خاں کی ندامت پر سید صاحب کا تأثر:

آ گیا مجھ کو پسینا، جب کوئی ملزم ہوا:
خاک میں میں مل گیا، جو سر کسی کا خم ہوا

دے کے پھانسی مجھ سے بے تقصیر کو، گیسوے یار
گردنِ اہلِ ندامت کی طرح سے، خم ہوا

سلسلہ سودا زدوں کا درہم و برہم ہوا

دل شہیدِ رہِ داماں نہ ہوا تھا، سو ہوا
ٹکڑے ٹکڑے جو گریباں نہ ہوا تھا، سو ہوا

(ہر زباں پر مری رسوائی کا افسانہ ہے:
نسخۂ شوق پریشاں نہ ہوا تھا، سو ہوا)

قتل کر کے مجھے، تلوار کو توڑا اس نے
خونِ ناحق سے پشیماں نہ ہوا تھا، سو ہوا[1]

---

[1] کی، مرے قتل کے بعد، اس نے جفا سے توبہ:
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا! غالب

عرق آلودہ جبین دیکھ کے ، دل ڈوب گیا :
شبنمِ باغ سے طوفاں نہ ہوا تھا ، سو ہوا

امیر خاں کا سید صاحب کا ساتھ چھوڑنا :

رفیقِ حال برے وقت میں نہیں کوئی :
شریک جنگ میں شمشیر کا نیام نہیں

دل چھٹ کے جاں سے، گور کی منزل میں رہ گیا :
کیسا رفیق ساتھ سے مشکل میں رہ گیا !

سبقت جو زندگی میں سکندر سے کی تو کیا ؟
اے خضر ، پیچھے گور کی منزل میں رہ گیا

پار اترا جو کہ غرق ہوا بحرِ عشق میں :
وہ داغ ہے جو دامنِ ساحل میں رہ گیا

ڈوبا فرعون وہیں ، موسیٰ وہیں پایاب آترا :
آنچ کھا کھا کے ہے سالم یہی سیماب آترا

شرط ہے رتبۂ مردانِ خدا کا انصاف
آتشِ عشق میں ثابت دلِ بے تاب اترا

جانبِ کہسار جا نکلا جو میں تو کوہ کن
اپنا تیشہ میرے سر سے مار کر جاتا رہا

میری وحشت نے چراغِ راہ جو سمجھا اسے
آنکھ دکھلا کر مجھے غولِ بیاباں رہ گیا

اسیر خاں کے انگریزوں سے مل کر اپنی جڑ کاٹنے کے بعد سید صاحب کی از سرِ نو سعیِ جد و جہد :

اثرِ سنگ کیا بادِ خزاں نے پیدا :
شیشۂ رنگِ گل و لالہ و سوسن ٹوٹے

ہوں میں وہ کشت بچے برق سے باراں کے اگر
لشکرِ مور پے غارتِ خرمن ٹوٹے

اس رہِ سخت میں لائی ہے پیادہ قسمت
گر سوار آے ، یقیں ہے ، سمِ توسن ٹوٹے

فکرِ درماں جو کروں ، دردِ دگر پیدا ہو :
متفق خار سے ہو ، پاؤں میں سوزن ٹوٹے

اڑ چکے پرزے جو اڑنے تھے گریباں کے مرے
بس نہ اب سلسلۂ جنبشِ دامن ٹوٹے

جلوۂ یار سے داغِ دلِ بے تاب ہوں دور :
کشت پر یاس کے برقِ شرر افگن ٹوٹے

پشتِ پا سنگ کو لگ جائے تو تھرا جاوے !
سر پٹکیے تو درِ قلعۂ آہن ٹوٹے !

مصحفِ رو سے ترے کفر کی بنیاد مٹی :
مسجدیں بننے لگیں ، دیرِ برہمن ٹوٹے

آرزو ہے یہی آتش کی خدا سے ، اے دوست !
تری پاپوش سے اک دن سرِ دشمن ٹوٹے !

الحذر گردشِ چشمِ سیہِ جاناں سے !
درہم اک خلق ہے برہم زدنِ مژگاں سے

کام آخر نہ ہوا اپنا صفِ مژگاں سے :
حسرتِ تیر لیے جاتے ہیں ترکستاں سے

تیغِ قاتل سے اڑا یوں سرِ شوریدہ مرا
جس طرح سے حرکت گوے کو ہو چوگاں سے

آستیں وہ ہوں کہ مربوط گریباں سے نہیں
وہ گریباں ہوں جسے قرب نہیں داماں سے

طرفہ گرمی سرے محبوبِ قبا پوش نے کی :
شمعِ کشتہ کو فروزندہ کیا داماں سے !

حالتِ شمع حرارت سے بہم پہنچی ہے :
سر کٹے ، پر نہ ہٹے پاؤں مرا میداں سے

شیر ہم ، اور نیستاں ہے حصیر ، اے آتش !
سلسلہ فقر کا ہے اپنا شہِ مرداں سے

دکھا کے چہرۂ روشن، وہ کہتے ہیں سرِ شام :
وہ آفتاب نہیں ہے جسے زوال ہوا

بلند خاک نشینی نے قدر کی میری !
عروج مجھ کو ہوا جب کہ پائمال ہوا

(وہی ہے لوحِ شکستِ طلسمِ جسم ، آتش !
جب اعتدالِ عناصر میں اختلال ہوا)

سالک کو یہی جادے سے آواز ہے آئی :
پامال جو ہو ، راہ وہ منزل کی نکالے

آتی ہے یہی معرکۂ عشق سے آواز :
یاں کشتہ نہ ہو جو، وہ مُسلّم نہیں ہوتا

کوشش کا ارادہ ہے، رہِ مہر و وفا میں
پھر کھل نہ سکے، باندھیے کس کر کمر ایسی

'ہما' :

سید صاحب کا سایہ امیر خاں کے لیے باعثِ خیر و برکت :

فقیری جس نے کی گویا کہ اس نے بادشاہی کی:
جسے ظلِ ہما کہتے ہیں، درویشوں کا کنبل ہے

وہ شاہِ حسن ہے تو، گیسوِ عنبر فشاں تیرے
ہما کو اپنے سایے سے سعادت مند کرتے ہیں

سید صاحب کی 'اقلیم فقر' کے لیے امیر خاں موجبِ نحوست :

اقلیمِ فقر سایے نے اس کے کیا خراب :
منحوس چغد سے بھی ہما کا قدم ہوا

امیر خاں کا انگریزوں کا گرویدہ ہونا :

شمعِ کافوری کا پروانہ ہما ہو جائے گا

انگریزوں سے اپنے لشکر کے معاوضے میں دولت سمیٹنے کے خیال سے امیر خاں کا اپنی گرم بازاری سے منہ موڑ کر ایک خرابے

(اور اپنی خرابی) کی طرف رخ کرنا :

تیرے ہی گنجِ حسن کے سودے میں چغد کو
شوقِ خرابہ کشورِ آباد سے ہوا

ایک ویرانے کی خاطر دہلی کی (موعودہ) بادشاہت سے ہاتھ دھونے پر امیر خاں کی تحقیر و مذمت :

میرے ویرانے کی حد میں کبھی اڑ کر جو آ نکلے
پلاؤں چغد کو پانی ہما کے کاسہٴ سر میں !

'کبوتر' :

کنویں میں جنگلی کبوتر کا آشیانہ ہوا

چھوٹ کے مرجع سے اپنے ، ہے پریشاں حال روح :
بھول کر گھر کو ، تباہی میں کبوتر ہوگیا
(گردِ لشکر ، میں جسے سمجھا تھا لشکر ، ہوگیا)

'کبک' :

سید صاحب کا امیر خاں کو حرکت میں لانا :
چال میں اس کی سراپا ہے کسی کی تقلید :
کبک کو یار کی رفتار لیے پھرتی ہے

امیر خاں کا سید صاحب کے راستے پر قدم نہ جما سکنا :

آئی ہے تو پسند اسے چال یار کی
سن لیجو : پاؤں کبکِ دری کا اکھڑ گیا
(ترکِ فلک زمیں میں خجالت سے گڑ گیا)

امیر خاں اور انگریزوں کے دوسرے حریفوں کا اُن کی فوجی حکمت عملی کا مقابلہ نہ کر سکنا :

چل نہیں سکنے کا ہرگز نیری اٹکھیلی کی چال
پاؤں میں موچ آے گی ، کبک ایسی ٹھوکر کھاے گا

چل سکیں گے کبک کیا اس فتنۂ محشر کے ساتھ ؟
کوہ ، مثلِ کاہ ، اڑتے پھرتے ہیں ٹھوکر کے ساتھ

نہ طاوسوں کو یہ طرزِ روش آئی ، نہ کبکوں کو
قدم مارا نہ کس کس نے تری رفتار پر کیا کیا !

امیر خاں کو قابو میں لانے کے لیے انگریزی فوج کی نقل و حرکت :

بے سبب مشقِ خرامِ ناز صاحب کی نہیں :
کبک کو سیدھا کرو گے پاے کج رفتار سے

'مرغِ قبلہ نما':

مانندِ مرغِ قبلہ نما ، پیشِ چشم ہے
وہ کعبۂ مراد ہو ہم سے ہزار دور

'مرغِ روح':

لائی ہے واں قضا و قدر مرغِ روح کو
پانی جہاں قفس کا ہے ، دانہ ہے جال کا

آزادی سے زیادہ اسیری میں لطف ہے .
دل مرغِ روح کا قفسِ گل میں رہ گیا

(پار اُترا جو کہ غرق ہوا بحرِ عشق میں
وہ داغ ہے جو دامنِ ساحل میں رہ گیا)

'مرغِ دل':

عاشقوں کے مرغِ دل کے خونِ ناحق کے لیے
پنجۂ مژگانِ جاناں پنجۂ شاہیں ہوا

مرغِ دل مارا پڑا چشمِ سیاہِ یار سے :
پنجۂ مژگاں اسے شاہیں کا چنگل ہوگیا

چاہے وہ جس طرح سے کرے مرغِ دل اسیر :
صیاد مطلع ہے کمینِ شکار سے

'مرغِ چمن':

بجلی وہ بہرِ خرمنِ مرغِ چمن بنا
جو خشک ہوکے شاخ سے برگِ خزاں گرا

امیر خاں کے ہاتھوں لشکر کی بربادی دیکھ کر سید صاحب کا اس سے قطعِ تعلق کرنا :

مرغانِ باغ آتشِ گل نے جلا دیے :
صیاد ہاتھ مل کے چمن سے نکل گیا

(کیا کیا عقیق کانِ یمن سے نکل گیا !)

'مرغِ آتش خوار':

انگریزوں کا امیر خاں کا منہ بند کرکے اسے بے دست و پا کرنا :

شمع کے شعلے کو جب گل گیر نے منہ میں لیا
پر نچا آنکھوں نے دیکھا مرغِ آتش خوار کو

یہ وہی 'گل گیر' ہے جس کی باڑھ موڑنے کی حسرت ایک شعر میں یوں ظاہر کی گئی ہے :

سر کو کٹواتی اگر مجھ سخت جاں کی طرح سے
ڈال دیتی آہنِ گل‌گیر میں دندانہ شمع

یہ 'سخت جاں' سید صاحب ، 'شمع' امیر خاں اور 'گل گیر' ملک و ملت کے جان لیوا انگریز ہیں) ۔

'غزال'

(انگریز)

امیر خاں کا انگریزوں سے ٹکر لینے کا دعویٰ کرکے آخرکار ان کے شکنجے میں پھنسنا :

طفلی میں اشارہ تھا یہ اس چشمِ سیہ کا :
ہم آنکھ لڑا دبں گے غزالِ ختنی سے

(سر پھوڑ کے مر جائیے اس تیشہ زنی سے!)

دکھائی چشمِ غزالاں نے حلقۂ زنجیر :
ہمیں تو گوشۂ صحرا بھی قید خانہ ہوا

(امیر خاں)

غزال ہوکر ، پالتو کتے کی طرح ، انگریز کی غلامی کا طلای

پٹّا پہننا :

پیدا کرے جو تیرے سگِ کو کی منزلت
طوقِ طلای ہووے گلوے غزال میں

(اس کے برعکس ،

دنیا کو تھوکتے نہیں دیوانگانِ عشق:
یاں طوق ہے طلا سے، نہ زنجیر سیم سے)

'آہو ، 'ہرن' :

امیر خاں کا انگریزوں کے مقابلے کی تاب نہ لانا :

سامنا تجھ سے جو ، اے ناوک فگن ، ہو جائے گا
چو کڑی کو بھول کر ، تو وہ ہرن ہو جائے گا

یہ کس نخچیرِ ناوک خوردہ کی صورت سے پھڑکا ہے؟
رمِ آہو ہے تیرے توسنِ چالاک سے پیدا

امیر خاں کا انگریزوں سے بے سروپا دعوائے ہم سری :

سینگوں کو اپنے دیکھے، کھروں پر نظر کرے :
ہم چشمِ یار ، چشمِ سیہ سے ، ہرن نہ ہو

غزال :

(مجاہد)

سکھوں کے ہاتھوں مجاہدوں کی ہزیمت :

(مجال کیا کوئی سودا زدہ جو دم مارے
گلو میں پھانسی ہے اس کاکلِ رسا نے دی)

اڑانے آئے تھے آنکھیں غزالِ چین و ختن
شکست ان کو تری چشمِ سرمہ سا نے دی

(جہاں سے حسرتِ منزل کا داغ لے کے گیا
تمھاری راہ میں جان اک شکستہ پا نے دی)

'ذقن' :

انگریزوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی غرض سے امیر خاں کی انگریز سپہ سالار سے ملاقات :

ذقنِ یار میں کی خط نے رسای پیدا :
چاہِ یوسف میں خضر بہرِ تماشا آترا

جد و جہد کی توقعات کا خون :

عشق اس چاہِ زنخداں کا ہوا جس دن سے
میں یہ سمجھا کہ لحد میں دلِ تاب آترا

(ہوگیا شوقِ شہادت سے حلال اپنا دل
سان پر چڑھ کے اگر دستۂ قصاب آترا)

امیر خاں کی بے حمیتی سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کا اسے ٹونک کے کنوئیں میں غرق کرکے اپنے راستے سے ہٹانا :

حسن نے تشنۂ دیدار بہت جب پایا
ڈوب مرنے کے لیے چاہِ ذقن مجھ کو دیا

رہا ہے چاہِ ذقن میں، مرا دل وحشی :
کنوئیں میں جنگلی کبوتر کا آشیانہ ہوا

بجھ کر ہیں رہ گیے لبِ چاہِ ذقن چراغ

سید صاحب کا اس سانحے پر قلق و ملال :

دیکھا تھا کیوں ان آنکھوں نے، آتش، ذقن کا حال؟
لے کر مجھے کنوئیں میں دلِ خستہ جاں گرا

(امیر خاں کا اپنے ساتھ اپنے لشکر کا بھی خاتمہ کرنا :

بجلی وہ بہرِ خرمنِ مرغِ چمن بنا
جو خشک ہوکے شاخ سے برگِ خزاں گرا)

سید صاحب کے تشنۂ شہادت اسیرانِ وفا :

سیکڑوں ہی دل ہے ، مثلِ ماہیِ بے آب ، اسیر :
یار کا چاہِ زنخداں بھی ہے چشمہ دام کا

'مریخ' :

امیر خاں کے لشکر کا جذبۂ جنگ جوی :

حاضر ہیں ہم جو معرکۂ کارزار ہو :
مریخ فیلِ مست کے اوپر سوار ہو

اپنے لشکر کے کشت و خون کی بدولت امیر خاں کا انگریزوں کے ہاتھوں خاتمہ :

کپڑے رنگے جو خونِ احبا سے یار نے
مریخِ چرخ کشتۂ بیداد ہوگیا

امیر خاں کا سرخ پوش انگریز سپہ سالار کے مقابلے کی تاب نہ لانا :

پوشاکِ سرخ پہنی جس روز سے کہ تونے
مریخ تیرے آگے ، اے نوجواں ، نہ ٹھہرا

لباسِ سرخ پہن کر جو وہ جواں نکلا
پناہ مانگتا مریخِ آسماں نکلا

سرخ پوش شاہ اسماعیل ، سید صاحب کی جماعتِ مجاہدین کے
چشم و چراغ :

بے وجہ لباس اپنا نہیں سرخ یہ رکھتا :
مریخ ہے پیرو تری بیداد گری کا

دیدۂ مریخ جوہر ہے مری شمشیر کا

مریخ کی طرح سے ، ہے خوں ریز عاشقاں :
پہنے لباسِ سرخ تو ہے حسبِ حالِ دوست

سرخ پوشاک پہنتا ہے تو کہتا ہے وہ ترک :
آنکھ مریخ لڑاوے تو لڑاتا ہوں میں

لباسِ سرخ سے کرتا ہے یار خوں ریزی :
حسینوں میں بھی ہے مریخ سا جواں ہوتا

ظلمت میں ایک خونیں ستارے کا نمودار ہونا :

شبِ یلدا میں ہے مریخ ستارہ نکلا

بعید نہیں کہ یہ خونیں ستارہ نشان ہو سید صاحب اور
شاہ صاحب کی تحریکِ جد و جہاد کا -

'کوکب'

(جزل 'اختر لونی' کے نام کی رعایت سے)

ہمارا کوکبِ طالع مگر چہرہ تھا دشمن کا
تھا داغِ سفید اپنی آنکھوں میں جو کوکب تھا

'اختر' :

ایک جا ، مثلِ درِ غلطاں ، کہیں ٹھہرا نہ پاؤں :
اخترِ اقبال ہوں میں گردشِ ایام کا

نشانہ تیرِ تہمت کا ہے میرا اخترِ طالع
(ٹوٹ جاتا ہے نگیں کھدتے ہی میرے نام کا)
(دانے کا دھوکا مجھے دیتا ہے حلقہ دام کا)'

'اختر' کا عروج :

کیا ان دنوں زحل کا ستارہ بلند ہے ؟
کعبے سے کیا شرف ، جو کلیسا بلند ہے ؟

' سید صاحب نے امیر خاں کو انگریزوں کی چالوں سے خبردار کرنا چاہا ، مگر وہ پھر بھی ان کے جال میں پھنس گیا :

ظاہرِ بازیِ ایام ہے باطن سے خلاف :
دانہ ہوتا ہے عیاں ، دام نہاں ہوتا ہے

دھوکا دیتا ہے مجھے دانے کا ، حلقہ دام کا

سید صاحب کا گہن میں آنا :

اختر شناس کہتے ہیں : سورج گہن میں ہے
(یوسف کے ساتھ گرگ بھی اس پیرہن میں ہے)

سید صاحب کی تحریک کا آتار چڑھاؤ :

اب قدم سے ہے مرے خانۂ زنجیر آباد :
مجھے وحشت نے کیا سلسلہ جنباں پیدا

وحشت نے ہمیں جب کہ گلستاں سے نکالا
غیرت نے قدم پھر نہ بیاباں سے نکالا

وحشت نے کیا خانۂ زنجیر سے باہر
صحرا کی ہوا نے مجھے زنداں سے نکالا

یہ دیکھ کر کہ سید صاحب ٹکر لینے پر تلے ہوئے ہیں ۔ انگریزوں نے پھوٹ ڈلوا کر ان میں اور امیر خاں میں مفارقت کرا دی :

جھپکی نہ دمِ قتل جو قاتل سے مری آنکھ
کھنچوا کے مجھے گنجِ شہیداں سے نکالا

امیر خاں کا لشکر انگریزوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا

تھا - اسے ختم کر کے آنھوں نے گویا سید صاحب کو ان کی گراں مایہ متاع سے محروم کر دیا :

سوزن نے کیا خارِ کفِ پا سے جو باہر
گویا کہ وہ گل میرے گریباں سے نکالا

ظلمت نے ہے سرچشمۂ حیواں سے نکالا

ناسخ

اسیر خاں کی، میر افگنی اور سید صاحب :

چست ہے روح رہِ شوق میں ، پر سست ہے قدم :
تنگ ہے دیا ہی سبک‌دوش گراں‌بار کے ساتھ !

اپنے منصوبے کی ناکامی پر سید صاحب کا حسرت و تاسف :

پہنچا سناں پر اس کی ابھی میرا سر کہاں ؟
نخلِ مرادِ عشق نے پایا ثمر کہاں ؟

جاتا ہے صید گاہ میں وہ چھوڑ کر مجھے
اے مرغِ روح ، تیرے گیے بال و پر کہاں؟

تھا مجھے جب جوشِ وحشت ، تنگ آتا تھا نظر :
گھٹ گئی جو طاقتِ پا ، کیا بیاباں بڑھ گیا ؟

نخلِ بریدہ ہوں : مجھے کیا برگ وبار سے ؟
شاخِ شکستہ ہوں : نہیں مطلب بہار سے

امیر خاں کی سپر افگنی کا پس منظر[1]

امیر خاں جس کے ہاتھ میں ہلکر کی فوج کی کمان ہے، علانیہ ہمارا دشمن ہے -

۱۵ جنوری ۱۸۱۵

آج چند افسر امیر خاں کے کیمپ سے آئے ہیں اور اپنے ساتھ مسلح سواروں کی جماعتیں لائے ہیں تا کہ سکنر کی فوج میں بھرتی ہو جائیں . . . . . جو لوگ آج آئے ہیں، ان کا بیان ہے کہ امیر خاں کے کیمپ میں تیس ہزار سپاہی اور ایک سو پچیس توپیں ہیں . . . اس فوج کے ساتھ امیر خاں نے راجہ جے پور کے علاقے میں ایک ایسے مقام پر قبضہ کر لیا ہے جو ضلع دہلی کے اہم ترین حصے سے بارہ منزل کی مسافت پر واقع ہے . . . اگر وہ حملہ کر دے تو میں اس کے مقابلے میں

---

[1] امیر خاں کے انگریزوں کے آگے ہتھیار ڈالنے اور ان کی بالا دستی تسلیم کرنے کی یہ روداد ہم عصر ماخذ سے ترتیب دی گئی ہے - مہر صاحب نے ''سید احمد شہید'' میں اور سید ابوالحسن علی نے ''سیرتِ سید احمد شہید'' میں اس واقعے کو سید صاحب کے نقطۂ نظر سے اور تحریکِ جہاد کے تناظر میں بیان کیا ہے - یہ وہی نقطۂ نظر ہے جو سید صاحب اور شاہ صاحب نے اپنے معتقد شاعروں کے شعور میں جمایا اور رچایا -

ساڑھے چار ہزار سوار اور پیدل فوج سے زیادہ جمع نہیں کر سکتا - جہاں تک جلد ممکن ہو ، اس سے جنگ کرنا ضروری ہے ، کیونکہ تاخیر سے آسے فائدہ پہنچ سکتا ہے ، مجھے نہیں . . . امیر خاں کی فوج کی کیفیت کے بارے میں غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے - آس کی سوار فوج کی تربیت بالکل سکنر کے سواروں کی طرح ہوئی ہے اور سالوں سے یہ فوج چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتی رہی ہے - اس کا توپ خانہ بھی اچھا ہے - ہمارے توپ خانے کے ایک افسر نے اس کی سوار فوج کا توپ خانہ دیکھا تھا - آس نے مجھے یقین دلایا کہ یہ ساز و سامان سے ویسا ہی لیس ہے جیسا خود ہمارا توپ خانہ -

معلوم ہوا ہے کہ ہولکر کے توپ خانے کا انتظام بھی ، جو اس کے ساتھ ہے ، اچھا ہے - محمد خاں کی پیدل فوج اور توپ خانہ اس فوج میں شامل ہیں اور مسلمہ طور پر ملکی سرداروں میں یہ دونوں بہترین ہیں - ان کی تربیت ابتداً ان سپاہیوں اور گول اندازوں سے ہوئی تھی جن کو ہم نے جنگِ مرہٹہ کے بعد ناعاقبت اندیشی سے منتشر کر دیا تھا - کہا جاتا ہے کہ نظم و ضبط کے لحاظ سے دونوں ویسے ہی مکمل ہیں جیسے خود ہماری فوج اور توپ خانہ . . . میں اپنی چھوٹی سی فوج کو . . . قبل از وقت جمع کرنا نہیں چاہتا کہ اس کے ناکافی ہونے کا اندازہ قرب و جوار کے فتنہ انگیز سرداروں کو نہ ہو جائے - کان پور کی فوجوں میں سے کوئی بھی اس طرف نہیں بڑھائی جا سکتی کیونکہ جہاں وہ ہیں ، وہاں سیندھیا

کی کسی حد تک روک تھام کیے ہوئے ہیں - سیندھیا اس وقت کان پور میں ہے ، اور اس کے ساتھ دس ہزار سے زیادہ آدمی نہیں ہیں - لیکن اگر وہ اپنے حلیفوں کو بھی شامل کر لے ، جو میدانِ جنگ میں ہیں تو پھر اُس کی فوج فوراً لڑائی کے لیے تیار ہو جاتی ہے - گوالیار میں وہ دو آب سے صرف تین منزل ، آگرہ سے پانچ اور دہلی سے پانچ منزل کے فاصلے پر ہے - پنڈاری جو علانیہ غارت گری کرتے ہیں اور جن کی گزر اوقات ہی لوٹ مار پر ہے ، یقیناً بیس ہزار سے زیادہ سوار میدانِ جنگ میں لا سکتے ہیں جن کا ایک حصہ بہت ہی اچھا ہے - خوش قسمتی سے اپنے باہمی شدید اختلافات کے باعث وہ ہمارے مقابلے میں متحد ہو کر نہیں آتے - پھر بھی خطرے کی گھٹا جو چھائی ہوئی ہے گھری ہے -

۱۳ جنوری ۱۸۱۸

امیر خاں اپنی ۵۲ پلٹنوں اور سواروں کی ایک بڑی فوج کے ساتھ ہمارے لیے خاصی زحمت کا باعث ہوا ہوتا ، اگر ہم نے اُسے یہ نہ دکھا دیا ہوتا کہ اس کا تحفظ اور فائدہ اسی میں ہے کہ ہمارے ساتھ شامل ہو جائے ، بجائے اس کے کہ ہماری مخالفت کرے - (''مارکویس آف ہیسٹنگز کا ذاتی روزنامچہ''، دوسرا ایڈیشن ، ۱۸۵۸)

ہلکر کی ریاست کی درہمی ، سیندھیا کی حکومت کی ابتری ، نظام کی اکثر رعایا کے باغیانہ جذبات اور اُن کے ساتھ امیر خاں کی زبردست فوج کو دیکھ کر ، جس کی دھاک اس وقت اپنے عروج

پر تھی ، یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ مسلمانوں کے اقتدار کو دوبارہ واپس لانے کا مقصد رکھتا ہے ۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر اسے سیاست کی سمجھ بوجھ ہوتی یا فوجی سردار کی حیثیت سے اس میں نمایاں قابلیت ہوتی تو وقت اس کام کے لیے نہایت ساز گار تھا . . . اس کی پٹھان سپاہ حسرت و تاسف سے کہتی تھی کہ ایک متبرک درویش کی پیش گوئی ، کہ وہ دہلی کا بادشاہ بن جائے گا ، پوری ہوتے ہوتے رہ گئی [1] ۔ عافیت پسندی کی بنا پر اس کی جرات میں شبہہ کیا گیا ہے ۔ اس نے انگریزی حکومت سے ایسے وقت ٹکر لینے سے گریز کیا کہ جب وہ ہندوستان کے آدھے سورماؤں کو اپنے جھنڈے کے نیچے صف آرا کر سکتا تھا ۔ دعوی سے کہا جا سکتا ہے کہ میدانِ کارزار کم کسی نے اس قدر بے آبروئی کے ساتھ چھوڑا ہوگا جتنا کہ امیر خاں نے ۔

(میجر جنرل سر جان مالکم :
''وسطی ہند کی یادداشتیں''، جلد ۱ ، ۱۸۲۳)

اگر امیر خاں میں وہ قابلیت اور بلند حوصلگی ہوتی جو اکثر لوگ سمجھتے تھے کہ اس میں ہے تو وہ قوت حاصل کرنے کی خاطر ضرور ایک بڑی جد و جہد کرتا . . . اس کی جگہ سیوا جی یا

---

[1] یہ اشارہ ہے سید احمد شہید کی طرف ، جو امیر خاں کے فوجی اور روحانی مشیر تھے ۔ انہوں نے خواب دیکھا تھا کہ امیر خاں دہلی کے تخت پر متمکن ہو کر فرنگیوں کو ملک سے نکالے گا ۔

حیدر علی ہوتا ، اور اُن کو وہ وسیلے حاصل ہوتے جو اس وقت اُسے تھے تو وہ ہمارے مقبوضات کے دور دراز گوشوں تک میں آگ لگا دیتے اور انہیں تہِ تیغ کر ڈالتے ۔

(مالکم : ''ہندوستان کی سیاسی تاریخ'' ، جلد دوم ، ۱۸۲۶)

اُس (امیر خاں) کو اپنا مفاد اس میں نظر آیا کہ جتنی جلدی بن پڑے وہ اپنے لیے ایک الگ علاقہ حاصل کر لے ، مگر شرط یہ تھی کہ اس کی خاطر وہ اپنی فوج کو بھینٹ چڑھائے ۔ فوج پر اسے اتنا قابو نہ تھا کہ اس کے جذبات کو نظر انداز کر کے اس کی مخالفت کر سکتا ۔ باجی راؤ اور اپا صاحب کی ناکامی کی خبر معلوم ہونے تک فوج شدت سے انگریزی تجویزوں کی مخالف تھی ۔ بالآخر جب وہ جنرل ڈونکن کی اور میجر جنرل سر ڈیوڈ آکٹر لونی کی فوج کے نرغے میں آ گیا جو ریواڑی میں جمع تھی تو اُسے یہ فیصلہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کس کا ساتھ دے ۔ ہماری فوجوں کے قرب سے اُسے اپنی فوج کے جذبات کو ٹھکرانے کا موقع ملا ۔ چنانچہ (دسمبر ۱۸۱۷) کے دوران میں اس نے صلح کی توثیق کر دی ، اور اس کے بعد وہ دل سے ہمارا طرف دار بن گیا اور ہماری تمام تدبیروں اور تجویزوں کی پابندی کرنے لگا ۔

امیر خاں کو تمام وقت (نئے نظام سے مطابقت کا جو ہیسٹنگز وجود میں لانا چاہتا تھا) احساس تھا ؛ مگر اس کے ماتحت سردار

ان شرائط سے بالکل مطمئن نہ تھے جو اس نے حاصل کی تھیں اور جن کے فائدے تمام تر صرف اسی کو پہنچتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پٹھان سردار نے اپنے فوجی ساتھیوں کو دھوکا تک دینے سے دریغ نہ کیا اور اپنے ایجنٹ [نرنجن لال] کے ذریعے جو دہلی میں مقیم تھا گفت و شنید کی ایسی روداد بھجواتا رہا کہ وہ اس کے سرداروں کے حق میں اس سے زیادہ سود مند نظر آئے جتنی کہ وہ دراصل تھی۔۔۔

اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ امیر خاں شروع سے (بھاری) شرائط کو تسلیم کرنے پر آمادہ تھا، مگر اس کی فوج کی مکمل سرکشی اور اس کے بااثر سرداروں کی خود سری نے اسے اس فریب دہی پر مجبور کیا تاکہ اپنے لیے علیحدہ شرائط حاصل کرنے کے دوران میں وہ ان کی تواضع موہوم امیدوں سے کرتا رہے۔

(صلح نامے کی) توثیق کے بعد امیر خاں سر ڈیوڈ آکٹر لونی کے کیمپ میں آیا اور کچھ دیر وہاں مقیم رہا تاکہ اپنے سرکش لشکر کو منتشر ہونے اور اپنے اسلحہ حوالے کرنے پر آمادہ کرسکے۔۔۔ امیر خاں کے محدود وسائل ایسے نہ تھے کہ اپنے حکم سے وہ اپنی فوج سے یہ کام کرا سکتا جو کئی سال سے آئے دن کی کمائی پر گزر اوقات کر رہی تھی، اور جسے اب کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنے ذریعۂ معاش کو چھوڑ دے اور ہمیشہ کے لیے اپنی فوجی مطاق العنانی کی روش سے جو راسخ ہو چکی تھی دست بردار

ہو جائے - چنانچہ سردار اور سپاہ کچھ عرصے تک برانگیختہ اور بددل رہے - اس کی پوری کوشش کے باوجود وہ اپنے رسالے نہیں چھوڑتے تھے - مارکویس آف ہیسٹنگز کو اس کی ہرگز توقع نہ تھی کہ وہ اُن کے پیشے کے اوزار ہتھیار بغیر خوف کے زبردست دباؤ ڈالے اُن سے چھین سکے گا - مہدپور میں ہولکر کی فوج کی بربادی سے اُنھیں اندازہ ہو گیا کہ ان کا بھی یہی انجام ہوگا - پھر مہتاب خاں اور راجہ بہادر کے پٹھان دستوں کے بیچ میں سر ڈیوڈ آکٹرلونی آگے بڑھ کر حائل ہو گیا - اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور جنوری کے دوران میں دونوں کی توپیں حاصل کر لی گئیں - باقی سردار کچھ دیر اور سرکشی کرتے رہے، خصوصاً جمشید خاں جس نے اپنی توپیں آخر تک نہ چھوڑیں اور جو فوجی کاروائی کی دھمکی سے اُنھیں حوالے کرنے پر مجبور ہوا - پٹھان سپاہ کا پرامن طریقے سے منتشر کرنا اسلحہ حاصل کرنے سے بھی زیادہ دقت طلب کام تھا - اپنے دوسرے مواعید کی طرح، اس کی تکمیل میں بھی امیر خاں نے بڑی سرگرمی دکھائی، مگر اس میں اسے دیر تک کامیابی نہ ہوئی... آکٹر لونی نے امیر خاں کی مساعی میں اپنے معروف حسنِ تدبیر سے مدد دی -

(ہنری ٹی - پرنسپ : "ہندوستان میں سیاسی اور فوجی کاروائیوں کی تاریخ (۱۸۱۳ - ۱۸۲۳)"، ۱۸۲۵

پندرھویں کو جب کہ امیر خاں کے ساتھ معاہدے کی

گفت و شنید ترقی کر رہی تھی ، سر ڈیوڈ آ کٹر لونی اپنے پرسنل سٹاف ، کرنل سکنر ، نواب احمد بخش خاں اور بعض دوسرے اشخاص کے ساتھ میر (کذا) سے ملنے کے لیے ایک گاؤں کو روانہ ہوئے جو کیمپ سے چار کوس کے فاصلے پر واقع تھا اور میر خود جنرل سے ملاقات کی غرض سے کیمپ سے چھ کوس آگے آیا - پہلی رسوم و آداب کی ملاقات دوسرے روز ہوئی - میر کے جلو میں پانچ سو سوار ، پیدل فوج کا ایک دستہ اور دو تیزی کے ساتھ چلنے والی توپیں تھیں - فریقین ہاتھی پر آئے تھے ، اور پٹھان سردار بظاہر بہت خوف زدہ تھا - جب دونوں ہاتھی ایک دوسرے کے قریب پہنچے تاکہ جنرل میر سے ہاتھ ملائے جو ایسے موقعوں پر سلام کا معمولی طریقہ ہے تو میر کے خدمت گر نے جو ہودج میں اُن کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا ، پستول کا گھوڑا چڑھا کر جنرل کے سینے کی طرف چھتایا - تمام سوار روشن فتیلے ، قرابین اور پرانی قسم کی بندوقیں لیے ہوئے تیار کھڑے تھے - ایک عاجلانہ تعارف کے بعد میر نے جلدی جلدی پکار کر کہا : 'چلو! چلو!' اور وہ علیحدہ ہوگئے - چند منٹ میں جنرل اپنے خیمے میں چلے گئے اور میر اُس خیمے میں جو سر ڈیوڈ کے حکم سے اُن کے لیے نصب کیا گیا تھا کیونکہ وہ اپنے ساتھ کوئی خیمہ نہیں لائے تھے -

شام کے وقت جنرل آکٹر لونی نے معاملات کے سلسلے میں میر سے ملاقات کی اور دستور کے مطابق تحائف اُنھیں دیے گئے -

دوسرے دن میر ملنے آئے اور انھیں بھی تحائف پیش کیے گیے مولف کو یہ چیز قابلِ توجہ معلوم ہوئی کہ ظاہری شکل و صورت، اندازِ گفتگو یا کسی بات میں بھی پٹھان سردار نے کوئی اچھا اثر قائم نہیں کیا - وہ ایک کم رو شخص تھا - ایک نیلا صافہ اور میلا سفید چوغہ پہنے ہوئے تھا - باتیں بہت کم کرتا تھا اور جو کہتا وہ ادنیٰ درجے کی عامیانہ بات ہوتی، جس کے کہنے کا طریقہ بھی گھٹیا ہوتا تھا - اُس نے کہا کہ میں ہندوستان کا بادشاہ ہوں، لیکن جنرل کی دوستی کی خاطر اس دعوے سے دست بردار ہو گیا ہوں - اُس کے ساتھی بھی بہت معمولی طریقے سے اس کے متعلق گفتگو کرتے تھے، اور چونکہ اُن کے نزدیک وہ انگریزوں سے دب گیا تھا، اس کو برا بھلا کہتے تھے - وہ یہ بھی کہتے تھے کہ کیمپ میں واپس پہنچنے پر اس کی اچھی طرح خبر لی جائے گی -

(''لفٹننٹ کرنل جیمز سکنر کے فوجی سوانح''
مرتبہ جے - بیلی فریزر، جلد ۲، ۱۸۵۱)

لارڈ مویرا بنام مسٹر مٹکاف

بیرک پور، ۵ مئی ۱۸۱۷

اگر بلا تصنع امیر خاں کو تھوڑی سی امید دلائی جا سکے تو یہ دانش مندی کی بات ہوگی - یہ ظاہر کر کے ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے لیے کس علاقے کا خواہش مند ہے،

اور اسی کے ساتھ مبہم اشارات سے اسے امید دلانا کہ اس سلسلے میں اس کے مفید ِ طلب کارروائی جلد عمل میں آ سکتی ہے ، اسے ٹھیک رکھنے میں مفید ہو سکتی ہے - مجھے یقین ہے کہ غارت گر طاقتوں کے ایک عظیم الشان اتحاد میں اس کا تعاون حاصل کرنے کی سخت کوششیں ہو رہی ہیں - ایسے اتحاد میں شرکت سے اس کا انکار کر دینا دوسروں کو خاموش رکھنے میں بہت کارگر ہوگا - کسی خاص بات کے طے کرنے سے گریز آپ اس حیلے سے کر سکتے ہیں کہ میرے شمالی ہند پہنچنے کی جلد توقع ہے . . .

(سوانح و مراسلات چارلز لارڈ مٹکاف ، مرتبہ :
آئی - ڈبلیو - کے ، جلد ۱ ، ۱۸۵۸) '

امیر نے کہا : رنجیت سنگھ وغیرہ میں ہمت نہیں ، نہ سہی ، میں کابل جاتا ہوں - بہر طور شاہ کو کمک پر لاتا ہوں - ہمارے پاس دس پندرہ لاکھ کے جواہر ہیں - یہ شاہ کو دوں گا - باقی دہلی لکھنؤ سے وصول کر کے دینے کا اقرار کروں گا - انگریزوں کو ہند سے نکالوں گا - مہاراج [پٹیالہ] نے کہا : اور جو شاہ نہ آئے ؟ امیر نے کہا : کچھ پرواہ نہیں - اٹک تک جا کر اپنے ہم وطن ہم قوم پٹھانوں کو جمع کروں گا - لاکھوں یوسف زئی ساتھ لے کر لُوٹوں گا - ان ملکوں کو لوٹوں گا - اعدا سے انتقام لوں گا - یا سر نذرِ سودا ہے یا انجام حصولِ مدعا ہے -

' ان اقتباسات کا ترجمہ میری درخواست پر علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے ایک استاد جناب محمد عذیر نے کیا تھا -

جب محاصرہ مادھو راج پورہ کو نو ماہ ہوئے اور انسداد رسد وغیرہ سے کار محصوروں پر تنگ ہو کر قریب تھا کہ قلعہ مفتوح ہو، ناگاہ انھیں ایام میں افسرانِ افواجِ قاہرۂ انگلشیہ نے ہر جانب سے باسپاہِ گراں و سامانِ بے پایاں امیر کی جانب نہضت کی اور نرنجن لال وکیلِ امیر سے منتظم الدولہ مسٹر مٹکاف صاحب بہادر نے دہلی میں اقرار دینے ملک کا مع گونہ گونہ فوائدِ استحکامِ دوستی فی مابین استوار کر کے درستی اس مقدمے کی موقوف ملاقات و مصالحت پر رکھی اور ایک عہدنامہ مفید اپنا، خالی نفعِ امیر سے، لکھ کر پاس امیر کے واسطے مہر ثبت کرنے کے بھیجا۔ چنانچہ اکبر آباد کی طرف سے جرنل ڈنکین صاحب بہادر با فوجِ سنگین بہ بہانۂ تدارکِ پنڈار بانئ کشور آشوب کوچ کر کے ... مادھو راج پورہ کے بفاصلہ پندرہ کوس کے آ پہنچے، اور امیر کے جانے سے براہِ کوٹہ سدِ راہ ہوئے تا رانا اور لشکرِ ہولکر سے ملنے نہ پاویں، اور جانب شاہ جہان آباد سے جرنل اختر لونی صاحب بہادر نے با فوجِ جرار اور توپ خانۂ آتش بار قریب آ کر واسطے اثباتِ مہر کے عہد نامہ مذکور پر زور دیا، اور فیض اللہ خاں بنگش، کہ قدیم رسالہ دار امیر کا تھا، راہِ بے وفائی سے مع رسالہ لشکرِ امیر سے نکل کر داخلِ لشکرِ انگریزی ہوا۔ امیر نے جب دیکھا کہ وقت نازک ہے۔ ادھر محاصرۂ قلعہ در پیش، آدھر ہر طرف سے افواجِ فرنگ میرے در پے، رفیقانِ قدیم سالکِ راہِ بے وفائی، ہم راہیاں کوتاہ فہم اپنی فوج کے، خود

مجھے سپرد افسران فرنگ کیا چاہتے ہیں ، نہ کسی سے اس وقت میں امید رفاقت و تن دہی ہے ، نہ لشکر ہولکر میں بسبب وقوع فسادات بے شمار کے جاے امن و پناہ ، مع ہذا جرنل مالکم صاحب بہادر نے اس طرف جا کر اکثر عماید ہولکر کو . . . موافق اپنے کر لیا ہے . . . سو ایسے وقت میں، کہ نہ جاے رفتن نہ روے ماندن ، امیر صاحب التدبیر نے مصالحت حکام انگریزی اور ظاہر و باطن موافقت آن سے صلاح دولت جان کر طریقۂ اتحاد کو مرعی رکھا ، اور باوجودیکہ ہنوز نرنجن لال وکیل دہلی راہ میں تھا اور عماید باجی راؤ پیشوا اور وکیل زوجۂ ہولکر باستدعاے اعانت و امداد امیر کے پاس حاضر ہوے تھے ، اور تمام پنڈارے دم مفارقت امیر کا بھرتے تھے، مگر امیر نے براہ دوربینی ان سب کے قول و فعل کو غیر معتبر سمجھ کر اول بھاڑہ سنگھ . ٹھاکر مادھو راج پورہ سے صلح کر کے متعلقان اخوند زادہ محمد ایاز خاں کو رہا کرایا اور ترک محاصرہ کر کے مورچے اٹھائے اور راے دتا رام کو، کہ جے پور میں واسطے درستی مقدمات کے تھا، لکھا کہ جلد پاس جرنل اختر لونی صاحب بہادر کے حاضر ہو کر طریق اخلاص و یک جہتی اس طرف سے بیان کرے - چنانچہ حسب الحکم وہ اور محمد عمر خاں مقام سانگا نیر میں جرنل موصوف سے مستفید ملازمت ہوے اور صلاح طرفین سے اس بات پر اقرار پایا کہ مابین دونوں لشکروں کے ایک میدان مقرر ہو اور وہاں بزم اتحاد منعقد ہو کر بلا واسطہ جرنل و امیر باہم گفتگو

درستیِ مقدمات میں کریں . . . جرنل بہادر نے اس قدر اخلاص و محبت امیر سے کیا کہ دامِ الفت میں پابند ہوے اور چند روز اسی طرح اس مقام میں ٹھہر کر ہر ایک نے دوسرے سے ربط و ضبط بڑھایا ۔ اس عرصے میں لالہ نرنجن لعل وکیل بھی داخلِ لشکر ہوے ، تب جرنل موصوف نے امیر کو واسطے ثبت کرنے مہر کے عہد نامہ پر ، پیام دیا ۔ امیر نے کہا: جب تک میری شرائط منظور نہ ہوں گی ، مجھ کو مصالحت ہرگز منظور نہیں ، اور وکیل مذکور کو خریطہ جرنل صاحب سے مقابلہ کر کے درستی اس امر مصالحت کی حوالۂ راے محبت پیراے منتظم الدولہ رزیڈنٹ دہلی کے فرمائی اور ادھر رخصت کیا اور منتظرِ جواب رہے ۔ غرض جب وکیل دہلی میں جا کر شرف یاب ملازمتِ منتظم الدولہ بہادر سے ہوا تو چونکہ وہ نہایت دانا اور صاحبِ فراست . . . تھے ، انھوں نے جواب مفصل ان شرائط کا کچھ نہ لکھا ۔ فقط یہی دو باتیں جوابِ خریطہ میں تحریر کیں کہ جب تک تمھارا مہری عہد نامہ صاحبانِ صدر کے پاس پہنچ کر باعثِ استحکامِ رابطہ و داد و اتحاد ہوگا ، اس وقت نتائجِ دوستیِ کمپنی بہادر کے خوب تر آپ پر ظاہر ہو جاویں گے کہ ان میں سر بسر آپ کی بہبودی اور کامرانی ہوگی ۔ خلاصہ یہ کہ امیر نے باعتمادِ صداقتِ قول و درستیِ فعلِ دانایانِ فرنگ کے وفاق کو نفاق سے بہتر جان کر مہر اپنی اس عہد نامہ پر ثبت فرما دی اور پاس جرنل صاحب موصوف کے ، کہ ذمہ دار درستی ہرگونہ مقدماتِ امیر کے ، بعد ثبت

ہوئے مہر کے ، ہوئے تھے ، بھیج دیا ، اور تمام کار و بار اپنے ان کے حوالے فرمائے - بمقتضائے الفت و یک جہتی جو بہتر و مناسب جانیں عمل میں لاویں ، اور چونکہ اس صلح نامے میں کہ مقبولۂ طرفین تھا یہ شرط بھی تھی کہ امیر نصف توپ خانہ تفویضِ سرکار انگریزی کریں اور بٹالن اور رسالے زائد حاجت سے برطرف فرماویں اور طلب تنخواہ ان کی سرکار اُنگریزی سے دی جاوے گی ، لہذا جرنل نصیرالدولہ بہادر نے امیر سے واسطے ایفائے اس شرط کے سوال کیا اور ہمراہ امیر کے لعل سونٹھ و خوشحال گڑھ وغیرہ پرگنات جے پور میں ، کہ کمپو راجہ بہادر لعل سنگھ اور نواب مہتاب خاں اور میاں اکبر محمد خاں کے ان مقدمات پر متعین تھے ، جا کر نصفی سامان جنگ طلب کیا - ہر چند اول میں سپاہ نے انکار کیا ، لیکن فہمائش امیر کی قبول کر کے سات آٹھ لاکھ روپیہ تنخواہ کے حسب مرضی جرنل موصوف سے وصول کر کے سامانِ موعودہ سرکار کے تفویض کیا اور جرنل صاحب نے نصفی توپ خانہ لے کر زاید سپاہ کو برطرف کیا اور بقیہ افواج سے واسطے ایک جماعت منتخب کے امیر سے کہا کہ ان کو موضع ہریانہ میں روانہ کریں تا آن سے انصرامِ کارِ سرکار لیا جاوے - امیر نے بعد عہد و پیمان کے رسالہ محمد عمر خاں اور اخوند زادہ محمد ایاز خاں اور راجہ بہادر کو مع سات آٹھ پلٹنوں کے خدمتِ جرنل میں نامزد فرمایا . .

چونکہ اس وقت میں نواب جمشید خاں دس بارہ ہزار فوج

شیخا والی میں قید ہے ، خبر مصالحتِ امیر کی سرکار سے سن کر طعنہ زن ہوے اور اپنے کو خود سر رئیسِ مستقل قرار دے کر تفویضِ نصفی توپ خانہ سے انکار کیا - ہر چند امیر نے فہمائش کی، نہ مانا - لاچار جرنل نے امیر صاحب سے کہا کہ اگر نواب جمشید خاں کو تفویضِ نصفی توپ خانہ اور برطرفیِ سپاہ میں کچھ تامل ہے تو ہم کو فقط آپ کی اجازت درکار ہے - امیر نے بہناچاری اجازت دی کہ تنبیہ اُن کی کی جاوے . . . جب افسرانِ سپاہِ انگریزی قریب نواب جمشید خاں کے پہنچے اور ان پر بابت انکار واسطے قتال و جدال کے تخویف کی، جب وہ تاب ہم پنجگیِ سرکار نہ لا سکے تو اپنے کردار سے منفعل ہوے اور سپاہ کو جواب دے کر توپ خانہ سپردِ سرکار کیا - اس عرصے میں جرنل ڈنکن صاحب نے براہِ بوندی کوٹہ جا کر پنداروں کا انتظام کیا . . .

(''امیر نامہ اردو'' مترجمہ سعید احمد اسعد ص ۱۲۹)

معاہدہ مابین ایسٹ انڈیا کمپنی و امیرالدولہ محمد امیر خاں، جسے کمپنی کی طرف سے مسٹر چارلز تھیوفیلس مٹکاف اور نواب کی جانب سے لالہ ترنجن لال نے طے کیا۔ ۹ نومبر ۱۸۱۷

توثیقِ معاہدہ: ۱۵ دسمبر ۱۸۱۷

دفعہ ۱

حکومتِ برطانیہ ضمانت کرتی ہے کہ مہاراجا ہلکر کے علاقوں کی جو جگہیں مہاراجا مذکور کے عطیات کے طور پر نواب امیرخاں کے قبضے میں ہیں، ہمیشہ ان کے اور ان کے ورثا کے قبضے میں رہیں گی اور حکومت ان مقبوضات کو اپنے تحفظ میں لیتی ہے۔

دفعہ ۲

نواب امیر خاں اپنی فوج کو خدمت سے سبک دوش کر دیں گے بہ استثنا اس حصے کے جو ان کے مقبوضات کے اندرونی انتظام کے لیے ضروری ہوگا۔

دفعہ ۳

نواب امیر خاں کسی علاقے پر حملہ نہ کریں گے۔ وہ پنڈاروں اور دوسرے غارت‌گروں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیں گے اور اس کے علاوہ حتی المقدور ان کو سزا دینے اور کچلنے میں حکومتِ برطانیہ کی مدد کریں گے۔ وہ حکومتِ برطانیہ کی رضامندی کے بغیر کسی فریق سے معاملے کی کوئی گفت و شنید نہ کریں گے۔

دفعہ ۴

نواب امیر خاں اپنی تمام توپیں اور فوجی سامان حکومتِ برطانیہ کے حوالے کر دیں گے ، سوائے اس حصے کے جو ان کے مقبوضات کے اندرونی انتظام اور ان کے قلعوں کی حفاظت کے لیے ضروری ہوگا ۔ اس کا انھیں مناسب مالی معاوضہ ملے گا ۔

دفعہ ۵

جو فوج نواب امیر خاں اپنے پاس رکھ چھوڑیں گے ، اسے حکومتِ برطانیہ کے مطالبے پر حاضر ہونا پڑے گا ۔

سی - یو ایچسن : صلح نامے ، معاہدے اور سندیں ، جلد ۳ ، ۱۸۶۶

امیر خاں :

امیر خاں ۱۱۸۲ میں پیدا ہوئے . . . . ۱۲۰۲ میں قسمت آزمائی اور کشور کشائی کے لیے سنبھل سے نکل پڑے - راستے میں سپاہی پیشہ اور طالبِ روزگار آدمی شامل ہوتے رہے - کچھ عرصے مختلف سرکاروں میں نوکری کی ، پھر اپنی ایک جمعیت پیدا کر لی اور اپنی لیاقت اور شجاعت کا سکہ بٹھا دیا ۔ بارہا اپنی قلیل جمعیت سے فوجِ گراں کا مقابلہ کیا اور بڑے بڑے لشکروں کو شکست دی ۔ ان کی جمعیت اور طاقت روز بروز بڑھتی گئی - ۱۲۱۵ میں جب وہ سرونج کی طرف گیے تو ستر اسی ، ہزار سوار اور پیادے ان کے ہمراہ تھے - ۱۲۳۰ میں

انھوں نے پچاس ہزار پیادے اور بارہ ہزار سوار اپنے ایک فوجی افسر کے سپرد کیے . بیس پچیس سال کابل ، مالوہ ، مارواڑ ، راجپوتانہ اور دکن کی سر زمین ان کی رزم آرائیوں اور جنگ آزمائیوں کی جولاں گاہ رہی - بڑی بڑی ریاستیں ان کی یلغار سے لرزہ براندام رہتی تھیں . . . انھوں نے عرصے تک صرف مختلف ریاستوں پر حملہ کر کے یک مشت یا سالانہ رقم وصول کرنے پر اکتفا کی اور کبھی ایک فریق کی دوسرے فریق کے مقابلے میں مدد کر کے وقتی منفعت حاصل کر لی ، کبھی دوسرے فریق کی پہلے فریق کے مقابلے میں حمایت کر کے رقم وصول کر لی . . . آخر ۱۲۳۲ میں ایسے حالات پیدا ہو گیے کہ ان کی سرگرمیوں کا میدان اتنا تنگ ہو گیا کہ انھوں نے انگریزوں سے مصالحت کر لی اور راجپوتانے اور مالوے کے چند متفرق اور غیر اہم حصوں پر قناعت کر کے جن کے مجموعے کا نام ریاست ٹونک تھا ، انھوں نے خانہ نشینی اختیار کر لی . . .

اس طرح نواب کی سی سالہ فوجی سرگرمیاں اور اولوالعزمیاں ختم ہو کر ریاست ٹونک کی بنیاد پڑ گئی ، جو انگریزوں کی چالاکی اور نواب کی سادہ لوحی سے راجپوتانے اور مالوے کے چند متفرق اور منتشر علاقوں پر مشتمل تھا جو مہاراجہ ہلکر نے نواب کے سپرد کر رکھے تھے - فوج ، جس میں ہندوستان کا بہترین فوجی عنصر تھا ، جو پورے ملک کی طاقت کا سرمایہ ہو سکتا تھا ، منتشر کر دی گئی - صرف اتنے آدمی رکھے گیے جو علاقوں کے انتظام کے لیے ضروری سمجھے گیے - توپ خانہ اور ساز و سامان

انگریزوں نے صلح کی ایک شرط کے مطابق خرید لیا ۔ نواب نے عہد کیا کہ وہ کسی علاقے پر حملہ نہیں کریں گے ، بلکہ پنڈاروں کی 'سرکوبی' میں کمپنی کی مدد کریں گے ۔

صلح کی ساری کاروائی صیغۂ راز میں ہوئی . . . نواب کے رفقا اور مشیرانِ کار میں سے اکثر کی رائے تھی کہ صلح کر لی جائے ، لیکن سید صاحب اس صلح کے مخالف تھے[1]۔ آپ نے آخر تک نواب کو اس سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور اس کے خطرات سے آگاہ کیا ، لیکن نواب اپنے کو ان حالات میں بالکل مجبور و بے بس پاتے تھے ۔ سالہا سال کی تگ و دو اور جاں فشانیوں کا نتیجہ دیکھ کر جو افسوس ہے کہ بے نظمی اور بے تدبیری کے ساتھ جاری رہیں ، ان پر ایسی افسردگی اور پست ہمتی طاری تھی ، اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقبال سے وہ اس درجہ متاثر تھے کہ چھوٹی سی ریاست کے گوشۂ عافیت کو غنیمت سمجھ رہے تھے ۔ سید صاحب حالات سے اس درجہ متاثر نہ تھے ۔ ان کے نزدیک مایوسی کی کوئی وجہ نہ تھی ، نواب کو انگریزوں کا مقابلہ اور اس بڑھتے ہوئے خطرے کا سدِ باب کرنا چاہیے تھا ، جس کی زد میں سارا ہندوستان اور بالآخر سارا عالمِ اسلام تھا ۔ ان کے نزدیک یہ ہندوستان کی آخری

---

[1] '(سید صاحب) معمولی لشکری یا افسر نہ تھے ، بلکہ نواب کے خاص مشیر اور صلاح کار تھے ، اور نواب انھیں ایک عزیز دوست ، حقیقی بہی خواہ اور حد درجہ معتمد علیہ رفیق سمجھتا تھا۔'

مہر : ۱۰۴

آزاد اور جنگ جو طاقت تھی جس کو اس آسانی کے ساتھ سپر انداز اور مقابلے سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے تھا ، مگر ان کو جلد معلوم ہوگیا کہ نواب کی قوتِ مقابلہ جواب دے چکی ہے اور صلح کے سب مراحل طے ہو چکے ہیں ۔ اس کے باوجود بھی آپ نے 'افہام و تفہیم' کا سلسلہ جاری رکھا ۔ جب یہ محسوس کر لیا کہ اب کوئی گفتگو کارگر نہیں ہوسکتی اور مصالحت ایک طے شدہ امر ہے تو آپ نے لشکر سے مفارقت اور دہلی واپس جانے کا فیصلہ فرما لیا ، گویا آپ کی رفاقت و شرکت کی شرط یہی تھی کہ نواب ایک آزاد طاقت کی حیثیت سے باقی رہیں ، اور مطمحِ نظر یہ تھا کہ آپ جلد یا بہ دیر اس آزاد طاقت کو صحیح رخ پر لگائیں ، اور اس سے اسلامی اقتدار کے قیام اور ہندوستان کے استخلاص و استقلال کی مہم میں کام لیں ۔ جب یہ امید منقطع ہو گئی تو آپ نے لشکر سے مراجعت فرمائی اور دہلی کا رخ کیا ۔ "وقایعِ احمدی" میں ہے :

'مادھو راج پورہ پر فوج کشی کے سلسلے میں انگریزوں سے صلح کر لینے کا مشورہ ہوا ۔ حضرت کی رائے کسی طرح اس کی نہ تھی ، اور آپ کا مشورہ جنگ جاری رکھنے کا تھا ؛ مصالحت کو کسی طرح مناسب نہ سمجھتے تھے ۔ خود نواب صاحب کی بھی یہی خوشی تھی ، مگر لشکر کی بے سر و سامانی اور اہلِ لشکر کی خود غرضی اور نااتفاقی کا عذر کرتے تھے اور خیال تھا کہ دس ، پانچ لاکھ روپے

لے کر مہاراج ہلکر کی طرح لشکر کا ساز و سامان درست کر کے لڑیں گے ۔ حضرت نے فرمایا کہ مصالحت کرنے کے بعد آپ سے کچھ نہ ہوگا ۔ لیکن نواب صاحب ملنا ہی مصلحت سمجھتے تھے ۔ آنھوں نے اس کی تیاری کی ۔ حضرت نے فرمایا کہ 'اچھا ، آپ انگریزوں سے ملتے ہیں تو میں رخصت ہوتا ہوں ۔' نواب صاحب نے بہت سمجھایا مگر حضرت نے نہ مانا ۔ چند آدمی ہمراہ لے کر جے پور چلے گئے ۔ دوسری ملاقات میں فرمایا : 'نواب صاحب ، ابھی کچھ نہیں گیا ، اختیار باقی ہے ، آپ کی فہمائش کو آیا ہوں ۔ اگر میرا کہنا مانیے تو آن سے لڑیے اور ہرگز نہ ملیے ۔ ملنے کے بعد آپ سے کچھ نہ ہو سکے گا ۔ یہ کفار بڑے دغا باز اور مکار ہیں ۔ کچھ آپ کے واسطے جاگیر و تنخواہ مقرر کر کے کہیں بٹھا دیں گے کہ روٹی کھایا کیجے ، پھر یہ بات ہاتھ سے جاتی رہے گی ۔' یہ فرما کر آپ تشریف لے گئے ۔ مصالحت کے بعد ایک مرتبہ پھر آپ لشکر میں تشریف لائے ، جس سے کچھ لینا دینا تھا ، لیا دیا ، اور نواب صاحت سے ملاقات کی ۔ نواب صاحب بہت آب دیدہ ہوئے اور کہا : 'حضرت ، جو کچھ تقدیر میں تھا ، وہی ہوا ۔ حکمِ الٰہی سے چارہ نہیں ۔ اب اگر دہلی کو جاتے ہیں تو صاحب زادہ محمد وزیر خاں کو ہمراہ لے جائیے ۔' آپ نے قبول کیا ، اور کچھ دن بعد ایک خط شاہ عبدالعزیز صاحب کو لکھا کہ 'خاکسار

قدم بوسی کو حاضر ہوتا ہے - یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہوگیا - نواب صاحب انگریزوں سے مل گیے - اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں -'

سید ابوالحسن علی : ''سیرتِ سید احمد شہید''

سید صاحب امیر خاں کے لشکر میں :

سید صاحب کی ولادت سے کم و بیش تیس برس پیشتر ایک اجنبی قوت نے بھی ہندوستان میں قدم جما لیے تھے - یہ انگریز تھے جو تاجروں کے بھیس میں آے - ملکی حاکموں کی بد عملیوں نے ان میں حکمرانی کے ولولے پیدا کر دیے - سب سے پہلے کرناٹک ، بنگال ، بہار اور اڑیسہ ان کے زیر اثر آے پھر انھوں نے مرہٹوں اور نظام کو ساتھ ملا کر سلطنتِ میسور کو ختم کیا - آدھر سے فارغ ہوئے تو مرہٹوں ، نظام اور اودھ پر توجہ مبذول کی - تھوڑے دنوں میں سب کو امدادی فوجی نظام کی زنجیروں میں جکڑ کر بے دست و پا بنا دیا - پھر دہلی پہنچے تو اس تخت کے مختارِ کل بن گیے جو پورے ہندوستان کی اطاعت و انقیاد کا سرچشمہ تھی - سید صاحب کے ہوش سنبھالنے سے پہلے یہ سب کچھ پورا ہو چکا تھا - یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں کہ اسلامی حکومت کے احیا کا خواب دیکھنے والے ہر شخص پر واضح تھا کہ انگریزوں سے ٹکرائے اور اسے پاش پاش کیے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھایا نہیں جا سکتا -

ملکی کار فرماؤں میں سے اگر کوئی شخص اس جہاد میں رفاقت و اعانت کا حق ادا کر سکتا تھا تو وہ صرف امیر خاں تھا ۔ شجاعت و جواں مردی میں اس کی دھاک دور دور تک بیٹھی ہوئی تھی ۔ استعدادِ حرب و ضرب میں بھی اس کا مرتبہ بہت اونچا تھا ۔ جس خصوصیت نے اسے اقران و اماثل میں سب سے بڑھ کر سربلند کر دیا تھا ، وہ یہ تھی کہ اس پر انگریزی اثر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی ۔ وہ بالکل آزاد تھا ، اس لیے اسلام و وطن کی آزادی کی خاطر صلاحیتِ جہاد میں کوئی اس کا ہم سر نہ تھا ۔ نظر بظاہر یہ آخری خصوصیت ہی سید صاحب کے لیے بہ طورِ خاص جذب و کشش کا باعث بنی ہوگی . . .

نواب امیر خاں لاریب بڑا بہادر اور جواں مرد تھا ، لیکن یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ کام کے بہترین مواقع حاصل ہونے کے باوجود اپنی کار دانی اور سپاہ کی کثرت سے کوئی ایسا نتیجہ پیدا نہ کر سکا جو تاریخ میں اس کے لیے دائمی عزت و عظمت کی یادگار بن سکتا ۔ اس کی ساری طاقت اور پورے اوقات صرف معمولی وقتی فوائد کے لیے وقف رہے ۔ کبھی ایک رئیس کو دبایا ، کبھی دوسرے کو جا دبوچا ۔ جس نے پیسے دے کر فوجی مدد مانگی ، اس کی اعانت یاوری کے لیے نکل پڑا . . . بعض اوقات مہینوں تک سپاہ کو تنخواہ نہ ملتی ۔ لوگ تنگ آ جاتے تو مخالفت کے ہنگامے بپا کر دیتے ۔ مجبور ہو کر نواب اٹھتا اور کسی نئے خزانے کا

دروازہ کھولنے کا عزم کر لیتا - انگریزوں کا دائرۂ اثر آہستہ آہستہ باقاعدگی کے ساتھ پھیل رہا تھا - ہندوستانی رئیس یکے بعد دیگرے ان سے مل رہے تھے - اہلِ بصیرت کو صاف نظر آ رہا تھا کہ نواب کی سرگرمیوں کے لیے فضا لحظہ بہ لحظہ تنگ ہوتی جا رہی ہے - خود نواب کے اپنے آدمیوں کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ یہ حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے ، اور بعض کی نگاہیں انگریزوں کی طرف اٹھنے لگی تھیں . . .

سید صاحب نے نواب کی آزادی عمل کو محفوظ رکھنے میں بھی کوئی دقیقۂ سعی آٹھا نہیں رکھا تھا - جب تک وہ آزاد رہا ، اس کا ساتھ نہ چھوڑا - یقیناً اس لیے نہ چھوڑا کہ اس سے کام لینے کی خوش‌گوار امید باقی رہی ہوگی - لیکن جوں ہی اس نے انگریزوں سے ربط ضبط پیدا کیا ، سید صاحب الگ ہوگیے ، اس لیے کہ جس غرض سے انھوں نے نواب کی رفاقت اختیار کی تھی ، اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی -

مہر : ''سید احمد شہید''

۲

تحریک و محرکینِ جد و جہد اور معاصر شعرا

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار
ز یک جام اند در بزمِ سخن مست

ولے با بادۂ بعضے حریفان
خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست

مشو منکر کہ در اشعارِ این قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

غالب

ذوق

سید صاحب سے ارادت :

آخر کو ، فیضِ بیعتِ دستِ سبو سے آج
پیرِ مغاں کے میں بھی مریدوں میں مل گیا[1]

[1] شاہ نصیر کا اشارہ ارادت کے اسی سلسلے کی طرف ہے جس سے کئی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ، ذوق!
نا مرد مرد ، مرد جواں مرد ہو گیا

ہے وہ مے داروے جاں ، نافعِ اعضا و حواس
کہ دلِ مردہ ہو زندہ ، تنِ بے حس حساس! ¹

قلبِ ماہیت اگر اس سے نہ بالکل ہو ، تو کیوں
قلبِ انساں میں تہور سے مبدل ہو ہراس؟

ہر حبابِ بحر کی کھل جائے گی تارا سی آنکھ
عکس افگن گر رخِ روشن تمہارا ہو گیا

ذکرِ دنیا نفسِ مردہ کو ہوا آبِ حیات
مر کے یہ سیماب زندہ پھر دوبارہ ہو گیا

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

شاعر منسلک ہوئے :

ہم ہیں مریدِ سلسلۂ عشق ، ناصحا!
دامن کشاں ہے خانۂ زنجیر کی صدا

کہتے ہیں : اس کے سلسلۂ زلف میں اسیر
دل بھی مرید اب ، صفتِ شانہ ، ہو گیا

¹ بوے جان از نفسِ پیرِ مغان می آید

شیفتہ

دی شہادت نشے کی سرخی سے چشمِ یار نے :
لو ، ہمارا خونِ پنہاں آشکارا ہوگیا[1]

میں تو آن آنکھوں کی گردش کا بلا گرداں ہوں
کچھ نہیں تیری جہاں ، گردشِ دوراں ، چلتی

چشمِ مخمور اک نظر سے چبھوے لاکھوں جونیشتر سے
تو ہو رواں رگِ جگر سے لہو ، مےِ لالہ رنگ ہو کر

نگہ نہیں ، حرفِ دل نشین تھا : دہن کی تنگی سے تنگ ہو کر
نکل کے رستے سے چشمِ فتاں کے ، دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر[2]

شاہ اسماعیل کا سراپا :

(دعوتِ جہاد کی رعایت سے)

'ابرو' :

ذبیحِ ابروے خوں ریز اک زمانہ ہوا

مبصروں سے کہو : دیکھیں چینِ ابروے یار
کہ جوہر ایسے کہاں تیغِ اصفہانی میں !

---

[1] گل بانگ کس کا مشورۂ قتل ہوگیا ؟
کچھ آج بوےخوں ہے وہاں کی ہوا کے ساتھ — مومن

[2] کشادِ شستِ اداے تو دل نشینِ من است
اگر خدنگِ تو در دل نشست ، جا دارد — غالب

'لب' :

پیوے میرا ہی لہو ، مانی ، جو لب اس شوخ کے
کھینچے تو شنگرف سے ، خونِ شہیداں چھوڑ کر !

تشنۂ دشتِ محبت کے لیے اس لب سے
کوئی دنیا میں عقیقِ یمنی خوب نہیں

'عارض' :

میں شہیدِ ناز ہوں کس آتشیں رخسار کا ؟

'چشم' :

تیرے ترکِ چشم کو گر شوقِ خوں ریزی نہ ہو
باندھ کر تلوار کیوں ، اے جنگ جو، نکلا کرے؟[1]

کرے وحشت بیاں : چشم سخن گو اس کو کہتے ہیں[2]

---

[1] 'مولانا شہید ہمیشہ سپاہیانہ وضع رکھتے تھے - گلے میں الخالک' چست پاجامہ ، سر پر پیچیدہ عمامہ اور تلوار کو حمایل کیے رہتے تھے- ''سوانحِ احمدی'' ۱۴۷

[2] شہیدِ چشمِ تو گشتم ، کہ خوش سخن گوے ست
غالب

مومن

سید صاحب سے ارادت اور ان کی تحریک سے جذباتی وابستگی :

نہ کیونکر مطلعِ دیواں ہو مطلعِ مہرِ وحدت کا
کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرع انگشتِ شہادت کا

امیرِ لشکرِ اسلام کا محکوم ہوں ، یعنی
ارادہ ہے مرا فوجِ ملایک پر حکومت کا

نہ رکھ بیگانۂ مہرِ امامِ اقتدا سنت
کہ انکار آشنائے کفر ہے اس کی امامت کا

خدایا ، لشکرِ اسلام تک پہنچا ، کہ آ پہنچا
لبوں پر دم : بلا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا

فروغِ جلوۂ توحید کو وہ برق جولاں کر
کہ خرمن پھونک دیوے ہستیِ اہلِ ضلالت کا

سپہر مرتبہ ، ممدوحِ قدسیاں ، احمد:
امیرِ لشکرِ اسلام ، امامِ پاک نہاد

گسستہ رشتۂ زنار را سلیمانی
ازاں زماں کہ کمر بستہ ای بہ عزمِ جہاد

نظارۂ تو برد تیرگی ز دل ، گویا
سرشتِ تست بہ نورِ ہدایت و ارشاد

پیامِ دہلی ویران بہ حضرتت این است
کہ اے ز مقدمِ تو ہر خرابہ نور سواد!

بیا ، و لو کرہ الکافرین ، چو بدرِ منیر
تمام ساختہ کارے کہ کردہ ای بنیاد

شوقِ بزمِ احمد و ذوقِ شہادت ہے مجھے :
جلد ، مومن ، لے پہنچ اس مہدیِ دوراں تلک

مومن ، تمھیں کچھ بھی ہو جو پاسِ ایماں
ہے معرکۂ جہاد : چل دیجیے واں
انصاف کرو ، خدا سے رکھتے ہو عزیز
وہ جاں ، جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں[1]!

جہاد پر اپنی مثنوی میں مومن نے اپنے 'عنادِ خفیہ' کی تسکین کی خاطر دمِ تیغ سے قتلِ کافر کرنے اور گردن کشوں کو پامال

---

[1] کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز ؟
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز ؟ — غالب

کرنے کی آرزو برملا ظاہر کی ہے :

ہوا مجتمع لشکر اسلام کا

امامِ زمانہ کی یاری کرو :
خدا کے لیے جاں نثاری کرو

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب !
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

'فرطِ ضعف و جوش بے تابی' :

(تحریکِ جہاد سے ہم خیالی و ہم نوای : ناتوانی کی بدولت عملی شرکت سے معذوری) ۔

سرگرمِ رقصِ تازہ ہیں قربانیوں میں ہم :
شوخی سے کس کی آے ہیں جولانیوں میں ہم'؟

('قربانیوں' کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ 'شوخی' شاہ اسماعیل کی ہے)

' میں جانتا ہوں لاش پہ آنے کا مدعا :
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

تم شوخیوں سے شعلۂ بے تاب جستہ ہو

گرمِ جولاں مرے مرقد پہ تم آتے کیوں ہو؟

داغِ جنون و سنگِ درِ یار ہو نصیب !
کرتا ہے رات دن ہوسِ تخت و تاج دل

دل قابلِ محبتِ جاناں نہیں رہا :
وہ ولولہ ، وہ جوش ، وہ طغیاں نہیں رہا[1]

ٹھنڈا ہے گرم جوشیِ افسردگی سے دل[2]
کیسا اثر ، کہ نالہ و افغاں نہیں رہا[3]

دل سختیوں سے آی طبیعت میں ناز کی :
صبر و تحملِ قلقِ جاں نہیں رہا

بے سیرِ دشت و بادیہ لگنے لگا ہے جی
اور اس خراب گھر میں کہ ویراں نہیں رہا !

---

[1] عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا :
جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا
غالب : نسخۂ بھوپال

[2] جوشِ بے کیفیتی ہے اضطراب آرا ، اسد !
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے !
غمِ افسردگی ام سوخت : کجای ، اے شوق ؟ غالب

[3] ضبطِ فغاں ، گو کہ اثر تھا ، کیا :
حوصلہ کیا کیا نہ کیا ! کیا کیا !

لذتِ جور سے دم لینے کی فرصت نہ رہی :
کیا اثر منتظرِ دعوتِ فریاد رہا ! مومن

بے تودہ تودہ خاک ، سبک دوش ہوگیے
سر پر جنونِ عشق کا احساں نہیں رہا

اپنی نا طاقتی پر تعریض :

قیامت جنوں میں ہوں نازک مزاج :
نہ کیوں نکہتِ گل سے آ جاے غش ؟

جوں شاخِ گل، اے جوشِ جنوں، زار ہوں، یعنی
جب چاک ہوا جامہ ، تو بس ٹوٹ گیے ہاتھ !

میں اپنے گریباں کے ٹکڑوں کا ہوں پیرو :
چلتے ہیں جنوں میں مرے پاؤں سے سوا ہاتھ

دستِ جنوں کے جاے صدقے ، کہ چین سے
پھیلاے ہم نے پاؤں گریباں کے چاک میں !

جوشِ وحشت ، کش مکش اس ناتواں دل گیر سے
جو نہ در تک پہنچے صحنِ خانہ[۱] زنجیر سے !

---

[۱] بے کاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل :
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں ، تو پھر کیا کرے کوی ؟

اللہ ری ناتوانی ، جب شدتِ قلق میں
بالیں سے سر اُٹھایا ، دیوار تک نہ پہنچا !

خیالِ اجل سے تسلی کروں :
یہ طاقت بھی ، جانِ حزیں ، ہو چکی !

ناتوانی مری مت پوچھ : کہوں کیا ، ہم دم؟
بات کہنے میں مرا دم ہی ہوا ہوتا ہے !

ہم سے نازک طبع سے کب اُٹھ سکے بیدادِ چرخ؟
مر گیے مضمونِ جورِ یار جو سوجھا ہمیں !

---

۱ 'غالب ایک توانا شخصیت کے مالک تھے اور مومن کے احساسات کی بنیاد ناطاقتی پر ہے ۔ یہاں تک کہ ان کی نزاکتِ خیال بھی ناطاقتی کی پیداوار ہے ،' ایک ناقد کا یہ تقابل میرے خیال میں یک طرفہ ہے ۔ توانائی اور ناطاقتی کا تناسب دونوں کے مزاج اور شاعری میں کم و بیش ایک سا ہے : دونوں نے اپنی 'نزاکت' کی پرغلو تلافی مستعار عسکری جذبے اور لب و لہجے کی بلند آہنگی سے کرنی چاہی ہے ۔ غالب نے اسے

بر خوشتین دمیدہ فسونِ دلاروی

کا عمل کہا ہے ۔

تحریک کے تقاضوں کی تاب نہ لانا :

سید صاحب کی 'توجہ' اور اس کے مضمنات کی تاب نہ لانا :

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے' :
اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے !

مومن ، یہ تاب کیا کہ تقاضاے جلوہ ہو ؟
کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر !

بے طاقتی سے مجھ میں نہیں تابِ التفات :
بیہودہ فکرِ جور و سرِ امتحاں ہے اب

قتلِ عدو نے شوقِ شہادت مٹا دیا :
لب پر ہمارے غلغلہ' الاماں ہے اب

وہ دن گیے کہ لاف و گزافِ جہاد تھا :
مومن ہلاکِ خنجرِ نازِ بتاں ہے اب

پروردۂ وفا سے ہو کب ترکِ عاشقی ؟
کیا ناز تھے کہ مجھ سے تحمل نہ ہو سکا !

مرگ ہے انتہاے عشق؛ یاں ہے ابھی ابتداے شوق

' حریفِ یک نگاہِ بے محاباے تو نہ توان شد

کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے ! — غالب

تابِ نگہِ حوصلہ فرسا نہیں رکھتے — شیفتہ

کہاں کھینچے ہے وہ، اور ہم خجالت سخت جانی سے

عاشق کشی ہے شیوہ اگر، بوالہوس سہی :
آخر کچھ اپنی جان کے دشمن تو ہم نہیں !

مومن ، بہشت و عشقِ حقیقی تمھیں نصیب !
ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں، نہ ہو !

اُمید و بیم کی کیفیت[1] :

یہ مومن کی حقیقت پسندی کا ثبوت ہے کہ انھوں نے تحریکِ جد و جہاد کے باب میں جو جذبات ظاہر کیے ہیں، وہ نرے جوش و خروش ہی سے مملو نہیں بلکہ امید و بیم سے مخلوط ہیں۔ کبھی امید ہے، کبھی بیم، کبھی ایک ہی سانس میں دو کیفیتیں ایک دوسرے میں الجھی ہوئی ہیں :

پھر کچھ صدائے پا سے دلِ مردہ جی اٹھا :
پھر جلوہ ریز کون قیامت خرام ہے ؟

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ بیم کا پہلو انھیں بھی، غالب کی طرح، مولوی فضلِ حق ہی نے سجھایا ہے۔ ان کی حوصلہ شکنی پر مومن جھنجلاتے اور پیچ و تاب کھاتے ہیں، مگر وہ یہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا :

برق آہ کو جو میں نے کہا، مسکرا دیا :
دل گرمیوں نے اس کی کلیجا جلا دیا !

ہے حرف کامیابیِ دشمن میں، ہم نشیں !
مت کہہ : درست ! وہمِ غلط کار ہے غلط

کر دیا اس جلوے نے مجنوں : چلو
خاک اڑائیں وادیِ ایمن میں ہم !

تلوار لے کے نکلا جو گھر سے وہ جنگ جو
تاثیر نے لیے مری فریاد کے قدم

کیا ٹھہرتے فوجِ غم کے مقابل فغان و آہ
جمتے نہیں ہیں لشکرِ برباد کے قدم

امیدِ مرگ پہ ہر فتنہ راحتِ جاں ہے :
شبِ فراق میں کیا بیمِ روزگار مجھے ؟

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا :
مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا

درد ہے، جاں کے عوض، ہر رگ و پے میں ساری:
چارہ گر ، ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

شوخیِ بخت تو ہے: چین لے، اے وحشتِ دل!
دیکھ زنداں ہی کوی دن میں بیاباں ہوگا

نویدِ قتل سے بھی ہو دلِ مضطر کو کیا تسکیں
کہ قدرِ نیم رقصِ مرغِ بسمل جا زمیں پر ہے ؟

ہاں، جوشِ طپش ، چھیڑ چلی جائے ، کہ پر تو
جھڑ جائیں گے ، فرسودہ اگر دام نہ ہوگا

ناکامیِ امید پہ صبر آئے تو کیا آئے ؟
ہر بات یہ کہتے ہو کہ 'یہ کام نہ ہوگا'

جفائے یار کو سونپا معاملہ اپنا :
اب آگے ہو نہ ہو ، امیدِ انفصال تو ہے

اے حشر ، جلد کر تہ و بالا جہان کو :
یوں کچھ نہ ہو ، امید تو ہے انقلاب میں

انگریز دشمنی :

انگریز دشمنی مومن کے رگ و پے میں اتنی سرایت کر چکی تھی کہ وہ ان سے کسی قسم کا سروکار رکھنے کے روادار نہ تھے :

مر جائیں گے ، پر منتِ عیسیٰ نہ کریں گے !

گو دار پہ کھینچیں ہمیں دل دارِ نصاریٰ[1]
پر آرزوئے زلفِ چلیپا نہ کریں گے

---

[1] یہ اشارہ بالخصوص مولوی فضل حق کی طرف ہے -

کہتے ہیں یہ ہم چاٹ کے خاک، اس میں ہوں گو خاک:
پر اب تو زمیں بوسِ کلیسا نہ کریں گے

بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰ
اچھا جو کریں گے بھی تو اچھا نہ کریں گے

گر حسنِ گلو سوز نے پھر آگ لگائی[1]
کیوں آبِ دمِ تیغ سے ٹھنڈا نہ کریں گے؟

منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احسان ہوں گے!

مولوی فضلِ حق جہاد کے داعیوں پر یہ الزام لگاتے تھے کہ انھیں انگریز سرکار سے رشک و حسد ہے۔ مومن کو اس الزام کے تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں:

مومن، حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا

وجہ اس حسد کی وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ 'ترسا صنم' 'نصرانیوں' میں گھر گیا ہے۔ اس مصرعے کو الگ پڑھا جائے تو

---

[1] اشارہ ہے شاہ اسماعیل کی حرارت افروز دعوتِ جد و جہاد کی طرف۔

یہ مولوی صاحب کی انگریزوں سے وابستگی[1] پر تعریض ہوی - اگر دونوں مصرعوں کو مربوط کیا جاے تو یہ معنی نکلتے ہیں کہ امیر خاں کے انگریزوں کی گرفت میں آ جانے سے جد و جہاد کا جذبہ اور بھڑک اٹھا - ایک اور شعر کا پہلا مصرع ہے :

کفر ہے بے گل رخِ ترسا تماشاے چمن

اس میں گویا مولوی فضلِ حق کا یہ خیال از راہِ طنز و تعریض ادا کیا گیا ہے کہ انگریزوں کے روے زیبا کی زیارت نہیں، بلکہ اس سعادت سے محروم ہونا 'کفر' ہے - دوسرے مصرع میں اس عقیدے کا نتیجہ بیان کیا ہے :

گلشن اپنے حق میں ، اے مومن ، کلیسا ہوگا

'حق' کا لفظ غمازی کر رہا ہے کہ روے سخن کس طرف ہے - دونوں مصرعوں کو ملا کر پڑھا جاے تو 'گل رخِ ترسا' کا مرجع شاہ اسماعیل بنتے ہیں جن کے بغیر مومن کی نظر میں دہلی ، انگریزوں کے تسلط کی بدولت ، کلیسا بن کے رہ گیی ہے -

---

[1] یہ کسرِ شان تعلق دہلی کے اہل علم و فن کو کتنا ناگوار تھا ، اس کا اندازہ غالب کے اس بیان سے ہو جاے گا :

'حکام کی بے تمیزی اور قدر ناشناسی کی بدولت فاضلِ بے نظیر مولوی فضلِ حق نے سرشتہ داریِ عدالتِ دہلی کی خدمت سے استعفا دے دیا اور خدمت کے ننگ سے چھوٹ گیے - سچ تو یہ ہے کہ اس سے ہزار درجہ بلند منصب ان کے علم و فضل کے شایان شان نہ تھا -'

بعض وقتی مصلحتوں اور مجبوریوں کے علاوہ ، پنجاب میں سکھوں کے ظلم و تعدی اور مسلمانوں کی زبون و زار حالت نے ، جو ایک خفیہ دورہ کر کے شاہ اسماعیل اپنی آنکھوں سے دیکھ آے تھے ، سید صاحب کو پہلے سکھوں سے نبرد آزمای پر مایل کیا :

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا :
گیے تھے سیرِ گل کو: دیکھنا شوخی بہانے کی!

غالب

مگر انگریزوں کے خلاف مومن کا خون آشام غیض و غضب کبھی فرو نہیں ہوا :

قتلِ عدو میں عذرِ نزاکت گراں ہے اب :
مجھ میں ستم اٹھانے کی طاقت کہاں ہے اب ؟

سجدے پہ سر قلم ہو ، دعا پر زباں کٹے
گویا نہ وہ زمیں ہے ، نہ وہ آسماں ہے اب !

سر پٹکتا ہے قلق سے مومنِ خانہ خراب :
مسجدیں رہتی نہیں : کیا فایدہ تعمیر سے ؟

مومن

اگر بہ دستِ من افتد فلک ، ز نم بر خاک [1]
چناں کہ شیشۂ مے محتسب زند بر سنگ

مپرس تا چہ کنم در قصاصِ دین ، مومن!
خدا بہ دستِ من اندازد این بتانِ فرنگ!

تا چند رہِ برہمیِ چرخ کہ بیند ؟
من خود علمِ خصم نگوں می کنم امروز

تا کے شنوم دعویِ بہروزیِ دشمن ؟
تسخیرِ مہ و خور بہ فسوں می کنم امروز

کو دست کہ یک بار زنم بر دلِ دشمن
آں دشنہ کہ صد بار زدم بر جگرِ خود ؟

پرخاش بہ دیوِ چرخ دارم :
اے شورشِ رستانہ ، بر خیز !

---

[1] اس عہد کے شاعر فرنگیوں کی نشان دہی اکثر فلک/آسماں/چرخ سے کرتے تھے :

جس دن سے زمیں پر ہے فلک ، خاک ہے اُڑتی :
دیتی تھی یہاں راہ نہ اس سبز قدم کو
ذوق بہ روایتِ آزاد

آسماں ، اور وہ انسان بناتا ہم کو ؟
خاک میں تھا مگر اس ڈھب سے ملاتا ہم کو ذوق

مومن کی ذہنی پرورش ولی اللٰہی خاندان کے زیرِ سایہ ہوی - شاہ عبدالعزیز سے ، جنھوں نے ہندوستان کو 'دار الحرب' قرار دیا، اُن کے گھرانے کو اور خود اُنھیں گہری عقیدت تھی - شاہ اسماعیل سے اُن کی ہم فکری کی دوستی تھی - ان ہی اثرات کی بدولت وہ سید صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور اُن کے سینے میں انگریزوں سے بغض و عداوت اور جنگ و جدل کا جذبہ بھڑکا - اس کا برملا اظہار اُن کے فارسی کلام میں موجود ہے :

اے پایۂ ہستیِ دو عالم !
مپسند زیانِ آفرینش

این عیسویان بہ لب رساندند
جانِ من و جانِ آفرینش

مگذار کہ پایمال گردم
ز آسیمہ سرایانِ آفرینش

مومن شدہ ہم زبانِ عرفی
از بہرِ امانِ آفرینش :

برخیز کہ شورِ کفر برخاست
اے فتنہ نشانِ آفرینش

یہ اشعار اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ مومن کی نظر میں تحریکِ جہاد کی اصل غرض و غایت انگریزی اقتدار کی بیخ کنی تھی-

شیفتہ

دعوتِ جہاد کی شورش انگیزی :

کون ہے شہر میں جو کامِ ہوس یاب نہیں ؟
کس جگہ زلف کی بو، رخ کی ترے تاب نہیں ؟

(’زلف‘ : سید صاحب ؛ ’رخ‘ : شاہ صاحب)

جان کی شکل دکھای ہے بنا کر تجھ کو :
دل کی تصویر بنای ہے : یہ سیماب نہیں

مجھ پہ اس جلوے سے جو کچھ کہ گزرتی ہے نہ پوچھ:
اس قدر شعلہ کبھی آفتِ سیماب نہیں[1]

کیا وہ صحرا کہ جہاں شور نہ ہو رہ زن کا ؟
کیا وہ دریا کہ جہاں پیچشِ گرداب نہیں ؟

فیضِ حق عام ہے : افسردہ دلِ زار نہ ہو :
دشت کیا جلوہ گہِ لالۂ شاداب نہیں ؟

ہر شیوہ اس کا اپنی جگہ پر تمام ہے :
اعجاز بات میں ہے ، تو جادو نگاہ میں

---

[1] شیوہ ہاے برقِ خاطف ، شیفتہ !
جلوہ گر ہیں اس کے شوخ اطوار سے

صیادِ دل فریب کا اللہ رے لطفِ عام!
بے زخم ایک صید نہیں صید گاہ میں

ہر خار و خس میں وجد ہے: ہر سنگ، وخشت مست:
کیا مے کشوں نے آ کے کہا خانقاہ میں ؟

پہنچے کہاں تصرفِ ساقی سے اہلِ بزم!
پہنچی نہیں شراب صراحی سے جام میں

آہو کے بخت ، آے جو تیرے کمند میں
بلبل کی قسمت ، آے اگر تیرے دام میں

شاہ صاحب کی جد و جہاد کی دعوت کا شورش فزا سوز و گداز:

پھر محرک ستم شعاری ہے
پھر انھیں جستجو ہماری ہے

پھر وہاں طرزِ دل نوازی ہے
پھر یہاں رسمِ جاں نثاری ہے

پھر خیالِ نگاہِ کافر ہے
پھر تمنائے زخمِ کاری ہے

پھر وہی داغ و دل ہے صحبت گرم
پھر وہی چشم و شعلہ باری ہے[1]

---

[1] برق آنکھوں سے ٹپکتی ہے: یہ خوں ناب نہیں

پھر وہی جوشِ نالہ و فریاد
پھر وہی شورِ آہ و زاری ہے[۱]

اُس ناوک کی توجہ پہ مری جان نثار !
ہاتھ سے چھوٹتے ہی قصد جگر کرتا ہے

جان کھوئی ہو جسے مدِ نظر ، مثلِ حباب
وہی مشتاقِ فنا چشم کو تر کرتا ہے

دی کس نے اشکِ سرمہ سے تیغِ مژہ کو آب؟
شورِ فغاں کو فکرِ خراشِ گلو نہیں[۲]

ہے وہ آتش جلوہ اشک افشاں ہمارے شور سے:
شمع رو دیتی ہے پروانے کو جلتا دیکھ کر

---

[۱] ''اس وقت بھی پچاسوں آدمی (شاہ صاحب کا) وعظ سننے والے شہر میں موجود ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ جب آپ کا وعظ گرم ہوتا تھا تو سامعین میں نالہ و زاری سے شور ہو جاتا تھا اور روتے روتے ہچکیاں بندھ کر (لوگ) بے خود ہو جاتے تھے ۔'

''سوانحِ احمدی''

[۲] کرے ہے قتل لگاوٹ سے تیرا رو دینا
تری طرح کوی تیغِ نگاہ کو آب تو دے !

غالب

نیرنگِ عشق کے کیا کیا ظہور ہیں:
بسمل کو اضطراب ہے: قاتل کو اضطراب!

شیفتہ کی بعض ترکیبیں:

علتِ درماندگی، مرضِ یاس، خجلتِ تاثیر، دل و دماغِ آرزو، تحریکِ بالِ جنبانی، صلاح و فسادِ جہاں، صوتِ جاں نواز، نالۂ آتش فشاں، دمِ شعلہ زا، اجلِ جاں فزا، مشقِ فنا، رسمِ جاں نثاری، تمنائے زخمِ کاری، فوزِ عظیم، اہلِ شوق، اصحابِ درد، اہلِ طریق، اہلِ تحقیق، حسنِ جہاں سوز، چشمِ ستیزہ جو، سرمۂ تسخیر، نگہِ جاں ستاں، چشمِ افسوں ساز، طلسمِ ہوش ربا، فسونِ اثر ریز۔

آتش

سید صاحب کے کمالات کا اعتراف:

دکھلایا بے نقاب جسے، بندہ ہو گیا:
وہ روئے سادہ نقش ہے صاحب کمال کا

کون سا اس میں تکلف نہیں پاتے، ہر چند
نہ مرصع، نہ مذہب، نہ مطلا ہے وہ رُخ

سامری چشمِ فسوں گر کی فسوں سازی سے
لبِ جاں بخش کے ہونے سے مسیحا ہے وہ رُخ

بس کہ تھی اُس سے عیاں سینۂ عارف کی صفا :
چہرۂ یار کو میں نے دلِ روشن سمجھا

(کیا جگہ کوچۂ محبوب ہے ، اللہ اللہ!
کوی کعبہ ، کوی جنت ، کوی گلشن سمجھا)

تصور ہر نفس ہے پیشِ چشم اس روے روشن کا :
نگہ باں برق کو میں نے کیا ہے اپنے خرمن کا

کوچۂ گیسو سے کس دل بر کی آی تھی نسیم؟
بوے سنبل سے دماغِ جاں معطر ہوگیا

سید صاحب اور اُن کا حلقۂ مجاہدین :

تری درگاہ کا اللہ رے جلال ، اے شہِ حسن !
عرش پر ہم نے دماغ اس کے گدا کا دیکھا

سیرِ بت خانے کی جب تک کہ نہ کی تھی ہم نے
کارخانہ ہی نہ تھا شانِ خدا کا دیکھا

کوے قاتل کا تماشا اسے دکھلا ، آتش!
گرم جس نے نہ ہو بازار فنا کا دیکھا

گرد رہتے ہیں ستارے رات بھر پروانہ وار :
ماہِ تاباں کون سے دروازے کی قندیل ہے ؟

جلوۂ قربانیانِ عشق کس دن واں نہیں ؟
روز اس یوسف کے کو میں عیدِ اسماعیل ہے

کون تجھ سا بادشاہِ حسن ہے آج ، اے صنم ؟
کس کے کوچے میں فقیروں کے ہیں بستر سینکڑوں؟

فقر کے کوچے میں قدرِ دولتِ دنیا نہیں :
ٹھوکریں کھاتے ہیں یاں پارس کے پتھر سینکڑوں

اس نشانِ قد کے ہوں گے مردِ میداں شیفتہ
جاں نثاری پر کمر باندھیں گے لشکر سینکڑوں

صدقے اس شاہیں کے ہوتے ہیں کبوتر سینکڑوں

گلشنِ حسن سے بہتر کوئی گلزار نہیں :
سنبل اس طرح کا پر پیچ و شکن ہے کس کا ؟

سنبل و ریحانِ باغِ حسن کا عالم نہ پوچھ:
خط سا پیرو[1]، گیسوؤں سا پیشوا ہوتا نہیں

ہے ہر اک دندانِ دہانِ یار میں درِ یتیم:
ان لبِ لعلیں سا لعلِ بے بہا[2] ہوتا نہیں

ساقیا، تعریف تیرے مے کدے کی کیا کروں؟
ساتھ کیفیت کے تھا لبریز، جو پیمانہ تھا

بس کہ رکھتا تھا ہر اک ان میں سے ہیرے کی چمک:
جوہروں سے خنجرِ قاتل جواہر خانہ تھا

لعلِ لب دونوں[3] تھے، اے محبوب، لعلِ شب چراغ:
دانت تھا جو تیرے منہ میں، گوہرِ یک دانہ تھا

دفترِ عشق بھی کیا دفترِ خوش طالع ہے!
نظری فرد نہیں اس میں کوئی، صاد ہیں سب

مکتبِ عشق میں جو ہے، سو فلاطون حکمت
کوی شاگرد کسی کا نہیں: استاد ہیں سب

---

[1] مولوی عبدالحی
[2] شاہ اسماعیل
[3] مولوی عبدالحی اور شاہ اسماعیل

صاف آینے سے ہیں ، تیغ سے خوں ریز یہ لوگ
ان حسینوں میں غرض صاحبِ فولاد ہیں سب

شاہ صاحب :

لالۂ بے داغ تجھ سا کوی گلشن میں نہیں :
ایک بت اس حسن کا دیرِ برہمن میں نہیں

ممکن نہیں ہے دوسرا تجھ سا ہزار میں :
ہوتا ہے اک بہشت کا دانہ انار میں

سید صاحب کے عملِ توجہ کا تاثر :

توجہ میں ترے ، اے یار ، اثر ہے مومیای کا

توجہ سے دلِ درویش کو خرسند کرتے ہیں

کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے :
جس طرف دیکھا ، مقامِ ھو نظر آیا مجھے

سامنے جو پڑ گیا ، دیوانۂ بے باک تھا :
پھاڑ کر آنکھیں جسے دیکھا، گریباں چاک تھا

(یوں تو تیرے تیر کے نخچیر تھے سب خوش نصیب
وہ بلند اقبال تھا جو بستۂ فتراک تھا[1])

دکھلا کے جلوہ آنکھوں نے اک شمعِ نور کا
گل کر دیا چراغ ہمارے شعور کا

ساقی کی نگہوں نے مرے ہوش اڑائے
آنکھوں سے دیا جام مۓ بے خبری کا

(اک کانِ ملاحت کے ہیں پامالوں میں ہم بھی
چکھا ہے مزا ہم نے بھی شوریدہ سری کا)

سامنے جو پڑ گیا ، ہوش اڑ گیے ، بے خود ہوا :
جامِ چشمِ یار بے ہوشی کا ساغر ہو گیا

دیدارِ یار برقِ تجلی سے کم نہیں :
بند آنکھیں ہوں گی : دیں گی دعائیں بصارتیں
(ہوتی ہیں تیرے نقشِ قدم کی زیارتیں)

---

[1] بالخصوص شاہ اسماعیل

ان میں سے بعض تاثرات میں ایک تعریضی رنگ بھی جھلکتا ہے - ایک جگہ تو توجہ کے عمل کو اسی بے اعتقادی سے دیکھا گیا ہے جس سے مولوی فضلِ حق ، سید صاحب اور شاہ صاحب کی ساری کرامات کو دیکھتے تھے :

گردشِ چشمِ بتاں سے نہ ہو کیونکر دل غش ؟
ٹھگ مسافر کو ، یقیں ہے یہ کہ ، بے ہوش کرے

سید صاحب کا جذبۂ جد و جہاد :

دگر گوں رنگ رہتا ہے مرا شوقِ شہادت میں :
گراں ہے دوش پر گردن ، تو بھاری سر ہے گردن پر

اب قدم سے ہے مرے خانۂ ز بخیر آباد ؛
مجھے وحشت نے کیا سلسلہ جنباں پیدا

غمِ عالم ہے شکارِ دلِ شوریدہ مزاج :
میں نے پہلو میں کیا شیرِ نیستاں پیدا

(یہ 'شیرِ نیستاں' سید صاحب کے دستِ راست ، شاہ اسماعیل ہیں)

کوہِ غم ، مثلِ پرِ کاہ ، اٹھا لیتا ہوں :
ناتوانی میں بھی عالم ہے توانای کا

برق رفتار ہوں : منزل ہے مرے زیرِ قدم
ابر گھیرے مجھے ہر چند ، کہ باراں روکے

مری آوازِ پا سن کر ، فنا ہو جان موذی کی :
وہ رہ رو ہوں کمر باندھی ہے جس نے خونِ رہ زن پر

پھر گیے ہیں معرکے میں مجھ سے تلواروں کے منہ :
سخت جانی نے مری توڑے ہیں خنجر سیکڑوں

سید صاحب کی صحرا نوردی :

چار دن موسمِ گل میں تو رہوں دشت نورد :
راہ ٹھوکی نہ کرے ، مجھ کو نہ زنداں روکے

ایک جا ، مثلِ درِ غلطاں ، کہیں ٹھہرا نہ پاؤں :
اخترِ اقبال ہوں میں گردشِ ایام کا

ٹھہرے نہ پھر جو راہ میں تیری نکل چلے :
شل ہو گیے جو پاؤں ، تو ہم سر کے بل چلے

وحشت نے مجھے جب کہ گلستاں سے نکالا
غیرت نے قدم پھر نہ بیاباں سے نکالا

وحشی تھے، بوے گل کی طرح سے، جہاں میں ہم:
نکلے تو پھر کے آے نہ اپنے مکاں میں ہم

سید صاحب کی آواز :

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا :
شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تری آواز کا

زنجیر میں ہماری صدا ہے فقیر کی

پردے سے جس آواز کا شبہ ہوتا ہے ، وہ سید صاحب کی آواز ہے ، اور جس فقیر کی صدا زنجیر سے نکلتی ہے ، وہ بھی سید صاحب ہی ہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آتش نے سید صاحب کی باتیں خود ان کی زبان سے سن کر ان ہی کی زبان میں دہرا دی ہیں - یہ بول چال کی ایسی زبان ہے جسے تراش خراش ، تکلف و تصنع ، پیچ و خم سے دور کا بھی واسطہ نہیں ، محض سیدھے سادے طریقے سے مطلب ادا کرنے سے سروکار ہے - سید صاحب اہلِ قلم کو بھی ایسی ہی زبان استعمال کرنے کی تاکید کرتے تھے :

بس عبارت ہو چکی : مطلب پہ آیا چاہیے

یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ جہاں کسی شاعر نے فرطِ ارادت سے اس تاکید کی پوری پابندی کی ، وہاں اس کی شاعری

کا خاتمہ بالخیر ہو گیا ۔

سید صاحب کے خاہدانہ مزاج کی ترجمانی آتش نے کم و بیش ان ہی کے لب و لہجے میں کی ہے :

فقیر ہو کے قدم مار اس میں ، اے آتش!
طریقِ احمدِ مرسل سی شاہ راہ نہیں

اظہارِ فقیری نہیں بہتر کفنی سے

آفت ہے کوی ذکرِ فقیرانہ ہمارا :
اک نعرۂ ھو میں دو جہاں زیر و زبر ہے !

آتش ، خدا نے چاہا تو دریاے عشق میں
کودے جو اب کی ہم تو ورے سے پرے ہوے

نہا کر معرکے میں ، آتش ، آبِ تیغِ قاتل سے
خدا چاہے تو پاک اس زندگی کا گند کرتے ہیں

سودا ہے راہِ یار کا : اللہ رے اثر !
جادہ بنی جو ہم نے زمیں پر لکیر کی

بنایا جادۂ رہ مجھ کو خاکساری نے :
پھرا جو مجھ سے زمانے میں ، وہ خراب ہوا

اللہ ہے مشکل میں مدد گار ہمارا :
اعوان سے ، انصار سے کیا کام ہے ہم کو؟

خدا حافظ ہے اپنے بندۂ عاجز کا مشکل میں :
نہ واں کھٹکا ہے کچھ ہم کو ، نہ کچھ ہم کو ہے یاں کھٹکا

کٹڑاپن آگے مردانِ خدا کے چل نہیں سکتا

حذر عالی مقاموں کو ہے لازم خاکساروں سے :
پیادے غالب آئے ہیں سوارِ پشتِ توسن پر

چل ، دلا ، وقت ہے سینے کے سپر کرنے کا

نہیں کھلتا ہے بے میدان کے جوہر سپاہی کا

امتحاں مرد کا ہے جنگ و جدل میں ہوتا

مردِ میداں کی حرارت ہے شجاعت کی دلیل

زیادہ زخم سے انسان کو احساں اٹھانا ہے

مرد کے چہرے کا زیور زخم ہے شمشیر کا

چہرۂ نامرد زخمِ تیغ کے قابل نہیں

پیچھے نہ پاؤں معرکۂ عشق میں ہٹے

کاٹ کر کوچے قدم رکھ سرزمینِ عشق پر :
کھیت ہاتھ اس کے ہے بھاگا جو نہ میداں چھوڑ کر

وحی آنا جانتا ہوں موت کے پیغام کا

نقصانِ جاں بھی راہِ خدا میں مفید ہے :
مارا گیا جہاد میں جو ، وہ شہید ہے

کی جان کھو کے ہم نے فراغت جہاد سے

آتش کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن سے سید صاحب کے

جذبے یا زبان یا دونوں پر تعریض کا گماں گزرتا ہے :

ہوگیا شوقِ شہادت سے حلال اپنا دل

زندۂ جاوید ہیں قربانیانِ تیغِ عشق :
سر کا کٹنا جانتے ہیں پھوٹنا نکسیر کا

پیادہ پا ہوں رواں سوئے کوچۂ قاتل :
اجل مری مرے سر پر سوار راہ میں ہے

کوشش میں راہِ عشق کی باز آئیں گے نہ ہم
ہر چند سوچ سوچ کے ہوں لاکھ من کے پاؤں

دم فنا کیجیے اپنا نفسِ سرد کے ساتھ :
ٹھنڈے ٹھنڈے طرفِ گورِ غریباں چلیے !

زلف کے سودے میں اک عمر بسر کی ، آتش !
بس بہت دیکھ چکے خوابِ پریشاں : چلیے !

سر کاٹ کے کر دیجیے قاتل کے حوالے
ہمت مری کہتی ہے کہ احسان بلا لے !

زلف کے سودے میں اپنے سر کو پھوڑا چاہیے :
جس بلا کا سامنا ہو ، منہ نہ موڑا چاہیے

ٹکرائے جو سر کو تو کہسار توڑ دے !

جوشِ جنوں میں دیکھیے پیچھے نہ مڑ کے پھر
منہ جس طرف کو ، صورتِ دریا ، اٹھائیے

حسد سے جل کے دبے پاؤں اڑ گیے اغیار
ہمارے نالوں نے جس وقت کارِ برق و باد کیا !

ہم دولتِ دیں ہے اسے ، ہم لذتِ دنیا :
وہ نقد ہے دل جس میں ہے گنجِ دو جہاں بند

رہے انسان شب بیدار دنیا کے خزانے میں

بگولے کی طرح ، کس کس خوشی سے خاک اڑاتا ہوں
تلاشِ گنج میں جب سامنے ویرانہ آتا ہے !

جنونِ عشق میں دیوانہ وار پھرتا ہوں :
خبر گڑھے کی نہیں ہے ، کنواں نہیں معلوم

کسی کے سر میں ہو درد ، منہ مرا جھٹکا :
کسی کے پاؤں میں موچ آئی ، میں نے سر پٹکا

نہ تو بھوکے ہوئے تھے ، نہ تو پیاسے پیدا
ہوگیے روگ یہ دنیا کی ہوا سے پیدا

آتش کا ادعاے 'شوقِ شہادت' اور اس کا محرک :

تجھے ، اے ترک ، زیبا دعویِ صاحب قرانی ہے :
مگر خنجر ترا لوحِ طلسمِ زندگانی ہے

دمِ شمشیر کی موجِ نفس میں یاں روانی ہے :
سخن پرداز کی دولت سے یہ معجز زبانی ہے

نعرہ زن گنجِ شہیداں میں ہوں ، بلبل کی طرح :
آبِ آہن نے کیا ہے یہ گلستاں پیدا

آرزو مندِ شہادت ہوں : ارادہ ہے یہی
بھیک مانگوں زخم ، اے قاتل ، تری تلوار سے

یہ سوداے شہادت ہے ہمارے سر کو ، اے قاتل !
تری تلوار کا دم بھرتی ہے جو رگ ہے گردن میں

بھری ہے دل میں ز بس آرزو شہادت کی :
تڑپ گیا میں جو تلوار آب دار ہوی

حسنِ بے پردہ کا عالم جلوہ گر پاتا ہوں میں :
دم پھڑک جاتا ہے عریاں دیکھ کر تلوار کو

دل میں قاتل کے، مرے شوقِ شہادت کا ہے نقش:
سرنگوں پایا مجھے ، جب کھینچ کر خنجر اٹھا[1]

نیم جاں دل ہے طلب گرِ سلوکِ شمشیر

مقصودِ دل ہے قلزمِ خوں میں شناوری :
جس گھاٹ چاہے یار کی تلوار لے چلے

آتش کی بعض ترکیبیں

شعور :

کنہِ حقیقت ، چشمِ بینا ، دلِ آگہ ، دیدۂ بینا، دلِ روشن ، جوہرِ ادراک ، جوہرِ فرد ، جوہرِ انساں ، جوہرِ حکمت ،

---

[1] شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو :
جہاں تلوار کو دیکھا ، جھکا دیتا تھا گردن کو
غالب

جوہرِ جامِ جہاں نما ، عالم تمثال ، سیرِ برون و درون ، سیرِ جہانِ رنگ رنگ ، سیرِ نیرنگِ جہاں ، نقش بندِ خزاں و نقش بندِ بہار ، بلند و پستِ عالم ، دستِ خشک و پاے شل ، قفسِ آہنیں ، زنجیرِ زنداں ، برقِ خرمن ، برقِ نالہ ، انقلابِ روزگار ، جرسِ کارواں ، بانگِ درا ، شاعرِ حال گو

حسن :

شاہ بازِ حسن ، شاہدِ حسن ، حسنِ پر آشوب ، حسنِ دل آزار

ترک :

ترکِ حسنِ یار ، ترکِ شہ سوار ، ترکِ خوں خوار

عشق :

مذہبِ عشق ، ایمانِ عشق ، مردانِ عشق ، جہادِ عشق ، نبردِ عشق ، معرکۂ عشق ، صید گہِ عشق ، کمندِ عشق ، بیشۂ عشق ، گرم روِ بادیۂ عشق ، دیوانگانِ عشق ، قربانیانِ عشق ، آتشِ عشق ، غیرتِ عشق ، رندانِ عشق

مرد :

مردانِ خدا ، مردِ مومن ، مردانِ عشق ، مردِ نبرد ، مردِ میداں ، غیرتِ مردانہ ، مردِ درویش ، مردِ فقیر ، مردِ شہید

منزل :

منزلِ فقر و فنا

معرکہ :

معرکۂ عشق ، معرکۂ کارزار

قیامت :

فتنۂ صحرائے قیامت ، انجمن آرائے قیامت

شہادت :

آرزو مندِ شہادت ، شوقِ شہادت، طلب گارِ سلوکِ شمشیر، شہیدانِ محبت ،گنجِ شہیداں

ناسخ

ناسخ کا کلام ایک بارِ خاطر فرض سمجھ کر اول سے آخر تک کھنگالا تو اس میں سے بھی ، توقع کے خلاف ، اسی قسم کے خیالات و جذبات دبے ہوئے نکلے جن کی رو سے ، اپنے ہم عصر شاعروں کی طرح ، وہ بھی سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے ارادت مندوں اور اُن کی تحریک کے نقیبوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں - ان کے پہلے دیوان کی پہلی غزل کے دو شعر یہ ہیں :

کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی آنکھوں میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا

یہ 'خورشید رو' سید صاحب اور 'شوخِ فتنہ انگیز' شاہ صاحب ہی ہیں جو عالمِ زوال میں نمودار ہوئے تو گویا

سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے

سید صاحب اور ان کے حلقے سے ارادت :

حشر میں ، ناسخ ، یہی اپنا کہوں گا سلسلہ :
میں اسیرِ حلقۂ گیسوے سید زادہ ہوں

جہاں بینی اور اس کا مخرج :

عالم تمام ایک بدن ہے : میں دیدہ ہوں

ہمتِ ساقی سے ایسی وسعتِ مشرب ملی
مثلِ جم ، بحرِ جہاں گویا ہے اپنے جام میں

تماشاے جہاں ہم دیکھتے ہیں کنجِ عزلت میں:
ہمارے بوریے کا نقش خط ہے ساغرِ جم کا

داغِ دل چمکا خیالِ عارضِ پر نور سے :
ہو گیا روشن چراغ اپنا چراغِ طور سے

اس روئے آتشیں نے دیا ہے یہ داغِ دل :
روشن ہوا چراغ مرا آفتاب سے

تصور بندھ گیا ایسا خطِ رخسارِ قاتل کا
کہ جوہر بن گیا گویا مرے آئینہ ٔ دل کا

نور افشاں دل میں ہے جب سے خیال اس ماہ کا
طور کا شعلہ دھواں ہے میری شمعِ آہ کا

ہے دلِ سوزاں کا طور اس کی تجلی گاہ کا
روئے آتش ناک ہے ہر شعلہ میری آہ کا

سید صاحب اور ان کا پر نور حلقہ :

جس شعلہ رو کو دیکھیے ، عالم ہے نور کا :
ٹیلا ہمارے شہر میں ہے نام طور کا

اپنی برقِ نگاہ سے تم نے
شجرِ طور کر دیا ہم کو

رشکِ نخلِ وادیِ ایمن ہے ہر برگِ گیاہ :
سنگ ریزے طور ہیں اس کی تجلی گاہ میں
(کون لیلیٰ ہے جنوں انگیز اس خرگاہ میں؟)

اے سہی سرو ، ترے کان کے پتوں کی طرح
برگ ہائے شجرِ طور میں تنویر نہیں

چاند کی طرح ہے خرمن میں وہ دہقاں زادہ :
کیوں نہ ہر خوشے میں ہو نور عیاں پرویں کا ؟

عاشق نہیں ہے کون درِ گوشِ یار کا ؟
عالم ہے غرق ایک ہی موتی کی آب میں

مرے محبوب کے گردے میں جو دانا و ناداں ہے
زمانہ اس کا ہالہ ہے، وہ اس کا ماہِ تاباں ہے

ہو گیا وہ مصر ، ہے جس شہر میں تصویرِ یار :
جس کنویں میں اس نے جھانکا ، ماہِ کنعاں ہو گیا

روزِ تاریک پھر ہوا روشن :
پھر ہر اک ذرہ آفتاب ہوا

وہ آفتاب ہے ہر تو فگن : عجب کیا ہے
ہمارے سنگِ لحد سے ہو لعل گر پیدا

(کہ جیسے ہو شبِ تاریک سے سحر پیدا)

۳

تحریک سے اثراندوزی کے بعض مشترک شعری اشارے

'جلوہ' :

عیارِ جلوۂ نازش گرفتن ارزانی !

جلوہ فرمای و جاوید نہ مانی بہ کسے :
سیمیای و بہشتِ عملی را مانی

جز بہ چشم و دلِ والا گہران جانہ کنی :
جلوۂ نقشِ کفِ پاے علی را مانی

بہ خاطرے کہ در آی بہ جلوہ فرمای
بلاے ظلمتِ مرگ از روان بگردانی

خوش است دعویِ آرایشِ سرودستار
ز جلوۂ کفِ پاے کہ نقشِ پادارد !

چمن از حسرتیانِ اثرِ جلوۂ تست

رہ گزارت را دل و جان ہم چنان فرش است ؟ ہان !
جلوہ گاہت را ز جان بازان ہہان غوغاست ؟ ہست !

بہ ہر جا می خرامی ، جلوہ ات در ماست ، پنداری
دل از آینہداری ہائے شوقت دیدہ را ماند

کتانِ ہوش را ہے جلوۂ گل ماہ تابستے

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ ، اسد !

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کے
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

جلوہ در طالعِ خاشاکِ من افتاد زبون :
شد غلط جادۂ گلخن : بہ گلستاں رفتم

دادی صلائے جلوہ ، و غالب کنارہ کرد :
کوبخشِ آن گدا کہ ز غوغا نفور بود ؟

دارم بہ کنجِ غم کدہ رشکِ کسے ، کہ او
در جلوہگاہِ دوست بہ غوغا شود ہلاک

دارم بہ ذوقِ جلوۂ حسن برشتہ اے
نقشے کشیدن ، و بہ تمنا گریستن
غالب

مومن ، یہ تاب کیا کہ تقاضاے جلوہ ہو ؟
کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر !

آتی نہیں بلاے شبِ غم نگاہ میں
کس مہروش کا جلوہ نظر میں سما گیا ؟

کر دیا اس جلوے نے مجنوں : چلو
خاک اڑائیں وادیِ ایمن میں ہم !
مومن

مجھ پہ اس جلوے سے جز کچھ کہ گزرتی ہے ، نہ پوچھ :
اس قدر شعلہ کبھی آفتِ سیماب نہیں !

(کیا وہ صحرا ، کہ جہاں شور نہ ہو رہ زن کا ؟
کیا وہ دریا کا جہاں پیچشِ گرداب نہیں ؟)

صحرا بنا رہا ہے وہ ، افسوس ، شہر کو
صحرا کو جس کے جلوے نے گلشن بنا دیا

'شوخ' :

جن شاعروں نے داعیانِ جہاد کو اپنا مرجعِ سخن بنایا ہے، انھوں نے اکثر 'شوخ' کی صفت شاہ اسماعیل سے منسوب کی ہے۔[1]

پیوے میرا ہی لہو، مانی، جو لب اس شوخ کے
کھینچے تو شنگرف سے، خونِ شہیداں چھوڑ کر

('لب'، شاہ صاحب کی ہیجان انگیز خطابت کے لحاظ سے)
ذوق

سرگرمِ رقصِ تازہ ہیں قربانیوں میں ہم:
شوخی سے کس کی آئے ہیں جولانیوں میں ہم؟

تم شوخیوں سے شعلۂ بے تاب جستہ ہو

آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

دیکھا نگاہِ ناز سے کس شوخ چشم نے؟
پھر مضطرب نظر کو جہاں نیم گام ہے

مومن

---

[1] 'مولانا اسماعیل بچپن میں بہت شوخ اور تیز طبیعت تھے' (۱۰۰)
'مولانا اسماعیل صاحب کی عادت ہنسی مذاق کی بہت تھی' (۸۰)
'مولانا شہید ابتدا میں بہت آزاد تھے۔ کوی میلہ، خواہ ہندوؤں کا ہو یا مسلمانوں کا، ایسا نہ ہوتا تھا جس میں وہ شریک نہ ہوتے ہوں، اور کھیل بھی ہر قسم کے کھیلتے تھے: کنکوا بھی اڑاتے تھے، شطرنج بھی کھیلتے تھے' (۱)
''ارواحِ ثلثہ'' تیسرا ایڈیشن

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی آنکھوں میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا

ناسخ

شوخیِ خوے ترا قاعدہ دان است بہار:
خوبیِ روے ترا آینہ‌دار است بہار

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا:
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تندخو کیا ہے

غالب

شیوہ ہاے برقِ خاطف، شیفتہ!
جلوہ گر ہیں اس کے شوخ اطوار سے

(اسی 'شوخ' کی دل آویز شخصیت کا عام تاثر شیفتہ نے ایک اور شعر میں بیان کیا ہے:

کچھ ہم پر، آپ پر نہیں موقوف، شیفتہ!
کس کس کے دل پذیر وہ رعنا جواں نہیں؟

(یہی 'رعنا جوان' غالب کی 'رعنایِ خیال' کا ایک محرک تھا)۔

'بہار':

بہار از رنگ و بو در پیش گاہِ جلوۂ نازش
گدایانِ نثار از رہ‌گزر بر چیدہ را ماند

(ز سرگرمی نگہ صیادِ آہو دیدہ را ماند)

بہار آید بہ حیرت گاہِ نازش
ز بوے گل نفس بر رہ فشانان

(گزشت از دل ، ولے نگزشت ازدل
خدنگِ غمزۂ زورین کمانان)

پیمانۂ رنگ است درین بزم بہ گردش :
ہستی ہمہ طوفانِ بہار است، وخزان ہیچ

(تحریک کی بے سروسامانی کا پہلو بھی غالب سے پوشیدہ نہیں :

اے حسن ،گر از راست نہ رنجی ، سخنے ہست :
ناز این ہمہ، یعنی چہ؟ کمر ہیچ و دہان ہیچ!)

سامانِ حرب کا ذکر ایک اور شعر میں دوسرے پہلو سے آیا ہے :

با نو بہار این ہمہ سامانِ ناز نیست :
فہرستِ کارخانۂ یغمائے کیستی ؟

'نو بہار' سے اشارہ انگریزوں کی ابھرتی ہوئی قوت سے معلوم ہوتا ہے جس نے یہ سازوسامان امیر خاں کے لشکر کی برہمی کی بدولت حاصل کیا ۔

غالب نے ایک پوری غزل میں سید صاحب ، شاہ صاحب اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں اپنے بعض پیچیدہ تاثرات ادا کرنے کے لیے 'بہار' کے کلیدی نشان سے کام لیا ہے :

مژدہ ، اے ذوقِ خرابی ، کہ بہار است ، بہار !
خرد آشوب تر از جلوۂ یار است بہار

چہ جنون تازِ ہوائے گل و خاراست بہار
کاین چنین قطرہ زن از ابرِ بہاراست بہار ؟

وحشتے می دمد از گردِ پرافشانیِ رنگ :
از دمین گاہِ کہ رم خوردہ شکار است بہار ؟

نازم آئین کرم را ، کہ بہ سر گرمیِ خویش
دشت را شمع ، و چراغِ شبِ تار است بہار

شوخیِ خوے ترا قاعدہ دان است خزان :
خوبیِ روے ترا آینہ دار است بہار

درغمت غازۂ رخسارۂ ہوش است جنون :
در رہت شانۂ گیسوے غبار است بہار

ہم حریفانِ ترا طرفِ بساط است چمن :
ہم شہیدانِ ترا شمعِ مزار است بہار

خارہا در رہِ سودا زدگان خواہد ریخت
ورنہ در کوہ و بیابان بہ چہ کار است بہار ؟

سنبل و گل اگر از گلشنیان است ، چہ غم ؟
بہرِ ما گلخنیاں دود و شرار است بہار

دعوتِ جد و جہاد کی حرارت آفرینی : ناکامی کی پژمردگی

باد دامن زد برآتش ، نو بہار ان خواندمش :
داغ گشت آن شعلہ از مستی ، خزان نامیدمش

بود در پہلو بہ تمکینے ، کہ دل می گفتمش :
رفت از شوخی بہ آینے ، کہ جان نامیدمش

دوسرے شعر کے دل و جان شاہ صاحب ہیں -

غالب

پھر بہار آی : وہی دشت نوردی ہوگی :
پھر وہی پاؤں ، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

رنگِ رفتہ سے مرے کیا رنگ لاتی ہے بہار !

غنچہ ہاے آرزوے موسن اب کھلنے کو ہیں :
خیر مقدم ! گلشنِ ایماں میں آتی ہے بہار

خاک میں وہ تپش نہیں : خار میں وہ خلش نہیں
کیوں نہ ہمیں زیادہ ہو جوشِ جنوں بہار میں ؟

مومن

سید صاحب اور ان کے جاں نثار رفیق :

گل گونِ یار چال ہے چلتا بہار کی :
گل ہائے باغ رہتے ہیں اس کے رکاب میں

(جانِ عزیز کرتے ہیں تم پر نثار ہم :
دل کس شمار میں ہے ! جگر کس حساب میں !)

('دل و جگر' شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی ، شاہ عبدالعزیز کے چشم و چراغ)

سید صاحب کی تحریک کا اثر :

کیے جس بزم میں ، روشن چراغِ حسن سے کردی :
بہارِ تازہ آئی ، تم اگر گلزار میں آئے

(ہزاروں عطر کھینچ کر طبلہ' عطار میں آئے)

بہار آئی ہے : لطف و کرم نے ساقی کے
کیا ہے دردکشوں کو زلال سے واقف[1]

---

[1] (روشنیِ دل سمجھتے ہیں زلالِ بادہ کو)

تحریک کی بدولت انحطاط و زوال کا احساس :
کیے بہار نے ظاہر خزاں کے پنہاں چاک

ناگفتنی ہے حالِ بہار و خزانِ باغ :
اک زخم ہے ، کہ خشک ہوا اور نم ہوا

بہارِ رنگِ گل برگِ خزانی یاد کرتے ہیں :
جرس کی طرح سے ، واماندگاں فریاد کرتے ہیں

خزاں میں بہار :

فصلِ بہار آ کے خزاں بارہا ہوی
انگور میں ہنوز بہارے شراب ہے

بوے بہار آتی ہماری خزاں سے ہے

رخسارِ یار پر مرے ، بہتے ہیں اشکِ خوں :
یک جا دکھا رہی ہے خزاں و بہار رنگ

بہار آی : چھکا ، ساقی ، شرابِ روح پرور سے
خزاں کا غم بھلا دے بادۂ گل گوں کے ساغر سے

خزاں چمن سے ہے جاتی : بہار راہ میں ہے
(گدا نواز کوی شہ سوار راہ میں ہے)

رنگیں رہے گا خونِ شہیداں سے کوے دوست :
فردوس کی بہار کو بیم خزاں نہیں

'بادِ بہار' :

عجب محبوبِ باشوکت ہے ، اے بادِ بہاری ، تو

آتشِ گل سے کیا ہے مری طینت کا خمیر :
دامن باد بہاری مجھے بھڑکاتا ہے

چمن کا عالم آتا ہے نظر گنج شہیداں میں
قدم بادِ بہاری ہے مرے قاتل کے توسن کا

'ابرِ بہار' :

فیض سے ابرِ بہاری کے ہوے گلزار سبز

'گل' :

(مجاہد) چاک پیراہن ہر اک گل کا بعینہ زخم ہے :
کھیت ہے تلوار کا ، یا رب ، کہ میدانِ بہار ؟

پھر گل شگفتہ ہوتے ہیں ، لیتے ہیں انتقام
غافل نہیں بہار خزاں کے غنیم سے

قید رکھتے موسمِ گل کی نہیں
ولولے تیرے گریباں چاک کے

وہ گریباں آگ میں رکھ دیجیے
موسمِ گل میں جو ہوں بے چاک کے

موسمِ گل :

چار دن موسمِ گل میں تو رہوں دشت نورد
راہ کھوٹی نہ کرے ؛ مجھ کو نہ زنداں روکے!

بہارِ گل :

بہار گل میں جو دل کو ہوائے صحرا ہے
ہوا ہے روح کو قالب میں اپنے زنداں تنگ

بہارِ رنگِ گل برگِ خزانی یاد کرتے ہیں
جرس کی طرح سے ، و اماندگاں فریاد کرتے ہیں

رنگِ گل :

رنگِ گل سے خوں ہمارے آبلوں کا شوخ ہے :
نقشِ پا سے پھولتا جاتا ہے گلشن زیرِ پا

لالہ' :

لالہ نے روشن کیا کوہ و بیاباں میں چراغ

لالۂ آتش زباں ہے شمعِ ایوانِ بہار

لالۂ بے داغ تجھ سا کوی گلشن میں نہیں :
ایک بت اس حسن کا دیرِ برہمن میں نہیں

جب ترے روے عتاب آلودہ سے تشبیہ دی
لالہ آتش رنگ و آتش خو نظر آیا مجھے

'شرابِ روح پرور'

بہار آی : چھکا ، ساقی ، شرابِ روح پرور سے

کام ہے شیشے سے ہم کو ، اور ساغر سے غرض
مست رہتے ہیں شرابِ روح پرور سے ، غرض

' شاہ اسماعیل

بہار آئی ہے: لطف و کرم نے ساقی کے
کیا ہے دردکشوں کو زلال سے واقف

روشنیِ دل سمجھتے ہیں زلالِ بادہ کو

جو ہرِ لوح کیے نشّۂ مے سے رُوشن

کیا شکرانۂ آبِ بقا پی کے اسے ہم نے
جو اس ظلمت سرا میں ہم تک آبِ آتشیں آیا

روحِ مستانہ ہے مینائے مےِ ناب میں بند

آبِ دمِ تیغ آبِ انگور ہے، اے قاتل!
مستوں کی طرح، پاتا ہوں رقص میں بسمل کو

خمِ فلک سے بھروں وہ شراب شیشے میں
یقیں ہو ذروں کو ہے آفتاب شیشے میں

---

[۱] قالبِ بے روح تھا مینا، سو زندہ ہو گیا:
آتشِ مے، ساقیا، آبِ بقا سے کم نہیں
ناسخ

خونِ دل آنکھ میں اسی طرح سے بھر آتا ہے
جام میں جیسے کہ صہبائے سبو آتی ہے

روز و شب جامِ مہ و خورشید یاں گردش میں ہے

یہ جلوۂ مہ و خورشید سے کھلا، آتش!
ہنوز باقی ہے دورِ فلک میں جائے قدح[1]
آتش

'قاتل و مقتول':

قاتل بہ عزمِ ناز، و دل از زخم در گداز:
شمشیر آب دار، و نگہ آب دار تر

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ:
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں، کہ ہے
پُر گل، خیالِ زخم سے، دامن نگاہ کا!

---

[1] 'مہ': شاہ صاحب، خورشید: سید صاحب
انگور میں ہنوز ہمارے شراب ہے
آتش

ز قاتل مژدۂ زخمے گُلے در جیبِ جان ریزد :
نشاط انگیز باشد بوے خون خونیں مشامان را

فدایش جان ، که بهرِ کشتنم تدبیر با دارد!
عتابِ من به بختِ خویشتن بے جاست ، پنداری!

نویدِ وعدۂ قتلے به گوشم می رسد ، غالب !
لبِ لعلش به کامِ بے دلاں گویا ست پنداری!
غالب

میں ہلاکِ اشتیاقِ طرزِ کشتن ہو گیا :
دوستی کیا ، کی کہ اپنا آپ دشمن ہو گیا !

(تھا چراغِ خانہ : ہم کو برقِ خرمن ہو گیا)

ہائے پھر مرنے لگا میں لطف کی تقریر سے !
اُس کا دم بھی کم نہ تھا ہرگز دمِ شمشیر سے

یہ 'تقریر' شاہ صاحب کی ہے ، اور 'دم دینے' کا الزام مولوی

---

۱ کھا کھا کے زخم کرتے ہیں ، مستوں کی طرح ، رقص
بسمل تمھاری تیغ کے ، کس کس نشاط سے !
آتش

غالب کے یہ شعر ایک جنسی پہلو بھی رکھتے ہیں -

فضلِ حق کا، جس کی یہ کاٹ ہے۔

گل بانگ کس کا مشورۂ قتل ہو گیا؟
کچھ آج بوے خوں ہے واں کی ہوا کے ساتھ

آتے ہی تیرے چل دیے سب، ورنہ یاس کا
کتنا ہجوم تھا دلِ حسرت فزا کے ساتھ!

یہ ورود سید صاحب کا ہے:

کب چھوڑتے ہیں ہم ستم ایجاد کے قدم؟
سر ہے ہمارا، اور ہیں جلاد کے قدم

'ستم ایجاد' اور 'جلاد'[1] مولوی فضلِ حق کے نزدیک:

تلوار لے کے نکلا جو گھر سے وہ جنگ جو
تاثیر نے لیے مری فریاد کے قدم

(کیا ٹھہرے فوجِ غم کے مقابل فغان و آہ؟
جمتے نہیں ہیں لشکرِ برباد کے قدم)

'لشکرِ برباد' سید صاحب کا تربیت یافتہ وہ لشکر جسے امیر خاں نے برباد کیا۔

---

[1] اک دمِ شمشیر سے آزار سب جاتے رہے:
ہم مسیحا جانتے ہیں، شیفتہ، جلاد کو

قاتل جفا سے باز نہ آیا ، وفا سے ہم :
فتراک میں جو سر ہے، تو جاں ہے رکاب میں

(اے حشر ، جلد کر تہ و بالا جہان کو :
یوں کچھ نہ ہو ، امید تو ہے انقلاب میں)

اے آرزو قتل ، ذرا دل کو تھامنا !
مشکل پڑا مرا مرے قاتل کو تھامنا !

مومن

(یہ وہی جذبہ ہے جسے غالب نے یوں ادا کیا ہے :
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے :
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

مگر اس میں ایک جنسی پہلو بھی ہے)

لطفِ قاتل میں تامل نہیں ، پر کیا کیجے؟
سرِ شوریدہ مرا قابلِ فتراک نہیں

شیفتہ

'قاتل' :

(تیری درگاہ کا اللہ رے جلال ، اے شہِ حسن!
عرش پر ہم نے دماغ اس کے گدا کا دیکھا)

کوئے قاتل کا تماشا اسے دکھلا ، آتش!
گرم جس سے نہ ہو بازار فنا کا دیکھا

زرہ جس دن سے، اے قاتل، گلے میں تو نے ڈالی ہے
طلا و نقرہ کو اک رشک ہے اقبالِ آہن پر

(حرارت طور کی شعلے کا ہر اک دانہ رکھتا ہے:
یقیں ہے خاک ہو، بجلی، گرے گر اپنے خرمن پر)

صورتِ قاتل کے دیکھے سے ہوئی ایسی خوشی
اپنی آنکھوں میں ہلالِ عید خنجر ہو گیا

چمن کا عالم ہے آتا ہے نظر گنجِ شہیداں میں:
قدم بادِ بہاری ہے مرے قاتل کے توسن کا

قاتل اپنا جو کرے گنجِ شہیداں آباد
دہنِ زخم کہیں: خانۂ احساں آباد!

(ساری رونق ہے یہ دیوانوں کی دم کی ، آتش!
طوق و زنجیر سے ہوتا نہیں زنداں آباد)

قاتل جزائے خیر ملے تیری تیغ کو!
زخموں کے منہ کھلے نہیں ، جنت کے در کھلے

(چلنا پڑا ہے گا یار کی خدمت میں سر کے بل :
سمجھے ہو کیا، جو بیٹھے ہو ، آتش ، کمر کھلے؟)

الٰہی بازوے قاتل میں زورِ دستِ قدرت دے!
روانی ہے اسی کے دم سے آبِ خشکِ خنجر میں

تری تلوار دکھلاوے بہارِ باغ ، اے قاتل !
لہو سے میرے گل پھولیں چمن بندی کے جوہر میں

عشرت کدہ ہے تیغ سے قاتل کی قتل گاہ
(خالی یہ صید گاہ نہ ہووے شکار سے !)

یہ سودائے شہادت ہے ہمارے سر کو، اے قاتل!
تری تلوار کا دم بھرتی ہے جو رگ ہے گردن میں

(جنوں کے جوش میں یک جا نہیں دم بھر قرار آتا:
کبھی گلشن سے صحرا میں، کبھی صحرا سے گلشن میں)

تصور بندھ گیا ایسا خطِ رخسارِ قاتل کا
کہ جوہر بن گیا گویا مرے آئینۂ دل کا

عیاں ہو شان سے کیونکر نہ کوہِ طور کا عالم؟
بہ رنگِ صاعقہ ، ہے ہر شرارہ تیغِ قاتل کا

عاشق کی سعادت ہے جو سر اس کا جھکا ہے :
قاتل ، تری تلوار نہیں ، بالِ ہما ہے

ہماری زندگانی ہے فقط ذوقِ شہادت سے :
دم اپنے جسم میں گویا دمِ شمشیرِ قاتل ہے

گلستانِ شہادت گہ میں یہ طرفہ گل پھولا :
بنایا شاخِ گل قاتل نے اپنے دستِ پر خوں کو

(جو شبِ بیدار ہیں، وہ غافلوں پر رہتے ہیں غالب:
بہت سی فوج پر جاتی ہے تھوڑی فوجِ شب خوں کو)

دوڑتے ہیں پیچھے قاتل کے گریباں پھاڑ کر :
رکھتے ہیں کیا اشتیاقِ زخمِ دامن دار ہم!

غرقِ دریائے شہادت ایک عالم ہو گیا :
ناسخ ، آبِ تیغِ قاتل کا کہیں ساحل نہیں
ناسخ

’صید و صیاد‘ :

(عملی بے تعلقی ، مگر جذباتی وابستگی برقرار)

اٹھے ہم دامانِ باغ ، رہا ہوں ، پہ کیا کروں؟
اٹھتے نہیں ہیں کوچے سے صیاد کے قدم
(کب چھوڑتے ہیں ہم ستم ایجاد کے قدم ؟)

چھوٹنا دامِ شکستہ سے بھی آسان نہیں :
میں گرفتارِ خمِ گیسوے صیاد رہا

ہوں میں وہ صیدِ جگر خون ، اسیری مشتاق
جو ، پسِ ذبح بھی ، ہر دمِ دمِ صیاد بھرے

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ؟
ناصح ، یہ بندِ غم نہیں : بندِ حیات ہے

مومن

کشش اور رسیدگی کی ملی جلی کیفیت :

تاچہ افسون بہ خود از ہیبتِ صیاد دمم !
تاچہ خون در جگر از حسرتِ پرواز کنم !

نہ رنجد از دمِ تیغِ تو صید ، و در رسیدن ہا
بہ امیدِ تلافی ، چشم بر پشتِ کمان دارد

صیدت ز بیم ِ جاں نہ رمد ، بلکہ می رود
تا دشت را ز شوق ِ در آغوش ِ خود کشد

رمم زاں ترک ِ صید افگن ، کہ خواہم صرف ِ ما گردد
گسستن ہائے بے اندازہ اے کاندر عناں دارد

(دام در حلقۂ دام ِ بلا می رقصد از شادی :
بہانا خویشتن را در خم ِ زلفش گماں دارد)

از بند چہ بکشاید ، و از دام چہ خیزد ؟
ما ایم و غزالے ، کہ رمیدن نہ شناسد

علیحدگی کے باوجود وابستگی کا اظہار ایک دوسرے پیرائے میں بھی ہوا ہے :

دل سے نکلا ، پہ نہ نکلا دل سے :
ہے ترے تیر کا پیکاں عزیز

گزشت از دل ، ولے نہ گزشت از دل
خدنگ ِ غمزۂ زورین کمانان

دیگر ز دامِ ذوقِ تماشا نہ می رود:
در حلقۂ کشاکشِ آہش گرفتہ ایم
غالب

'پھر'

امیر خاں کی خانہ نشینی کے بعد سید صاحب کا پھر جد وجہاد کی تیاری کرنا:

پھر کچھ صدائے پا سے دلِ مردہ جی اٹھا:
پھر جلوہ ریز کون قیامت خرام ہے؟

پھر وہ وحشت کے خیالات ہیں دل میں پھرتے
دشت یاد آتے ہیں: آہو ہیں نظر میں پھرتے

پھر بہار آئی: وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاوں، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے[1]

سنگ اور ہاتھ وہی: وہ ہی سرو داغِ جنوں
وہ ہی ہم ہوں گے، وہی دشت و بیاباں ہوں گے
مومن

---

[1] رخصت اے زنداں، جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے:
مژدہ خارِ دشت، تلوا مرا کھجلائے ہے
ذوق

پھر دل میں آہِ سرد ہوی میری شعلہ ور :
لو ، پھر بھڑک اٹھا یہ فتیلہ بجھا ہوا !

یہ سودائیوں کو مژدہ ہو : زنداں کو ہو نوید !
پھر ہیں جنوں کے سلسلہ‌جنبانیوں میں ہم

ذوق

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے :
روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

غالب

پھر محرک ستم شعاری ہے :
پھر انہیں جستجو ہماری ہے

پھر خیالِ نگاہِ کافر ہے :
پھر تمنائے زخمِ کاری ہے

مجھ سے کیا کیا شاد ہوگی روحِ قیس کوہ کن!
پھر نظر آتے ہیں کوہ و دشت کچھ و آباد سے

شیفتہ

سید صاحب اور شاہ صاحب کی حرارت افروزی:

آتشِ گل ہوی روشن واں : یاں چمکا بہارت دل کا جنوں

مشعل افروزِ جنوں کون ہو مجنوں کے لیے
گر نہ ہو گرمیِ وحشت سے دلِ آہو گرم؟

پھر دل میں آہِ سرد ہوی میری شعلہ ور:
لو، پھر بھڑک اٹھا یہ فتیلہ بجھا ہوا

جل کر اگر بجھا بھی دلِ سوختہ مرا
یوں جل اٹھے گا جیسے کہ کولا بجھا ہوا

ہم جل بجھے، مگر اس دل کی آگ کو
سینے میں ہم نے، ذوق، نہ پایا بجھا ہوا

کہاں بجھی ہے تہِ خاک میری آتشِ دل؟

میں ہوں وہ زندہ دل، کہ مری جانِ بے قرار
برقِ جہاں کو آتشِ مردہ قرار دے

ذوق

'برقِ جہاں' : انگریز

اس کوچے کی ہوا تھی، کہ میری ہی آہ تھی؟
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

سنگِ در سے ترے نکلی آگ
ہم نے دشمن کا گھر جلانے کو

(نقشِ پائے رقیب کی محراب
نہیں زیبندہ سر جھکانے کو)

اُف ری گرمیِ محبت، کہ ترے سوختہ جاں
جس جگہ بیٹھ گیے، آگ لگا کے اٹھے!

مومن

'غالبِ آتش بیان' کی 'آزر فشانی' کا ایک مخرج یہ بھٹی بھی ہے :

مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکا دے
وگرنہ ، مثلِ خارِ خشک ، مردودِ گلستاں ہیں

سوزے کہ بہ خاکم ز تو در عظمِ رمیم است

خشک و تر سوزیِ این شعلہ تماشا دارد :[1]
عشقِ یک رنگ کنِ بندہ و آزاد آمد

از آتشِ لہر اسپ نشان می دہد امروز

شررِ آتشِ رخشندۂ عشقم

سوزم از سوزِ درخشانیِ آتش دارد

خاشاکِ مرا تابِ شرر چہرہ فروز است

خون گرمیِ دل از نفسِ آتشین شناس

---

[1] عشق تو زند راہِ خراباتی و زاہد :
ایں شعلہ چہ شوخ است ، کہ در خشک و تر افتاد !

حزین

ساز و قدح و نغمہ و صہبا ہمہ آتش

پیکرم از خاک ، و دل از آتش است
روشنیِ آب و گل از آتش است

سید صاحب کا پیامِ بیداری و عمل :

جو حرفِ 'قم باذنی' کہہ کے وہ دل دار اٹھ بیٹھا
ہراک خوابِ عدم سے طالبِ دیدار اٹھ بیٹھا

کہاں بندگیِ عشق کہتے ہیں ، نصیر ، اس کو :
نہ مارا دم کسی نے ، جب وہ لے تلوار اٹھ بیٹھا

شاہ نصیر

کون آے ہے ، کہ سینے میں بیدار ہوگیی
صد آرزوے خفتہ صداے قدم کے ساتھ ؟

ہاتھ میں جنبشِ محمل کے عناں ہے اپنی
ورنہ یاں کس کو سرِ آبلہ فرسای تھا ؟

ممنون

پھر کچھ صداے پا سے دلِ مردہ جی اٹھا :
پھر جلوہ ریز کون قیامت خرام ہے ؟

دیکھا نگاہِ ناز سے کس شوخ چشم نے ؟
پھر مضطرب نظر کو جہاں نیم گام ہے

ترے کشتے جو یوں خوابِ عدم سے یک بہ یک چونکے
مگر شورِ قیامت کو تری آوازِ پا سمجھے
مومن

خلخالِ پائے یار میں آوازِ صور ہے :
بیدار بختِ خفتۂ اہلِ قبور ہوں !

خلخالِ پائے یار سے ہے یہ صدا بلند :
غافل جو سوتے تھے، انھیں ہم نے جگادیا

ٹھوکر ہے تری صاحبِ اعجازِ مسیحا
نالہ تری خلخال کا ہے قم سے زیادہ

ٹھوکریں مار کے مردوں کو ہے زندہ کرتا :
میرے یوسف میں ہے اعجازِ مسیحا باقی

طرفہ گرمی مرے محبوبِ قبا پوش نے کی :
شمعِ کشتہ کو فروزندہ کیا داماں سے[1]

---

[1] جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موجِ نفس ان کی :
الٰہی ، کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں؟
اقبال

تم اندھیری رات میں آٹھو جو چہرے سے نقاب
روئے رشکِ مہر ذروں کو جگا دے خواب سے

آتش

بات جو میرے مسیحا کی ہے اک اعجاز ہے :
جان آ جائے تن بے جاں میں ، وہ آواز ہے

مردے کو جلاتی ہے ترے ناز کی آواز :
اعجاز کا اعجاز ہے ، آواز کی آواز

تری آواز پر مردے نکل آتے ہیں مدفن سے

ناسخ

کون ؟

سید صاحب اور ان کے اہلِ قافلہ کا لکھنؤ میں ورود اور شاعروں پر تاثر[1] :

شغلِ تصرف آج کس اہلِ نظر کو ہے ؟
ہر آینہ سکندر و ہر جام جم ہوا

---

[1] سید صاحب کا قافلہ ، جس میں شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی بھی شامل تھے ، جب لکھنؤ پہنچا تو غازی الدین حیدر (سنِ جلوس ۱۲۲۹ھ) کی بادشاہی اور معتمدالدولہ آغا میر کی وزارت کا آغاز تھا ("سیرت") ، وہاں اس کا قیام ، مہر صاحب کے اندازے کے مطابق، ڈیڑھ دو مہینے رہا ۔

آثارِ عشق آنکھوں سے ہونے لگے عیاں :
بیداری کی ترقی ہوئی ، خواب کم ہوا

جولاں میں ہے سمند یہ کس رشکِ ماہ کا ؟
ہر ذرہ اک ستارہ ہے گردِ[1] غبار سے

(کوچے میں تیرے کشتنیوں کا رہے ہجوم !
خالی یہ صید گہ نہ ہووے شکار سے !)

کون سے صیاد نے صید افگنی کی اختیار ؟
حلقۂ گوشِ غزالاں حلقۂ فتراک ہے[2]

(مومن و کافر جگہ دیتے ہیں آنکھوں میں اسے :
طور کا سرمہ کسی نقشِ قدم کی خاک ہے)

کون تجھ سا بادشاہِ حسن ہے آج ، اے صنم ؟
کس کے کوچے میں فقیروں کے ہیں بستر سیکڑوں ؟

---

[1] عشق ہیں اک صید افگن کے ہے یہ جوشِ جنوں

[2] نہیں نخچھیر تیرے صیدگہ میں اے شکار افکن !
مشکل آرزوے خاطرِ نخچھیر پھرتی ہے
شیفتہ

کچھ تو ہمیں حقیقتِ شمس و قمر کھلے
کس کج کلہ کے عشق میں پھرتے ہیں سر کھلے؟

(قاتل، جزائے خیر ملے تیری تیغ کو!
زخموں کے منہ کھلے نہیں: جنت کے در کھلے)

گرد رہتے ہیں ستارے رات دن پروانہ وار
ماہِ تاباں کون سے دروازے کی قندیل ہے؟

(جلوۂ قربانیانِ عشق کس دن واں نہیں؟
روز اس یوسف کے کو میں عیدِ اسماعیل ہے)

آتش

کون سا خورشید آج اپنا چراغِ خانہ ہے؟
بزم میں باہم ہجومِ ذرہ و پروانہ ہے

(پاؤں میں کانٹے چبھے ہیں، پیرہن ہے چاک چاک:
باغ میں جو گل ہے، تیرے عشق کا دیوانہ ہے)

غالب کا فلسفیانہ ذہن 'دہقان' کے لفظ سے انھیں ایک خاص تاریخی سانحے سے اٹھا کر ایک عالم گیر جدلیاتی عمل کے شعور تک ہو گیا:

ہیولٰی برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

گل فشاں عکس ہوا کس کے رخِ رنگیں کا
ہے جو آئینے میں عالم سبدِ گل چیں کا ؟

چاند کی طرح ہے خرمن میں وہ دہقان زادہ :[1]
کیوں نہ ہر خوشے میں ہو نور عیاں پروین کا؟

جھولتی ہے عرش پر تلوار کس قاتل کی آج ؟
ہے تصور دل میں کس کے ابروے خم دار کا ؟

کسی صیاد کو گل گشت کا کیا آج ارادہ ہے ؟
ہزاروں بلبلیں ہیں منتظر دیوارِ گلشن پر

خبر ہے جان و تن کی صید گاہِ عشق میں کس کو ؟
جگر ہے محو ناوک پر ، نظر ہے ناوک افگن پر[2]

کس کا نالہ ہے کہ جس میں نہیں فریادِ جرس ؟
کون وہ سینہ ہے اس لیلیٰ کا جو محمل نہیں؟

---

[1] اس 'دہقان زادہ' کی تحریک کا جو دل دوز انجام ہوا ، آتش نے اس شعر میں اس کی طرف اشارا کیا ہے :

تیرِ بارانِ بلا سے ہو گیی کشت اپنی سبز :
رہ گیا دہقاں دعاے ابرِ رحمت مانگتا !

[2] اس کے ناوک کی توجہ پہ مری جان نثار!
ہاتھ سے چھوٹتے ہی قصد جگر کرتا ہے

غرقِ دریائے شہادت ایک عالم ہوگیا :
ناسخ ، آبِ تیغِ قاتل کا کہیں ساحل نہیں

کون لیلیٰ ہے جنوں انگیز اس خرگاہ میں ؟
(سنگ ریزے طور ہیں اس کی تجلی گاہ میں)
ناسخ

'سمند'/'توسن' :

سوارِ توسنِ ناز است ، و برخا کم گزر دارد
ببال اے آرزو ، چندان کہ دریابی رکابش را

زمین ز نقشِ سمِ توسنِ تو ساغر زار
ہوا ز گردِ رہت شیشۂ مےِ ناب است
غالب

دیتا نہیں ، اس ضعف پہ بھی ، جوشِ جنوں چین
ہر ریگِ رواں دشت میں توسن ہے ہمارا
مومن

چمن میں عالم آتا ہے نظر گنجِ شہیداں میں ؟
قدم بادِ بہاری ہے مرے قاتل کے توسن کا
آتش

جولاں میں ہے سمند یہ کس رشک ماہ کا ؟
ہر ذرہ اک ستارہ ہے گردِ غبار سے

یہ مشتِ خاک ترے جلو کی نیاز ہے
گر ، اے سمندِ ناز ، یہی ترکتاز ہے
ناسخ

توسنِ ناز اٹھاتے کیوں ہو ؟
خاک میں شہر ملاتے کیوں ہو ؟

(حاصل اس سلسلہ جنبانی سے ؟)
شیفتہ

در خاک از ہوا ے گل و شمع فارغیم :
از توسنِ تو طالبِ نقشِ سمیم ما

'شہ سوار' :

دامانِ زیں چھوا ہے جو اس شہ سوار کا
ہے عرش پر دماغ ہمارے غبار کا

(دستِ علی کی ضرب کا جنبش میں ہے اثر :
ان ابروؤں میں معجزہ ہے ذوالفقار کا)

ہماری خاک کو، اے شہ سوارو ، عرش دکھلایا :
خدا ہمت زیادہ دے تمھاری ترکتازی کو!

(شہادت بھی ہے منزل فتح کے ہے مردِ غازی کو)

گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے :
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

(چلا ہے تیر و کمان لے کے صید گاہ وہ ترک)

صید بندی کا تجھے جو شوق تھا، اے شہ سوار!
حلقۂ دامِ محبت رشتۂ فتراک تھا

یوں تو تیرے تیر کے نخچیر تھے سب خوش نصیب
وہ بلند اقبال تھا جو بستۂ فتراک تھا

بھولتی آنکھیں نہیں اک دم تجھے، اے شہ سوار!
یاد تیری دل سے کرتی ہے خلش مہمیز کا

(صورِ اسرافیل کا پھکنا اسے افسانہ ہے
کشتہ ہے جو تیرے بالاے قیامت خیز کا)

'سرگرمی' :

انگریزوں کے خلاف منصوبۂ جنگ کی ناکامی کے بعد ، سید صاحب کی بدستور سرگرمی :

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے وہی گرمیِ رفتار ہنوز

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ ، کہ سر تا سرِ خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہر بار ہنوز

نازم آیینِ کرم را ، کہ بہ سرگرمیِ خویش
دشت را شمع و چراغِ شبِ تار است بہار

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نہ جوییم

شاہ صاحب کی سرگرمیِ کردار و گفتار :

بہرِ سرگرمیِ ما خانہ خرابان باید
حسن از تابِ خود آتش بہ شبستان زدہ اے

در خموشی تابشِ روے عرق ناکش نگر
تاچہا ہنگامۂ سرگرمیِ گفتار ہست !

خرام :

اب قدم سے ہے مرے خانۂ زنجیر آباد
آبِ آہن نے کیا ہے یہ گلستان پیدا

آتش

جوشِ وحشت نے مجھے ایسا کیا آتش قدم
خانۂ زنجیر سے ہونے لگے روشن چراغ

نور افشاں اس قدر اس کا خرامِ ناز ہے
چادرِ مہ تاب گویا فرشِ پا انداز ہے

شب چمن میں کیں جو نقشِ پا سے نور افشانیاں
جو ترا نقشِ قدم تھا ، سو گلِ مہ تاب تھا

جو اس کا نقشِ پا ہے ، پنجۂ خورشیدِ تاباں ہے

کرتی ہے مجھے قتل مرے یار کی رفتار :
تلوار کی تلوار ہے ، رفتار کی رفتار

بہ مشتِ خاک ، تیرے جلو کی نیاز ہے
گر ، اے سمندِ ناز ، یہی ترک تاز ہے

ناسخ

'راہ'/'جادہ' :

رشتۂ تسبیح تارِ جادۂ منزل ہوا

جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

عنان از برق باشد در رہت زرین عنانان را

انصاف جادۂ روشِ مستقیمِ تو

در رہِ سیلِ بہار شرحِ دمیدن دہم

ز خاکِ راہِ وے اکسیر در نظر دارم

گردم ہلاکِ فرۂ فرجامِ رہ روی
کا ندر تلاشِ منزلِ عنقا شود ہلاک

راہِ صحرائے خیالِ تو چو مستان رفتم

راہِ نسبت طلبی بین ، کہ چہ شایان رفتم!

قبلۂ گم شدگانِ رہِ شوقم ، غالب!

غالب

گدا نواز کوی شہ سوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

خزاں چمن سے ہے جاتی : بہار راہ میں ہے
آتش

خضرِ راہِ منزلِ مقصود ، مثلِ جادہ ۔ ہوں
ناسخ

'غبار' :

رگِ سنگم : شرارے می نویسم
کفِ خاکم : غبارے می نویسم

گدازِ غمش کیمیاے سرشت
غبارِ رہش سیمیاے بہشت

رہش را ز جان ہا غبارے بلند

غبار از جلوۂ اوجِ سپہرِ سادہ می بالد

ہجومِ جلوۂ گل کاروانم را غبار استے

طلوعِ نشہ گردِ راہ باشد خوش خرامان را

غبارِ راهِ تو پیرایۂ نکوی ملک

غبارِ راه گزر سرمۂ سلیمانی است

به چشمِ اہلِ نظر سرمه از غبار کشد

ہوا ز گردِ رہت شیشۂ مےِ ناب است

غبارِ طرفِ مزارم به پیچ و تابے ہست:
ہنوز در رگِ اندیشه اضطرابے ہست

وا مانده ام چو خاک ، و پراگنده چون غبار

عرصۂ شوقِ ترا مشتِ غباریم ما

پاسِ ناموسِ غبارے داشتم

بنگر موجِ غبارے ، و ز غالب بگزر

غبارِ شوق به خونابۂ امیدِ سرشت
دمے کے خواست قضا طرحِ این نبا ریزد

خاکِ وجود ماست بہ خونِ جگر خمیر:
رنگینیِ قماشِ غبارِ خودیم ما

مشت غبارِ ما ست پراگندہ سو بہ سو:
یا رب، بہ دہر در چہ شمارِ خودیم ما؟

کفِ خاکیم: از ما بر نہ خیزد جز غبار آن جا:
فزون از صرصرے نہ بود قیامت خاکساران را

سوادش داغِ حیرانی: غبارش عرضِ ویرانی
جہان را دیدم و گردیدم آباد و خرابش را

(سوارِ توسنِ ناز است، و بر خاکم گزر دارد
ببال، اے آرزو، چندان کہ دریابی رکابش را)

مگر غبار ہوے پر ہوا اڑا لے جاے
وگر نہ تاب و تواں بال و پر میں خلک نہیں

گدا نواز کوی شہ سوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

(ہوائے دورِ مے خوش گوار راہ میں ہے :
خزاں چمن سے ہے جاتی ، بہار راہ میں ہے)

دامانِ زیں چھوا ہے جو اس شہ سوار کا
ہے عرش پر دماغ ہمارے غبار کا

محمل سوار ہے اسی گرد و غبار میں

بعدِ فنا ہے کوچۂ گیسو کی جستجو :
سودا تو دیکھیو مرے مشتِ غبار کا!

ہر ذرہ اک چراغ ہے اپنے غبار کا

اڑتی پھرتی ہے ہماری خاک ہمراہِ صبا :
بے پر و بالی میں بھی اپنی وہی پرواز ہے!

تختِ تابوت کہاں! بن کے غبار اڑ جاو :
باد کے گھوڑے کی ، آتش ، ہے سواری تیار !

بیہودہ خاک اڑانے سے کیا فایدہ، صبا!
محمل سوار پیدا ہو گرد و غبار سے

نہیں اسرار سے، آتش، یہ پتلا خاک کا خالی:
یہی وہ گرد ہے جس سے سوار آخر عیاں ہوگا
آتش

جولاں میں ہے سمند یہ کس رشکِ ماہ کا؟
ہر ذرہ اک ستارہ ہے گردِ غبار سے

کسی خورشید رو کو جذبِ دل سے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

یہ مشتِ خاک تیرے جلو کی نیاز ہے
گر، اے سمندِ ناز، یہی ترک تاز ہے
ناسخ

'افسوں':

یہ کس کی چشمِ فسوں گر نے کی فسوں سازی؟
طلسمِ جادوے بابل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں
مومن

جستجو میں سرمۂ تسخیر کے ہم کب نہ تھے؟
چشمِ افسوں ساز سے سحر آفریں تو کب نہ تھا؟

(مثلِ تیرِ غمزہ، ظالم، دل نشیں تو کب نہ تھا؟)

شیفتہ

ساحرِی چشمِ فسوں گر کی فسوں سازی سے

آتش

ایک اشارہ : مختلف مشارٌ الیہ

غزل گو شاعروں نے ایک ہی نشان سے مختلف اشخاص اور امور کی طرف اشارے کیے ہیں - تحریکِ جد و جہاد کے سیاق و سباق میں اس کی کچھ مثالیں دہلی اور لکھنؤ کے چند شاعروں کے کلام سے بعض علامتوں کے تحت پیش کی جاتی ہیں -

'بہار' :

امیر خاں کی بے غیرتی سے سید صاحب کے منصوبے میں رخنہ اندازی :

رفتہ از خمیازہ ام برباد ناموسِ چمن :
چاک اندر خرقۂ صبحِ بہار افتادہ ام

(از شکستِ خویش بر دریا کنار افتادہ ام)

اس شعر میں غالب نے اپنی گریز پائی پر بھی نکتہ چینی کی ہے -

تحریکِ جد و جہاد سے انگریزوں کی بوکھلاہٹ :

در طبعِ بہار این ہمہ آشفتگی از چیست ؟
گوی کہ دل از بیمِ تو خون گشت خزان را

تحریک کے فیضان سے بے بہرہ رہنے کا احساس :

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سید صاحب کی تحریک کی بدولت ، زوال میں زندگی کے آثار :

تا چہا مجموعۂ لطفِ بہاران بودہ ای !

خزانِ ما بہارِ دامنِ صحر است ، پنداری

بہاران است ، و خاک از جلوۂ گل امتلا دارد

تابہ زانو سودہ پاے ما ، و می پوییم ما

بخندم بر بہار و روستای شیوہ شمشادش

ز گل چینانِ طرزِ جلوۂ سروِ قباپوشم

'بہار' : انگریز ؛ روستای شیوہ شمشاد : فضلِ حق

سروِ قبا پوش : شاہ اسماعیل

تا بستیزد بہار ، تیغ ز آتش کشید

انگریزوں کا جنگ میں توپوں کا استعمال

'غمزہ' :

(سید صاحب)

چون غمزۂ تو فسونِ اثر فرو خواند

بلاے راہ زن از کاروان بگرداند

شاہ صاحب پر سید صاحب کا اثر :

غمزہ را زان گوشۂ ابرو کشادے دیگر است :

آن خرامِ توسن ، و این جنبشِ سہمیز ہے !

فضلِ حق کی سنگ دلی پر سید صاحب کا جادو نہ چلنا :

آہن چہ دادِ غمزۂ سحر آفرین دہد ؟

' دل ترا سنگ ہے ، پر آگ کہاں ہے اس میں ؟

دل ہمارا ہے ، کہ سینے میں شرر رکھتے ہیں

شیفتہ

سید صاحب ، بقولِ فضلِ حق

شب روی ِ غمزہ صبر و دل و دین ربود

سید صاحب کا امیر خاں کے فریب میں آنا :

سراسر غمزہ بایت لاجوردی بود ، و من عمرے
بہ معشوق پرستیدم بلائے آسمانی را

'زلف' :

سکھوں کی ظالمانہ عمل داری :

پابند ، جوں دخاں ، ہیں پریشانیوں میں ہم :
یا رب ، ہیں کس کی زلف کے زندانیوں میں ہم ؟

اس کے خلاف ردِ عمل :

پا کوبیوں کو مژدہ ہو ، زنداں کو ہو نوید :
پھر ہیں جنوں کے سلسلہ جنبانیوں میں ہم

کون سنتا ہے تری زلف میں دل کی فریاد
کہ مسلماں کو ہے کافر کے عمل میں* مارا

دل کو اس کا کلِ پیچاں سے نہ بل کرنا تھا
یہ سیہ بخت کیا اپنے ہی بل میں مارا

ترا سنگار بنی ہے وہ بلا کہ، جائے گہر
پروئے زلفِ مسلسل کے تار تار میں دل

سودائیوں کے دل پہ، تری یادِ زلف میں
اک سانپ سا ہے قیدِ سلاسل میں لوٹتا
ذوق

سکھوں کا فروغ :
پاؤں تک پہنچی وہ زلفِ خم بہ خم
سرو کو اب باندھیے آزاد کیا!

مومن

شکستِ ما بہ عالم ہم چناں پیدا ست
بہ صورتِ سرِ زلفے کہ از کمر گزرد
غالب

سکھوں کا عروج :
بڑھتے بڑھتے، تا کمر پہنچی وہ زلفِ مشک بو

پاؤں تک یار کے پہنچے گی لٹک کر سر سے :
پھیرنے سے وہ کوئی زلفِ رسا پھرتی ہے !

بھلا دے زلفِ شب‌گوں روزِ محشر کی درازی کو

مسلمانوں کی دار و گیر :

نام جس نے عشق کا روئے کتابی کے لیا
اس کو زلفوں کے شکنجے میں وہ کھنچوانے لگے

دیکھیے اگر مرا دلِ سودا زدہ وہ زلف
ہر مو سے ہو بلند صدا دار و گیر کی

ہندو و مسلمان دونوں پر زیادتیاں :

کمندِ زلف سے ہیں ہندو و مسلماں تنگ

کیے ہیں کافر و دیں دار ان زلفوں نے سودائی
ہوئے ہیں جان کا جنجال ہندو و مسلماں کو

سکھ مظالم سے جد و جہاد کے ذریعے نجات کی آرزو :

کب تک وہ زلف دیتی ہے آزار ، دیکھیے !
کٹتی ہے کس طرح سے شبِ تار ، دیکھیے

(مشتاق دل ہے جنبشِ ابروئے یار کا :
چلتی ہے کس طرح سے یہ تلوار ، دیکھیے !)

سکھوں کی چہرہ دستیاں :

اندھیرا سا اندھیرا چھا رہا ہے آگے آنکھوں کے :
شبِ تاریک میں مجھ کو خیالِ زلفِ شب گوں ہے

پھنس گیا ہے دل مرا اس زلفِ عنبر فام میں :
غیر ممکن ہے نہ مومن کو ہو ایذا شام میں

جی لیتی ہے وہ زلفِ سیہ فام ہمارا :
بجھتا ہے چراغ آج سرِ شام ہمارا

شہادت پای جو سودائے زلفِ یار میں ہم نے
ہوا نقشہ عیاں مارِ سیہ کا خونِ جاری سے

'گیسو' :

دیکھ کر دورِ خطِ شب رنگ ایسا غم ہوا
حلقۂ گیسو بھی مجھ کو حلقۂ ماتم ہوا

ہے بلا سلسلۂ گیسوے بتاں کا ، اے دل !
یہ جہاں کیوں نہ مسلمانوں کو زنداں ہوتا ؟

دشتِ جنوں میں شامِ غریبی کو دیکھ کر
آیا خیال مجھ کو جو گیسوئے یار کا

جادے دکھائی دیتے ہیں مانندِ اژدہا
کانٹوں میں صاف زہر ہے دندانِ مار کا

نورِ رخ سے گیسوؤں کی تیرگی جاتی نہیں

سکھوں کے مظالم پر، سید صاحب کے زیرِ اثر، پیچ و تاب :

باعثِ بے تابیِ عالم نگاہِ یاس ہے :

کیا دلائی یاد وہ زلفِ خمیدہ مو ہمیں ؟

تیرہ بختوں کے پیچ و تاب نہ پوچھ :
غیرتِ زلفِ تاب دار ہے دل

کس کی زلفوں کی بو نسیم میں تھی ؟
ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں

کیا بلا اس زلفِ خوش خم کا تصور بندھ گیا :
سانپ سے دن رات آتے ہیں نظر ہر سو ہمیں

اس پیچ و تاب کے انجام پر سب شاعروں کی نظر :

پڑے گا سایۂ زلف اس پہ بھی ضرور کبھی :
کہ پیچ و تاب تمھاری کمر کو دیکھتے ہیں'

(' کمر' ناطاقتی کی رعایت سے)

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں :
لو ، آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

مومن

دل کو اس کاکُلِ پیچاں سے نہ بل کرنا تھا :
یہ سیہ بخت گیا اپنے ہی بل میں مارا

مگر شہادت کے بعد بھی ذوق کا پیچ و تاب برقرار رہا :

صبا ، بگولا بنے کشتگانِ زلف کی خاک
کہ بعدِ مرگ بھی معلوم پیچ و تاب تو دے

ذوق

شاہ نصیر نے تحریک کے دونوں مرحلوں کا ذکر کیا ہے :

ہوگیا مرغِ دل اپنا تو ، صد افسوس ، نصیر !
دامِ پر حلقۂ زلفِ بتِ پنجاب میں بند

' ناز این ہمہ ، یعنی چہ ؟ کمر ہیچ و دہان ہیچ !

غالب

اس زلف کے سایے میں نہیں ہے دلِ صد چاک
زخمی یہ کوی زیرِ علم چور پڑا ہے

شاہ نصیر

سید صاحب کا سکھوں کے بل نکالنے کا منصوبہ :

اے اسد ، ہے مستعدِ شانہ گشتن بہرِ زلف :
پنجۂ مژدہ بہ خود بالیدنی رکھتا ہے آج

منصوبے کے باب میں اندیشے :

بس کہ سودائے خیالِ زلف وحشت ناک ہے

نہ کھینچے سعیِ دستِ نارسا زلفِ تمنا کو

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک ؟

سو بر نہ تابد این ہمہ پیچ و خم و شکن :
زلفِ تو روزنامۂ بختِ سیاہِ کیست ؟

تو ، اور آرایشِ خمِ کاکل :
میں ، اور اندیشہ ہائے دور دراز

اس متغزلانہ شعر کی خارجی تفسیر کو بد ذوق سمجھا جائے گا ،
مگر میرے خیال میں یہ دور دراز کے اندیشے وہی ہیں جو ایک

اور شعر میں یوں بیان ہوئے ہیں :

بھرم کھل جائے ، ظالم ، تیرے قامت کی درازی کا[۱]
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

شاہ صاحب بالا بلند تھے ، مگر پیچ و خم کھلنے پر طرۂ پر پیچ و خم کا طول ، الامان والحفیظ !

شکستِ ما بہ عدم ہم چنان پیدا ست
بہ صورتِ سرِ زلفے کہ از کمر گزرد

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک :
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک !

اس سے اگلے شعر میں 'حلقۂ صد کامِ نہنگ' ، سے سکھوں کی مہیب قوت کی طرف اشارہ ہے -

'زلف' کا نشان سید صاحب کے لیے :

اے اسد ، وا شدنِ عقدۂ غم گر چاہے
حضرتِ زلف میں ، جوں شانہ ، دلِ چاک چڑھا

---

۱ 'شاہ صاحب کشیدہ قامت تھے ، اور سپاہیانہ وضع رکھتے تھے'
''ارواحِ ثلثہ''

آخرِ کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا
دلِ وارفتہ ، کہ بیگانۂ ہر مذہب تھا

ستمِ نسبتِ زلف

موکشاں خانۂ زنجیر میں لایا ہے مجھے

غلطہ دمم بہ مشک ز فیضِ ہوائے زلف

شبِ غربت ہمانا شیوۂ غم خواریِ دارد
کہ ہم در ماتمِ صبحِ وطن زلفش پریشان شد

'زلف' :

(فوج)

امیر خاں کی فوجی قوت سے توقعات

ہے یہ امیدِ قوی زلفِ رسائے یار سے
گنج چھینے ، مہرہ اگلائے دہانِ مار سے

سید صاحب کا امیر خاں کو انگریزوں سے ٹکر لینے کا مشورہ :

چاند سے رخسار پر لہرا کے آپنے دیجیے :
کیجیے اندھیر ، زلفوں کو پریشاں چھوڑ کر

(کاٹ کر کوچے قدم رکھ سر زمینِ عشق پر :
کہویت باتھ اس کے ہے جو بھاگا نہ میداں چھوڑ کر)

امیر خاں سے بڑھ کر اس کی سپاہ کا جذبۂ جنگ و جدل :

حرارت ہوتی ہے سردار سے زیادہ سپاہی میں :
زیادہ تر مزاجِ یار سے زلفوں میں بل پایا

انگریزوں کے ایما سے امیر خاں کا اپنے لشکر کو رخصت کرنا :

اس پری رو نے کیے ، منڈوا کے زلفیں ، آزاد اسیر :
سلسلہ سودا زدوں کا درہم و برہم ہوا

امیر خاں کا اپنی سپاہ سے ان بن کے بعد اسے چلتا کرنا اور سید صاحب کا بازو ٹوٹنا :

تو نے زلفوں کو الجھ پڑنے سے منڈوایا جو ، یار !
شاہ بازِ حسن بے بازو نظر آیا مجھے

امیر خاں کی فوجی جمیعت کا بکھرنا :

کون سا بال ہے اس زلف کا بکھرا جو نہیں ؟
کوی مجموعہ نہ اتنا بھی پریشاں ہووے !

امیر کا الگ کیا ہوا لشکر انگریزوں کے قبضے میں :

شانے کے حصے میں وہ زلفِ پریشاں آی

امیر خاں کی ، خلافِ وعدہ ، انگریزوں سے مصالحت اور لشکر کی

برہمی پر لعنت ملامت :

مل جاتے خاک میں گو سودا زدہ بلا سے !
زلفِ دراز اپنی تو مختصر نہ کرتا

(اے آفتابِ محشر ، نظروں سے گر گیا تو :
منہ پھیرتا جدھر سے ، منہ پھر ادھر نہ کرتا)

انگریزوں کا مقابلہ نہ کرنے کا قلق :

تری زلفوں نے بل کھایا تو ہوتا
ذرا سنبل کو لہرایا تو ہوتا !

(نہ کیوں کر حشر ہوتا ، دیکھتے ہم
قیامت قد ترا لایا تو ہوتا)

سودائے زلف

(سید صاحب کی ذات اور ان کی تحریک کا ان کے ارادت مندوں پر ولولہ انگیز اثر)

کشتہ ہے سو جان سے دل نرگسِ خوں ریز کا :
سر کو سودا ہے تری زلفِ بلا آنگیز کا

مردانِ عشق زلف کے پھندے میں پھنس گیے :
شیروں کو سلسلہ تری زنجیر سے ہوا

پھنسے ہیں بس کہ دل سودا زدوں کے تری زلفوں" میں:
ہر اک موئے رسا پر ان کے عالم ہے رگِ جاں کا

سودائیوں کی تیرے روح آئی ہے قالب میں
اے زلفِ سیاہ ، سن کر آوازِ سلاسل کو

انگریزوں سے جد و جہد کی ناکامی کے بعد ، سید صاحب کے زیرِ اثر ، سکھوں سے نبرد آزمائی کا منصوبہ:

سودائے زلفِ [illegible] میں یہ چاہتا ہے شوق
آنکھیں ہوں ، اور خوابِ پریشان نئے نئے

(ویرانے شہر ہوں تری شمشیرِ ناز سے
آباد ہوویں گنجِ شہیداں نئے نئے)

بعدِ فنا ہے کوچۂ گیسو کی جستجو:
سودا تو دیکھیو مرے مشتِ غبار کا!

سید صاحب اور ان کی تحریک سے بچنے کا مشورہ:

سودائے زلفِ یار کی دل میں ہوس نہ رکھ:
اے دل ، لگا نہ جان کے پیچھے عذاب کو

زلف کے سودے میں اک عمر بسر کی ، آتش !
بس بہت دیکھ چکے خوابِ پریشاں : چلیے !
آتش

سید صاحب کے سلسلے سے وابستگی :

حشر میں ، ناسخ ، یہی اپنا کہوں گا سلسلہ :
میں اسیرِ حلقۂ گیسوئے سید زادہ ہوں

سید صاحب کا حلقہ :

جو حلقہ ہے زلفِ عنبریں کا، وہ ایک نافہ ہے مشکِ چیں کا

اثر رکھتا ہے سایہ کیا ہی اس زلفِ معنبر کا :
بجائے خاک ، کوئے یار میں عنبر ہی سارا ہے

(زمانے میں لگا دی آگ اک کافر بھبوکے نے :
(جہاں ہے تودۂ باروت گویا ، وہ شرارا ہے)
ناسخ

'گیسو' :
(سید صاحب)

گیسوؤں کا ترے سودا شعرا رکھتے ہیں
سلسلہ دور پہنچتا ہے ترےِ گیسو کا

شہرہ ہے گیسوے پیچاں کا تمھارے ہر طرف :
غلغلے ہیں چار سو اس بے صدا زنجیر کے

(بس کہ قامت سے ہے آثارِ قیامت آشکار)

دلِ صدپارہ کو سودا ہے اک گیسوے پیچاں کا :
نگہ باں افعیِ مشکیں ہے اس گنجِ شہیداں کا

حسن نے گیسوؤں کو تیرے دیا
مشک کے ساتھ ، کالا رنگ

(سید صاحب کی رنگت کی رعایت سے)

'گیسو' (سکھ) :

خیال آیا ہے ہم کو ان دنوں مضمونِ گیسو کا :
زمینِ شعر پر نازل بلاے آسمانی ہے

الجھا ہے دل بتوں کے گیسوے پر شکن میں :
آ گئی ہے ، جاے سبزہ، کنگھی مرے چمن میں

مری اذاں سے ہے گیسوے یار بل کھاتا :
ملال ہوتا ہے ، کافر ہے جب اذاں سنتا

مجاہدوں پر سکھوں کا نرغہ :

گیسوے مشکیں رخِ محبوب تک آنے لگے :
چشمۂ خورشید میں بھی سانپ لہرانے لگے

اس کو زلفوں کے شکنجے میں وہ کسوانے لگے

'کاکل' :

(سید صاحب)

تیری کاکل میں پھنسا ہے دل جوان و پیر کا :
سیکڑوں آزاد ہے پابند اس زنجیر کا

(سکھ)

مجال کیا کوئی سودا زدہ جو دم مارے
گلو میں پھانسی ہے اس کا کلِ رسانے دی

سانپ کے کاٹے کی لہریں شب و روز آتی ہیں :
کاکلِ یار کے سودے نے اذیت دی ہے

'سنبل' :
(سید صاحب اور ان کا حلقہ)

کہتے ہیں سنبلِ فردوس بھی شاعر اس کو :
(سلسلہ دور پہنچتا ہے ترے گیسو کا)

(خدا کردے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا !)
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا !

'سنبل' (مجاہد) ، 'زلف' (سکھ)

زلفِ پیچاں سے پریشاں حال سنبل ہوگیا :
گل ترے آگے چراغِ لالہ و گل ہوگیا

رتبہ سنبل نے بہم پہنچا خس و خاشاک کا :
پیشِ زلفِ یار مٹی مشک و عنبر ہوگیا

'سنبل' (سکھ) : 'زلف' (مجاہد)

بل ان کی زلفِ پیچاں کی طرح کیا کھائے گا سنبل؟
وہ ایسے بد بلا بھتنے کی چوٹی کو کترتے ہیں !

(خوش آبی ہو زیادہ تیری تیغِ تیز میں ، قاتل !
سرِ احباب کیا کٹتے ہیں ، اس سے بوجھ اترتے ہیں)

سید صاحب اور شاہ صاحب کا سکھوں کی ظالمانہ حکومت کو ناقابلِ برداشت سمجھنا اور ان سے لڑنے کی خاطر مراجعت :

'کاکل' :

نفرت تھی اس قدر، کہ نہ ٹھہرے وہ صبح دم :
پاسِ درازیِ شبِ کاکل نہ ہوسکا

(نظارہ مجھ سے جانبِ سنبل نہ ہوسکا)

سوسن

حسن :

(سید صاحب)

تری درگہ کا اللہ رے جلال، اے شہِ حسن !
عرش پر ہم نے دماغ اس کے گدا کا دیکھا

(دوسے قاتل کا تماشا اسے دکھلا، آتش !
گرم جس نے نہ ہو بازار فنا کا دیکھا)

وہ شاہِ حسن ہے تو، گیسوے عنبر فشاں تیرے
ہما کو اپنے سایے سے سعادت مند کرتے ہیں

(توجہ سے دلِ درویش کو خرسند کرتے ہیں)

اندھیری رات میں دیتی ہے دھوکا روشنی مجھ کو
فروغِ حسن سے کس کا رخِ پر نور مشعل ہے؟

(جسے ظلِ ہما کہتے ہیں، درویشوں کا کمبل ہے)

(شاہ صاحب)

عارف ہے وہ جو حسن کا جویا جہاں میں ہے :
باہر نہیں ہے ، یوسف اسی کارواں میں ہے

کون سا دل ہے نہیں جو کشتہ حسنِ گرم کا ؟
بزمِ عالم میں ہے تو : گنجِ شہیداں میں چراغ

شاعر پسند حسنِ پر آشوب ہے ترا

سید صاحب کے ایما سے شاہ صاحب کی سکھوں کے خلاف دعوتِ جہاد :

حسن کے جلوے سے اس رخ کا اشارا ہے یہی :
کافری زیبا ہے زلفوں کو ، مسلمانی مجھے

خطِ صلح سے سید صاحب کی عسکری شان و شوکت کا خاتمہ :

خط سے رہا نہ حسنِ رخِ یار کا فروغ :
بجھنے نے اس چراغ کے دل کو بجھا دیا

(انگریز)

انگریزوں کا، مظالم کے باوجود، فروغ:

ہوا تجھ سے نہ عشق، اے حسن، اس کس کو زمانے میں؟
ستم تو نے کیے ہیں کافرو دیں دار پر کیا کیا!

مومن و کافر کا قاتل ہے ترا حسنِ شباب:
آتشِ افروختہ یکساں ہے خشک و تر کے ساتھ

قلم رو حسنِ عالم گیر کی ہے ربعِ مسکوں میں:
کہ و مہ ہفت کشور میں ہے تابع تیرے فرماں کا

اپنی سپاہ کو برہم کرنے کے عوض، انگریزوں سے دولت سمیٹنے کے لالچ میں، امیر خاں کا حماقت سے اپنی گرم بازاری سے منہ موڑ کر ٹونک کے خرابے کی طرف رخ کرنا:

پسند ہی کنجِ حسن کے گوشے میں چغد کو
شوقِ خرابہ کشورِ آباد سے ہوا

امیر خاں نے انگریزوں پر للچای ہوی نظریں ڈالیں تو انہوں نے اس کی غیرت وحمیت کو ٹونک کے اندھے کنوئیں میں غرق کر دیا:

حسن نے تشنۂ دیدار بہت جب پایا
ڈوب مرنے کے لیے چاہِ ذقن مجھ کو دیا[1]

انگریزوں کی سرپرستی میں آ کر امیر خاں کا اپنی سپاہ پر ظلم ڈھانا :

طرہ اسے جو حسنِ دل آزار نے دیا
اندھیر گیسوے سیہِ یار نے کیا

(غمزہ نیا یہ ترکِ ستم گر نے کیا)

ایک شعر میں دو پہلو ہیں ، ایک تو وہی جس کا اشارہ اوپر کے شعر میں کیا گیا ہے ، اور دوسرا یہ کہ مولوی فضلِ حق اگر ریزیڈنٹ دہلی کے پیش کار نہ ہوتے تو وہ اپنی مخالفت سے سید صاحب اور شاہ صاحب کے معتقدوں کی اتنی دل آزاری نہ کرتے :

حسن اس کو پیش خدمت اپنا اگر نہ کرتا
وہ عاشقوں کے دل کو زیر و زبر نہ کرتا

---

[1] آتش نے ٹونک کو ایک اور جگہ بھی 'چاہِ ذقن' کہہ کر سید صاحب کے قلق کا اظہار کیا ہے :

رہا ہے چاہِ ذقن میں مرا دلِ وحشی :
کنوئیں میں جنگلی کبوتر کا آشیانہ ہوا
(نصیبِ غیر مرے منہ کا اب و دانہ ہوا)

یہ 'غیر' انگریز ہیں -

انگریزوں کے زیرِ تصرف آکر امیر خاں کا ان کے اشارۂ ابرو پر اپنے لشکر کو تہِ تیغ کرانا :

قبضہ ہے اس پر تمہارے حسن سے خوں ریز کا :
کام ابرو کے اشارے سے ہو تیغِ تیز کا

'ترک' :
(سید صاحب)

تجھے ، اے ترک ، زیبا دعوئِ صاحب قرآنی ہے
مگر خنجر ترا لوحِ طلسمِ زندگانی ہے ؟

نقشِ حب ، اے ترک ، جوہر ہے تری شمشیر کا

چلا ہے تیرو کہاں لے کے صید گہ وہ ترک :
خوشا نصیب وہ جو جو شکار راہ میں ہے !

(گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے)

وہ ترکِ چشم دیکھیں ملکِ دل غارت کرے کس کا:
رہا کرتی ہے صف بندی بہت مژگاں کے لشکر میں

(الٰہی بازوئے قاتل میں زورِ دستِ قدرت دے !
روانی ہے اسی کے دم سے آبِ خشکِ خنجر میں)

ہوگی تری رخ سے نہ ، اے ترک ، خوش نما
پہنے پھرے لباس سیاہِ فرنگ سرخ

امیر خاں کے ، انگریزوں کے ایما پر ، لشکر کا کشت و خون کرنے پر سید صاحب کی خجالت :

دیکھا تجھے جو خونِ شہیدان سے سرخ پوش
ترکِ فلک زمیں میں خجالت سے گڑ گیا

ناکامی پر امیر خاں کے لشکر کا قلق :

کام آخر نہ ہوا اپنا صفِ مژگاں سے :
حسرتِ تیر لیے جاتے ہیں ترکستان سے

(الحذر گردشِ چشمِ سیہِ جانان سے !
درہم اک خلق ہے برہم زدنِ مژگاں سے

تیغِ قاتل سے اڑا یوں سرِ شوریدہ مرا
جس طرح سے حرکت گوے کو ہو چوگاں سے)

(انگریز) :

بے دست و پا اودھ انگریزوں کے رحم و کرم پر :

قتل جب چاہے کرے، آتش ، وہ ترکِ جنگ جو :
نے گلے میں ہے زرہ ، نے خود یاں بالاے سر

'خرام' :

خرامِ ناز میں شمشیرِ بتاں کی روانی ہے

اتش ، خرامِ یار بھی ہے دولتِ کثیر :
اکسیر تھا وہ ، خاک میں جس کو ملا دیا

پہلے مصرعے میں سید صاحب پر مولوی فضلِ حق کے اس الزام کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی غرض سرمایہ اندوزی تھی :

کس سر کو ہے یار کی رفتار کا سودا ؟
معراج سمجھتا ہے ، جو پامال ہوا ہے

یہ صدا دیتی ہے خلخال ان کی ہنگامِ خرام :
خاک میں مل جائے ، جس کو حسرتِ پابوس ہے

یار محوِ خرامِ ناز : میں محوِ جمال

یہ 'یار' شاہ صاحب ہیں ، اور 'محوِ جمال' اس عہد کے سب شاعر

چلتا ہے کیا اکڑ کے ابھی سے دمِ خرام ؟
سر کس کا تیرے پاوں پر ، اے نوجواں ، گرا ؟

(لے کر مجھے کنویں میں دلِ خستہ جاں گرا)

اشارہ ہے امیر خاں کی متابعت سے نوخیز فرنگی کی قوت اور رعونت میں اضافے کی طرف۔

امیر خاں کا انگریزوں سے مسابقت کا دعویٰ، جوان کی فوجی نقل و حرکت سے ناکام ہوا:

قد میں تو کرچکا تھا وہ احمق برابری:
مجبور سرو کو تری رفتار نے کیا

انگریزوں کا امیر خاں کو سیدھا کرنا:

بے سبب مشقِ خرامِ ناز صاحب کی نہیں:
کبک کو سیدھا کرو گے پائے کج رفتار سے

انگریزوں کی روز افزوں قوت:

کس کو پیوندِ زمیں کرتی نہیں رفتارِ ناز؟
کون سا سرکش تمھاری ناک پا ہوتا نہیں؟

'چراغ':
(سید صاحب کی تحریک)

لالہ نے روشن کیا کوہ و بیاباں میں چراغ

کون سا دل ہے نہیں کشتہ جو حسنِ گرم کا ؟
بزمِ عالم میں ہے تو، گنجِ شہیداں میں چراغ

ہر ذرہ اک چراغ ہے اپنے غبار کا

گدازِ عشق کی بدولت ، نرم دل شاعروں میں بھی مجاہدوں کا نقیب بننے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے[1] :

قلبِ ماہیت گدازِ عشق سے ہووے اگر
موم ہو کر، کیا عجب، روشن کرے آہن چراغ[1]

شاعر تحریک سے ڈھکی چھپی وابستگی کا دم بھرنے کی بجائے کھلم کھلا میدان عمل میں آتریں :

سامنا کرتا ہے کیا! اس کا شبستاں میں چراغ
مردِ میداں ہے تو نکلے دن کو میداں میں چراغ

[1] ہے تو زن ، رکھتی ہے لیکن ہمتِ مردانہ شمع
آتش

شاعروں کی نیرنگیِ مزاج ، کبھی موم ، کبھی آہن ، کو دیکھنے اور برتنے کا موقع غالب اور مومن سے زیادہ شیفتہ کو اور کون مہیا کر سکتا تھا ؟ ان دونوں کی ، اور ایک حد تک خود اپنی ابتدای زندگی کی ، غیر ہم آہنگ روش انہوں نے اس شعر میں بیان کی ہے:

تم لوگ بھی غضب ہو، کہ دل پر یہ اختیار :
شب موم کر لیا ، سحر آہن بنا دیا

ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جد و جہاد کے مخالف سید صاحب اور شاہ صاحب پر گھر بیٹھے کیا چوٹیں کرتے رہتے ہیں - ہمت ہو تو اپنی آرام گاہ سے نکل کر رزم گاہ میں آئیں -

سید صاحب اور شاہ صاحب کا اشتراکِ فکر و عمل مخالفینِ جد و جہاد کی نظر میں :

یک دلی سے دوسیہ رویوں کی ہو ہنگامہ گرم
آتش افروزی کریں ، باہم ہوں جو روغن ، چراغ

'شمع' :

اگر امیر خاں میں سید صاحب کا مجاہدانہ عزم ہوتا تو وہ انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیتا :

سر کو کٹواتی اگر مجھ سخت جاں کی طرح سے
ڈال دیتی آہنِ گل گیر میں دندانہ شمع

سید صاحب کے تصرف سے شاہ صاحب کا والہانہ سوز وگداز :

لای ہے ایماں یہ کس کا مصحفِ رو دیکھ کر ؟
رکھتی ہے اشکوں سے اپنے سبحۂ صد دانہ شمع

شاہ صاحب کی زبانی سید صاحب کی دعوتِ فکر و نظر کی تبلیغ :

شمعِ مینا سے بھی ، ساقی ، شہر میں کر روشنی
(لالہ نے روشن کیا کوہ و بیاباں میں چراغ)

میرا اندازہ ہے کہ اس شعر کی 'شمعِ سوختہ' غالب اور 'چشم و چراغ' شاہ اسماعیل ہیں :

ہے شمع سوختہ اسی چشم و چراغ کی

بعید نہیں کہ غالب کا یہ شعر آتش کی نظر میں ہو :

تاتفِ شوقِ تو انداختہ جان در تنِ شمع
شرر از رشتۂ خویش است بہ پیراہنِ شمع

سید صاحب کا شاہ صاحب پر ، شاہ صاحب کا غالب پر اثر :

بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع

مجمعے از دل و جان است بہ گردِ درِ دوست :
تودۂ از پرو بال است بہ پیراہنِ شمع

'شمع' :
(شاہ صاحب)

کس ضبط پر شرار فشاں ہے فغانِ شمع !
اک برق تھی ، جو لال نہ ہوتی زبانِ شمع !

مومن

'یار' :
(امیر خاں)

امیر خاں کی انگریزوں سے مصالحت کے بارے میں سید صاحب کا ردِ عمل :

خط نکلنے پر صفا چاہے جو ، یار ، آتش ، کہاں !
صاف ہونے میں ہمارے اب تامل ہوگیا

خط سے رہا نہ حسنِ رخِ یار کا فروغ :
بجھنے نے اس چراغ کے دل کو بجھا دیا

'خط' سے مراد 'خطِ صلح' ہے -

کچھ غم نہ تھا ، ہزار زمانہ خلاف تھا
افسوس ، یار کا نہ موافق ہوا مزاج !

گریزِ یار نے برباد کر دیا ہم کو

(سید صاحب)

بس کہ تھی اس سے عیاں سینۂ عارف کی صفا :
چہرۂ یار کو میں نے دلِ روشن سمجھا

توجہ میں تری ، اے یار ، اثر ہے مومیای کا

آتش ، خرامِ یار بھی ہے دولتِ کثیر :
اکسیر تھا وہ ، خاک میں جس کو ملا دیا

ہے ہر اک دندان دہانِ یار میں دُرِّ یتیم

یہ 'دہانِ یار' سید صاحب کا حلقہ ہے ، جس میں شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی سے 'دریتیم' شامل ہیں ۔ ان کی قوتِ خطابت و مناظرہ کی شان میں شعر کا دوسرا مصرع ہے :

ان لبِ لعلیں سا لعلِ بے بہا ہوتا نہیں

شاہ صاحب اور مولوی عبدالحی کا سید صاحب کی رکاب تھام کے چلنا :

گل گونِ یار چال ہے چلتا بہار کی :
گل ہائے باغ رہتے ہیں اس کے رکاب میں

(شاہ صاحب) :

یار محوِ خرام : میں محوِ جمال

جد و جہاد کی خاطر اسلحہ اندوزی :

ترکِ حسنِ یار کو تیر و کماں درکار ہے

اسی غزل کے ایک اور شعر میں اشارہ ہے کہ انگریز 'مالِ کارواں' مفت ہتھیانے کے درپے ہیں :

قیمتِ دل ان بتوں سے کیا سمجھ کر مانگیے ؟
رہ زنوں کو مفت مالِ کارواں درکار ہے

(انگریز)

گرم ہو کیسا ہی ، کتنا ہی کھنچے دور آفتاب
رو بروے یار ہے اک قرصِ کافور آفتاب

یہاں 'یار' سے میرے خیال میں انگریز مراد ہیں ، جن کے مقابلے میں ان کے حریف امیر خاں کی ساری گرمی اور اکڑ فوں کافور ہوگیی -

کیا جو یار نے کچھ شغلِ برق اندازی
چراغِ زندگیِ خضر تک نشانہ ہوا

انگریزوں کی معمولی سی گولہ باری سے امیر خاں کی ترکی تمام ہوگئی -

آتش

'رہ زن' :

(امیر خاں)

سازِ آوازۂ بدنامیِ رہ زن شدن است :
وائے آن خستہ کہ از پویہ بہ رہ واماند !

نہ ہر کہ خونی و رہ زن بہ پایہ منصور است :
بدین حضیضِ طبیعی ز اوجِ دار چہ حظ ؟

(سید صاحب)

نقاب دار کہ آیینِ رہ زنی دارد
جمالِ یوسفی و فرِ بہمنی دارد

غالب

کیا وہ صحرا کہ جہاں شور نہ ہو رہ زن کا ؟
کیا وہ دریا کہ جہاں پیچشِ گرداب نہیں ؟

شیفتہ

(امیر خاں ، بقولِ سید صاحب)

جسے میں نیک سمجھتا تھا ، مجھ سے بدظن تھا
یقینِ حصر تھا جس پر مجھے ، وہ رہ زن تھا

(سید صاحب ، تعریضی نقطۂ نظر سے)

ایک دن میں منزلِ ہستی سے جا پہنچا عدم :
راہ زن سنتا تھا جس کو ، ہوگیا ہادی مجھے

(انگریز)

انگریزوں کے دانت امیر خاں کے فوجی ساز و سامان پر ، جو انھوں نے بالآخر کوڑیوں کے مول ہتھیایا :

رہ زنوں کو مفت مالِ کارواں درکار ہے

(سکھ)

مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں سکھوں کی خلل اندازی :

گیسوؤں سا نہ کوی رہ زنِ ایماں ہوگا:
خالِ ہندو سے ترے خونِ مسلماں ہوگا

قزاق' :

(مجاہد ، تعریضی پیرائے میں)

منزلِ عشق کی وہ راہ ہے ، رکھتے ہی قدم
بن کے قزاق ، ہر اک حور شمایل دوڑا

'ٹھگ' :

جامۂ تن ہوگیا راہِ عدم میں نذرِ گور :
بوجھ اٹھایا تھا مگر ٹھگ کے لیے اسباب کا ؟

یہ 'ٹھگ' امیر خاں بھی ہو سکتا ہے ، اور انگریز بھی ، چونکہ جد و جہد اس انجام کو دونوں کی ملی بھگت سے پہنچی -

گردشِ چشمِ بتاں سے نہ ہو کیونکر دل غش ؟
ٹھگ مسافر کو ، یقین ہے یہ ، کہ بےہوش کرے

ایک معنی تو یہ نکتے ہیں کہ انگریز جرنیل نے امیر خاں کو اپنی حکمت عملی سے غفلت میں مبتلا کر کے معذور و معطل کر دیا - یہ سید صاحب کے مسمریزی عملِ توجہ پر اس قبیل کی چوٹ بھی ہوسکتی ہے جو ان کے مخالف ، خصوصاً مولوی فضلِ حق ، کرتے رہتے تھے -

ٹھگ کی زلفوں سے سوا حلقے ہیں زلف یار کے:
ابروؤں کی کج ادای تیغِ رہ زن میں نہیں

یہاں شاید امیر خاں کے لشکر پر انگریز فوج کی برتری اور اپنے لشکر پر انگریز فوج سے زیادہ خود اس کی زیادتی کی طرف اشارہ ہے -

'خواب' :

سید صاحب کا حکومت کی بازیابی کا خواب اور اس کی معکوس تعبیر :

آنکھوں میں اپنی دولتِ بیدار ہیں وہ خواب
ہوتی ہیں تیرے وصل کی جن میں بشارتیں

ہو چکی تھی میرے نالوں سے قیامت آشکار
خواب سے سرفتنۂ محشر اٹھا کر رہ گیا

(کہنیوں تک آستینوں کو چڑھا کر رہ گیا)

خواب میں مجھ کو خیالِ نرگسِ مستانہ تھا :
آنکھ کھولی ، تو لبالب عمر کا پیمانہ تھا

امیر خاں کی انگریز دوستی کا خمیازہ :

دوستیِ دشمن کی مژدہ ہے اجل کے خواب کا
آتش

میدان خیال میں سرگرمی :

ہم وہ مجنوں ہیں کہ دل اپنا ہے صحرا ہم کو

فقط تارِ نفس کا ، ذوق ، خطِ جادہ کافی ہے[1]

ہے خطِ جادہ ترا چاکِ گریباں میرا[2]
ذوق

چلتا نہیں آپ اگرچہ اک گام
پر ، میل کی طرح ، رہ نما ہوں
ناسخ

بہارِ گل میں جو دل کو ہوائے صحرا ہے
ہوا ہے روح کو قالب سے اپنے زنداں تنگ

نکل کے خانۂ زنداں سے میں کدھر جاؤں ؟
جنوں کے جوش میں ہے دو جہاں کا میداں تنگ

---

۱ شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو ، کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں
غالب

۲ چاکِ گریبانِ ما سینہ بہ صحرا کشود
بیدل

شوق صحرا کا جو رہتا ہے تو کہتا ہے جنوں :
تیغ کی طرح سے ، میدان میں عریاں چلیے

اُڑ کے پہنچا ، مددِ جوشِ جنوں سے ، واں تک
پانوں پر اپنے میں دیوانہ بیاباں نہ گیا

زنداں میں صحرا کا تصور : گھر بیٹھے تگ و تازُ کی ترنگ :

سنا کرتا ہوں اس کو چھیڑ کر پاؤں سے میں مجنوں :
مری زنجیر کا نالہ ہے افسانہ بیاباں کا
کیا ہے خانۂ زنجیر میں جو یاد صحرا کو
ہوا ہے دوربیں ہر ایک روزن مرے زنداں کا

ہمیشہ تلوے کھجلایا کیے شوقِ بیاباں میں :
رہی نالاں ہمارے پاوں سے زنجیر زنداں میں

اسیری میں بخارِ دل جو نالوں سے نکالا ہے
بہا ہے موم ہو کر آہنِ زنجیر زنداں میں

گرفتاری میں آزادی کی کیفیت رہی حاصل :
رہا جامے سے باہر اپنے میں دیوانہ زنداں میں

آتش

تحریک میں عملی شرکت سے محرومی کا احساس

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
صد حیف، کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا!

میرے قدموں ہی میں رہ جائیں گے، جائیں گے کہاں
دشت میں میرے قدم آبلۂ پا لے کر!

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور، اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور، اور شکستہ پر

اس مرغِ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا
مرغانِ باغ و راغ سے دور، اور شکستہ پر

ذوق

آستیں وہ ہوں کہ مربوط گریباں سے نہیں:
وہ گریباں ہوں جسے قرب نہیں داماں سے

کوتہی کرتے ہیں راہِ دشتِ وحشت میں قدم
آبلہ پای کے ہاتھوں مغزِ سر میں داغ ہے

پار اترا جو کہ غرق ہوا بحرِ عشق میں
وہ داغ ہے جو دامنِ ساحل میں رہ گیا

آتش کو دستِ تیغ سے ممکن ہوا نہ زخم :
بیچارہ مر کے حسرتِ قاتل میں رہ گیا

زنجیر کو بہار میں توڑا ، نہ طوق کو
گردن سے اور پاوں سے ہیں شرمسار ہاتھ

کر چکی تھی موسمِ گل کی ہوا نشتر طلب :
خون جتنا تھا بدن میں جوش کھا کر رہ گیا

کارواں یاروں کا پہنچا منزلِ مقصود میں
میں ، بگولے کی طرح سے ، خاک اڑا کر رہ گیا

نہ پوچھ حال مرا : چوبِ خشکِ صحرا ہوں :
لگا کے آگ مجھے ، کارواں روانہ ہوا[1]

رہ گیا شوقِ منزلِ مقصود :
پائے خفتہ نے سرگرانی کی

آتش

---

[1] در بیابان ، مثلِ چوبِ نیم سوز
کاروان بگذشت ، و من سوزم ہنوز

اقبال

ضعف سے طاقتِ رفتار نہیں ہے ، ناسخ !
دیکھوں حسرت سے نہ کیوں خارِ بیاباں کی طرف؟

فصلِ گل میں بھی نہ زندانِ تعلق سے چھٹا :
ناتوانی سے مرا طوقِ گریباں رہ گیا

کہاں پرواز کی ، اے ہم صفیرو ، ہم نے گلشن میں ؟
قفس میں ہی پھڑکنے کو ہوئے ہیں بال و پر پیدا

ناتواں ایسے ہیں ہم ، سایہ گلوں کا جو پڑے
نکہتِ گل سے نہ جنبش ہو گلستاں میں کبھی

ہم ہیں وہ وحشیِ عریاں ، نہ اگر قتل بھی ہوں
لہو اپنا لگے قاتل کے نہ داماں میں کبھی

ناسخ

تحریک کی کامیابی کے بارے میں شکوک

سکھوں کے خلاف جدو جہاد کے اغراض و مقاصد سے اتفاق کے باوجود ، اس کی کامیابی کے بارے میں سب شاعروں کے دل میں شروع سے شکوک تھے جو وہ سب ، تحریک کے مختلف مرحلوں میں ، اپنے اپنے طریقے سے ظاہر کرتے رہے :

گرمِ جولاں مرے مرقد پہ تم آتے کیوں ہو ؟
اپنے دل سوختہ کی خاک اڑاتے کیوں ہو ؟

توڑنا جان کا ہو جائے گا مشکل آخر
چارہ سازو ، مری اُمید بندھاتے کیوں ہو ؟

ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا
بس ، اے خرامِ ناز ، کہ تاب و تواں نہیں !

اے آہ ، آسماں میں عبث رخنہ گر نہ ہو :
ڈرتا ہوں میں نزولِ بلا بیش تر نہ ہو

درد ہے ، جاں کے عوض ، ہر رگ و پے میں ساری :
چارہ گر ، ہم نہیں ہونے کے ، جو درماں ہو گا

مومن نے ایک جگہ مولوی فضلِ حق کے مسلکِ صلح کل[1] کی ترجمانی بھی کی ہے :

مومن ، نہ توڑ رشتۂ زنارِ برہمن :
مت کر وہ بات جس سے کوی دل شکستہ ہو

مگر ان کا اپنا مسلک دراصل داعیانِ جہاد ہی کا تھا :

اپنا شریک بھی نہ گوارا کرے ، بتو!
مومن کو ضد جو کیشِ بدِ برہمن سے ہے
مومن

ہم نے جانا تھا جب ہی ، عشق نے مارا اس کو
تیشہ فرہاد نے جس وقت جبل میں مارا
ذوق

توسنِ ناز اٹھاتے کیوں ہو ؟
خاک میں شہر ملاتے کیوں ہو ؟

حاصل اس سلسلہ جنبانی سے
پاے خوابیدہ جگاتے کیوں ہو ؟

اضطرابِ جرس ہے کیوں دل کو ؟
کہیں جنبش ہوی ہے محمل کو ؟

---

[1] صلح کل اپنی تو دانست میں بے معنی ہے
شیفتہ

ہائے وہ شیفتہ کی بے تابی :
تھام لینا وہ تیرے محمل کو!

صحرا بنا رہا وہ ، افسوس ، شہر کو
صحرا کو جس کے جلوے نے گلشن بنا دیا

شیفتہ

اس حسن ِ عقیدت کے پہلو بہ پہلو جو غالب داعیان ِ جد و جہاد سے رکھتے تھے ، ان کی تحریک کے ناقابل ِ عمل ہونے کا اظہار بھی وہ شروع ہی سے کرنے لگے :

نہیں ممکن ، بہ جولاں ہائے گردوں ، دخل ِ بے بردن

یعنی ، انگریزوں کی فوجی نقل و حرکت کے باعث امیر خاں کا منزل ِ مقصود تک پہنچنا ممکن نہیں - ہم نسخۂ بھوپال سے کچھ ایسے شعر درج کرتے ہیں جن میں امیر خاں کی سپر افگنی پر واویلا کرنے اور جد و جہاد کا از سر ِ نو منصوبہ باندھنے کو بے سود ٹھہرایا گیا ہے ، اور از روے دور اندیشی ، تاریخ کے ناگزیر عمل کے تقاضے سے ، عجز و تسلیم کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی گیی ہے :

خراب آباد الفت میں عبث افسوس ِ ویرانی

پیچ و تاب جادہ ہے خط ِ کف ِ افسوس و بس!

دیکھتا ہوں وحشتِ شوقِ خروش آمادہ سے
فالِ رسوای سر شکِ سر بہ صحرا دادہ سے

عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم[1]

دل کو ، اے عاشق کُشاں ، تعلیمِ خارای عبث

عالمِ تسلیم میں ہے دعوی آرای عبث

اسد ، ساغر کشِ تسلیم ہو گردش سے گردوں کی

اسد ، سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر

اسد ، بہ نازکیِ طبعِ آرزو انصاف
کہ ایک وہمِ ضعیف ، و غمِ دو عالم ہے

نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

'سرِ رشتۂ سلامت' میں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ مسلکِ عافیت میرزا کے مصلحت اندیش 'مربی'، دہلی ریزیڈنسی کے سر رشتہ دار ، مولوی فضلِ حق کا سجھایا ہوا ہے - یہی مخرج اس قبیل کی ساری

---

[1] یہی بات فارسی کے ایک مصرعے میں کہی ہے :
عبث در آب و آتش رانده ای بازار گانان را

ناقین کا ہے :

مت رکھ ، اے انجام غافل ، سازِ ہستی پر غرور :
چیونٹی کے پر سر و برگِ خود آرای نہیں

غالب نے ایک اردو قصیدے میں سید صاحب کی بے سرو سامانی کے باوجود ، ان سے اصلاحِ احوال کی توقع کا بھی اظہار کیا ہے :

غمِ عجز کا سفینہ بہ کنارِ بے دلی ہے[1]
مگر ایک شہ پرِ مور کرے سازِ بادبانی

سفینۂ عجز کا کنارِ بے دلی پر پہنچنا اشارہ ہے امیر خاں کے لشکر کے تتر بتر ہونے کے بعد اس کی دل شکستہ سپاہ کا جمنا کے کنارے ڈیرا ڈالنے اور سید صاحب کا اس کا حوصلہ بڑھانے کی طرف ۔

چیونٹی کے طعنے کا جواب بہت بعد میں فارسی میں دیا گیا ہے :

بر برق چشمک می زنم: مورم بہ خرمن گشتہ جمع

غالب نے وکٹوریا کے نام اپنے ایک فارسی قصیدے میں اس کے

---

[1] کشتی بے ناخدایم : سرگذشتِ من مپرس :
از شکستِ خویش بر دریا کنار افتادہ ام

امان کے اعلان کو چیونٹی کی زبان سے یوں ٹھکرایا ہے :

آن مورِ سر کشم ، کہ چون مرگش امان دہد
از ننگِ پایمال بہ پرواز جان دہد

انگریزوں کے لیے یہی جذبہ سید صاحب بھی رکھتے تھے ، گو ان کے شریکِ کار امیر خاں نے جاں بازی پر 'ننگِ پایمال' کو ترجیح دی -

غالب نے سکھوں سے ٹکر لینے کے مقصد کو ایک جگہ 'سعیِ بے حاصل' ٹھہرایا ہے ، چونکہ معروضی صورتِ حال اس کے لیے سازگر نہیں :

طاقت فسانۂ باد : اندیشہ شعلہ ایجاد
اے غم ، ہنوز آتش! اے دل ، ہنوز خامی !

اسی قسم کی روک تھام فارسی کلام میں بھی بار بار ملتی ہے :

اے حسن ، گر از راست نہ رنجی ، سخنے ہست :
ناز این ہمہ ، یعنی چہ ؟ کمر ہیچ و دہان ہیچ !

پشیمان می شوی از ناز : بگزر زین گران جانان

بگزر از دشمن : دلش سخت است ، سخت :
آبروے تیر و پیکاں می رود

مگر اس مجاہدانہ سرگرمی کی ، جو انتہای نامساعد حالات میں بھی آخر دم تک جاری رہتی ہے ، غالب کے دل میں بڑی قدر و منزلت تھی :

شکستِ ما بہ عدم ہم چنان پیداست
بہ صورتِ سرِ زلفے کہ از کمر گزرد

ہلاکِ نالۂ خویشم ، کہ در دلِ شب ہا
دود بہ عربدہ ، چندان کہ از اثر گزرد

۴

غالب

آداب معنی شناسی

رمز بشناس ، کہ ہر نکتہ ادائے دارد :
محرم آن است کہ رہ ، جز بہ اشارت ، نہ رود

راز زین دیدہ وران جوے ، کہ از دیدہ وری
نقطہ گر در نظر آرند ، سویدا بینند

ہر چہ در دیدہ عیان است ، نگہش دارند :
ہر چہ در سینہ نہان است ، ز سیما بینند

سخن گرچہ پیغام راز آورد
سرود از چہ در اہتزاز آورد

بہ دانش توان پاس دم داشتن :
شمار خرام قلم داشتن

بود در شمار شناسا وری
خرد را بہ گفتار ہم جوہری

'ہمہ کوشش در آن رود' کہ جوہرِ لفظ را شناسند ، و فروغِ معنی را بنگرند ، و سرہ را از ناسرہ جدا کنند ۔'

'گفتار جز بہ گفتار سرہ نہ گردد ، و سخن جز بہ **سخن** شناختہ نہ شود ۔'

'بدان ، اے ہوش مندِ سخن پیوند ، کہ نامہ نگار . . . اگر مطلبے چند داشتہ باشد ، در تقدیم و تاخیر ژرف نگاہی بہ کار برد ۔'

'چون میانہ' دل و زبان جز اندیشہ حجابے نیست، و آن پردہ تنک بود ، ہر آینہ ہر چہ بہ درون سو روے دادے ، نگرندہ آن را از برون سو نگرستے ۔'

'جیسے آبگینہ' مے سے رنگِ مے نظر آے ، لفظ سے جلوۂ معنی آشکار رہے ۔'

'اگر از داخلیات گفتہ آید. . . . و اگر از خارجیات **سخن** راندہ شود. . . .'

'سخن ہر آینہ پر توِ آفتابِ ذاتِ سخن ور است ۔'

'گفتارِ موزون ، کہ آن را شعر می نامند ، در ہر حال جاے دیگر ، و در ہر دیدہ رنگے دیگر ، و **سخن** سرایان را ہر زخمہ جنبشے دیگر ، و ہر ساز آہنگے دیگر دارد ۔ از دید و دانستِ دیگران چشم پوشند ، و در افزونیِ آگاہیِ خویش کوشند ۔'

غالب فہمی کے بعض لوازم

'تفہیمِ غالب کی ابجد یہ ہے کہ سب سے پہلے ان کو ان کے تہذیبی پس منظر میں دیکھا جائے، اور سراغ لگایا جائے کہ وہ کون سی قدریں تھیں جن کے سائے میں غالب نے پرورش پائی اور جن کے ساتھ فطرتاً ان کے جذبات و احساسات وابستہ ہوئے؛ پھر دیکھا جائے کہ بالغانہ فن کاری کے دوران غالب کا رشتہ ان تہذیبی قدروں کے ساتھ کیا رہا: ان کا ذہنی ردِعمل اپنی تشکیلی قدروں کے متعلق کیا ظاہر ہوا، اور ان کی شاعری کے تارو پود کن نقوش و استعارات، اشارات و علایم سے مرتب ہوئے؛ اور ان کے مطالب و مضمرات کا مرجع یا حوالہ کیا ہے۔ جب تک ان علمی و اصولی سوالوں کے حقیقت پسندانہ جوابات حاصل نہیں کیے جاتے، غالب کی شاعری کو صحیح معنے میں نہ سمجھا جا سکتا ہے، نہ سمجھایا جا سکتا ہے...

کسی موضوع پر ایک شاعر کے حقیقی خیالات جاننے کے لیے محض اس کے منفرد اشعار سے کھیلنا کافی نہیں... اس سلسلے میں صحیح طریقِ فکر یہ ہے کہ سب سے پہلے تو شاعر کے تمام اشعار کا بالاستعیاب اور مرتب و منظم مطالعہ کیا جائے۔ اس کے بعد اس کو اس کے دور اور ماحول میں رکھ کے دیکھا جائے، اور ان قدروں کا سراغ لگایا جائے جو اس دور

اور ماحول میں رائج تھیں ۔ ساتھ ہی ان نقوشِ کلام پر نظر رکھی جائے جو مروج ہوں ، اور ان کے مضمراتِ ذہنی کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے ۔'

عبدالمغنی : 'عظمتِ غالب کی حقیقی بنیاد' 'نقوش' غالب نمبر ۲

'اصل نقادی یہی ہے کہ نگاہ ایک ایک لفظ میں پھرے ، اور معلوم کرے کہ وہ شعر میں کس غرض سے لایا گیا ، اور مضمونِ شعر کی ترکیب و توضیح میں اس کا مقام اور اس کی حیثیت کیا ہے ۔'

غلام رسول مہر : 'میرزا غالب نقاد کی حیثیت سے'

غالب کے خارجی موثرات اور بعض ناقد

اس مبحث پر جو خیالات ظاہر کیے جاتے رہے ہیں ، ان کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے ہو جائے گا :

'اس میں کوی شک نہیں کہ غزل گو شاعر پوری زندگی کے مظاہر و مناظر دیکھنے کی بجائے صرف اپنے دل کی دنیا میں جھانکتا ہے... غالب ، مومن اور اُن کے معاصر شعرا دقیقہ سنج بھی ہیں اور نکتہ پرداز بھی - انھوں نے ہمارے علمِ ذات میں اضافہ کیا ہے ... لیکن کیا اس سے کوی انکار کر سکتا ہے کہ ان کی فنی تخلیقات میں خارجی دنیا کے عوامل اور حوادث اس طرح نہیں جھلکتے جس طرح ایک باشعور فن کار کی تخلیق میں جھلکنے چاہییں ؟'

سید عابد علی عابد : ''شعرِ اقبال''

'غالب کے سامنے اُس وقت (عنفوانِ شباب میں) زندگی کی بڑی قدریں نہ تھیں ، نہ اُن کے گرد و پیش فضا میں کوی گہرا جذبہ تھا ' پروفیسر آلِ احمد سرور : ''نئے اور پرانے چراغ''

'غالب جس سماج کے فرد تھے ، اس سماج میں باغیانہ میلان اور آزادی کا جذبہ داخلی طور پر تصوف ہی میں نمایاں ہوسکتا تھا ، لیکن غالب کو کوی خارجی سہارا آزادی کے لیے حاصل

نہ تھا - کوئی علمی یا ادبی تحریک ، جس سے وابستہ ہو کر وہ اپنے طبقے کے ماحول میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود آگے بڑھ جاتے ، موجود نہیں تھا - وہ زمانہ کچھ دن بعد آیا'۔

سید احتشام حسین : 'غالب کا تفکر'

'اُن (غالب) کی شاعری میں اُن کے عہد کی سیاسی خلفشار کی داروگیر بھی نہیں ملتی . . . اُن کی اُردو شاعری میں سیاسی نقش و نگار پانے والے ان کی فارسی شاعری میں یہ باتیں کیوں نہیں تلاش کرتے یا کیوں نہیں پاتے؟ اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں کوئی ہرج نہیں کہ غالب کی شاعری میں اُس وقت کی سیاسی یا اقتصادی افراتفری کا کوئی قابلِ لحاظ نشان نہیں ملتا -'

پروفیسر رشید احمد صدیقی : 'کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!'

'اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کے کلام میں ان کے یا کسی اور عہد کی تصویر یا ترجمانی ملتی ہے - اس کی ذمہ داری غزل نہ پسند کرتی ہے ، نہ قبول' -

پروفیسر رشید احمد صدیقی : 'نقوش' غالب نمبر ۱

'اجتماعی یا قومی زندگی کے معاملے میں غالب کی شاعری صفر ہے -'

سید ہاشمی فرید آبادی

'اقبال نے (عالمِ بالا میں) 'تقدیرِ اُمم' پر تقریر شروع کی ، تو افسوس ! غالب کے خراٹے لینے کی آواز آنے لگی ۔'

پروفیسر احمد شاہ بخاری : 'ماہِ نو' اکتوبر ۱۹۴۹

'فن کو بحیثیتِ فن مطالعہ کرنے والے اور اس کی داد دینے والے کے لیے غالب کا فارسی کلام ایک گنجینہ بے بہا ہے ، لیکن اگر اس کو حقیقت کے معیار سے جانچا جائے تو سوختنی معلوم ہوتا ہے ۔'

خلیفہ عبدالحکیم : ''افکارِ غالب''

'غالب نہ کوئی فعال سوجھ بوجھ رکھتے تھے ، اور نہ ان میں کوئی واضح تاریخی شعور تھا ۔'

ڈاکٹر عقیل احمد : 'نقوش' غالب نمبر ۳

'شیخ محمد اکرام نے غالب کو 'حکیمِ فرزانہ' قرار دیا ہے ۔ ۔ ۔ حکیمِ فرزانہ یا نفسیاتی کیفیتوں کا نباض ہونا بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ اس کے یہاں کوئی بنیادی سرچشمہ' فیضان نہیں ۔'

'ماہِ نو' فروری ۱۹۶۴

بعض اہلِ نظر ناقدوں نے غالب کے فکر و جذب کے مخرج کے بارے میں تجسس کا اظہار کیا ہے :

(غالب) ہندوستانی سماج کے دورِ انحطاط سے تعلق رکھتے تھے ، یعنی ایسے انحطاط سے جو ہر طبقے کو بے جان بنائے ہوئے تھا ، لیکن ان کی فکر میں توانائی اور تازگی ، ان کے خیالوں میں بلندی اور بے باکی غیر معمولی طور پر پائی جاتی ہیں - اس توانائی کا سرچشمہ کہاں ہے ؟ اس طبقے اور اس کے نصب العین میں تو ہرگز نہیں ہو سکتا جس سے غالب کا تعلق تھا ؛ پھر اس کی جستجو کہاں کی جائے ؟ کیا یہ سب کچھ تخیلِ محض کا نتیجہ ہے ؟'

سید احتشام حسین : 'غالب کا تفکر'

'خارجی حقیقتوں کی ، غزل گو شاعر کے ادراک اور شعور میں جذب ہو چکنے کے بعد ، کچھ ایسی قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے ، کہ ان کا اصلی رنگ پہچاننا خاصا دشوار ہو جاتا ہے - اس کے لیے بہت سے حجابات کو اٹھانا پڑتا ہے ، اور شاعرانہ اشاریت اور خارجی موثرات کے درمیان مطابقت قائم کرنے کے عمل میں حزم و احتیاط برتنی پڑتی ہے - قیاس چاہتا ہے کہ اردو کے غزل گو شعرا اپنے عہد کے تاریخی ، سیاسی اور معاشی میلانات اور تحریکات کا ضرور شعور رکھتے ہوں گے -'

پروفیسر اسلوب احمد انصاری : 'کلامِ غالب کا ایک رخ'

'جب غالب کے اشعار کو پڑھا جائے تو قاری کو فی الفور

احساس ہوتا ہے ، کہ وہ انیسویں صدی کے وسط میں ہونے والے کسی شخص کا کلام نہیں پڑھ رہا ، بلکہ بیسویں صدی کے ایک حساس اور باشعور فرد کے خیالات سے مستفید ہو رہا ہے ۔ غالب کو یہ سیاسی اور سماجی شعور کہاں سے ملا ، اور کن محرکات نے ان کے شعور کو صیقل کیا ؟ شاید ابھی ایک طویل مدت تک اس کا کوئی سراغ نہ مل سکے ۔‘

ڈاکٹر وزیر آغا : ’صحیفہ ، جنوری ۱۹۶۹

یہ مسئلہ ان ناقدوں کے ذہن میں تو ابھرا ، اور بعض نے اس کے نظری پہلو سے بحث بھی کی ۔ مگر آج تک کسی نے نہ کلام سے خارجی مؤثرات اخذ کیے ، نہ یہ سراغ لگایا کہ جو شعور کلام میں جاری و ساری ہے ، آخر وہ آیا کہاں سے ۔

فیض نے ایک جگہ مصنف کی ذہنی اور قلبی واردات کے سرچشموں کی تحقیق اور دریافت‘ کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا ہے ۔ فراق نے ’غالب کے کلام کے ’نکیلے پن اور اس کی دھار‘ کا ذکر کیا ہے ۔ مگر یہ کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی کہ یہ ’نکیلا پن‘ کس سان پر چڑھ کر آیا ہے ۔ غالب کا ایک مصرع ہے :

خود مست رفت ، و بردگران ترجمان نہاد

فراق نے شاید غالب ہی کی تھاہ پانے کا دعویٰ کیا ہے :

نگاہِ مست ، تری تھاہ کوی پا نہ سکا :
فراق ہی کی نظر ہے جو تہ بہ تہ جاے

مگر میرے علم میں انھوں نے اپنی تہ بینی کی کوی تحریری شہادت بہم نہیں پہنچای ۔

چھپنے سے پہلے ان اوراق پر آخری بار نظر ڈالتے وقت ایک تحریر ایسی بھی میری نظر سے گزری جس میں تحریکِ جہاد و اصلاح سے غالب کے 'ایک خاص ربط' کا بالصراحت دعویٰ کیا گیا ہے :

'تاریخی اور تہذیبی ماحول کی نسبت سے غالب کی فنی اور فکری نشو و نما کا خیال کرتا ہوں تو مجھے غالب کے کارنامۂ فن اور ان کے ہم عصر علماء دین کی اصلاحی اور انقلابی جدوجہد میں ایک خاص ربط نظر آتا ہے ۔ اس اعتبار سے غالب کی شاعری اس عہد کے ہندی مسلمان کی اجتماعی ، ذہنی اور سیاسی فکر و عمل کا فنی اور جمالیاتی تکملہ ہے۔ . . غالب کی اندرونی زندگی کی شادابی اور شاعرانہ شخصیت کی توانای اور دل کشی کا سرچشمہ علماء حق کی تحریکِ اصلاح و جہاد میں ہے ۔'

فتح محمد ملک : 'غالب کے بغیر' 'فنون' غالب نمبر اور سالنامہ ۱۹۶۹

یہ بصیرت بڑی قابلِ داد ہے ، اور اس سے بھی بڑھ کر داد کی مستحق ہوتی اگر ناقد نے اس تک رسای کا ثبوت کلام سے برآمد کر کے پیش کیا ہوتا ۔ اور تحریک سے غالب کے 'ربط' کی مخصوص نوعیت بھی اسی صورت سے واضح کر دی ہوتی -

---

غالب کی واردات اور فکرِ سخن کا ایک سرچشمہ

غالب نے اپنے سرچشمۂ فکر کے بارے میں اپنے فارسی کلام کے دیباچے میں یہ سوال خود اٹھایا ہے

"کہ ہیچ مدانے را این مایہ سیرابیِ نطق از کجاست ۔ ۔ ۔ کہ تیرہ سرانجامے را این ہمہ روشنائیِ گفتار چراست ؟"[1]

اور خود ہی اس سوال کا جواب دیا ہے :

'از من' کہ در پےِ این فروہیدہ کاروان و گزین بادیہ نوردان از دنبالہ روانم[2] ، فراوان درود باد ! ۔ ۔ ۔ اگر آشکارا بنیان خردہ نہ گیرند ، گویم کہ یکے از ایشانم ، و بالجملہ روے سخن بدیشان است ۔ ۔ ۔ خوے را بہ مہرِ راہ نشینانِ این مرحلہ پیوندے بودہ باشد ۔ ۔ ۔ روزے کہ شمارۂ سنینِ عمر از احاد فرا ترک رفت ۔ ۔ ۔ تا امروز کہ ۔ ۔ ۔ آثارِ شصت و ششم است ، ہنوز شخصِ اندیشہ کیخسروِ این جام و افلاطونِ این خم است ۔ ۔ ۔ پرویز[3] کجاست تا بنگرد کہ درین رہ روی کدام رہ سپردہ ام ، و بہرام[3] کجاست تا فرا رسد کہ سخن را

---

[1] یا رب ، این گوہر معنی کہ فشانم ، ز کجاست ؟

[2] حریصِ جلوہ نگہ از ہجومِ لالہ و گل
چون آن گداے کہ دنبالِ کاروان گیرد

[3] پرویز اور بہرام سے اشارہ ہے سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی طرف ۔

از کجا بہ کجا بردہ ام :

خسروی بادہ درین دور اگر می خواہی
پیشِ ما آے ، کہ تہ جرعہٴ این جاسے ہست

'فروہیدہ کاروان' کے جن دو 'گزبن بادہ نوردان' کی طرف بالخصوص 'روے سخن' ہے ، اور جن کے عقب میں رواں ہونے کے غالب دعوے دار ہیں ، ان کی صفات انھوں نے یوں بیان کی ہیں :

فرۂ ایزدی ، کہ چندے را بہ نام آوریِ شکوہِ عز و غنا از سیما درخشیدے ، و اندے را بہ نشان مندیِ فقر و فنا فروغ بخشیدے ، مظہرے کامل و مراتِ روشن خواست تا دران مظہر ظہور بہ ہر دو رنگ ، و دران مرات رویت بہ ہر دو صورت . یک بارہ رو دہد ۔ اورنگ و منبر یکے شد ، و سادہ و سجادہ را دوی از میان رفت . . . بہ یک دگر خوردنِ این دو قدح مجمع البحرینے پدید آورد ، و سر بر آوردنِ این دو قوس نقشِ دایرہ پدیدار کرد ۔ از سر جوشِ فروغِ مہر و ماہ بافشردن و پالودن و سرشتن پیکرے ساختند ۔'

یہ 'مجمع البحرین' ، یہ 'دو قوس' جن کے سر جوڑنے سے 'نقشِ دایرہ' پیدا ہوا ، سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید ہیں ، اور یہ 'دایرہ' ان کے مسلک فقر و فنا کے پیرو کاروں کا ہے ۔

اس مسلک سے ہم فکری کے باوصف ، اس پر جادہ پیما نہ ہو سکنے کی وجہ بھی انھوں نے صاف صاف بیان کر دی ہے ۔

'بہانا بزمِ آنسِ فرزانہ' یگانہ در اندیشہ می گزرانم و ، خود را با خواجہ ہم نشین و ہم سخن اندیشیدہ ، بہ زبانِ خامہ ، کہ ہمچون دلِ نگارندۂ نامہ ، دو نیم است ، داستانِ دردِ دل فرو می خوانم : حیف کہ خواہشِ دوست کام روای نہ یافت ، و خدمتے کہ می خواستند سرانجام نہ پذیرفت ۔ روای یافتنِ خواہش و پذیرفتنِ خدمت آن می خواست کہ خامہ بے راہ نہ پوید ، و بہ فروغِ گوہرِ شب چراغِ سخن بہ ظلمت کدہ راہ جوید ۔'

غالب کا ایک مصرع ہے :

مبین بہ زخمہ ، و جنبش نگر کہ آن ز کجاست

دنی جگہ انھوں نے بیرونی محرکات سے بے نیازی کا دعوی بھی کیا ہے :

من کہ با ساقی ز والای فرو ناید سرم
آفتاب آسا ، بہ زورِ خویش گردد ساغرم

ممنونِ کاوشِ مژہ و نیشتر نہ ام :
دل موجِ خون ز دردِ خدا داد می زند

مگر ، اس خود کفالتی کے دایرے میں ، 'ہم نشینی' اور 'ہم زبانی' کے بعض اثرات کا اقرار بھی موجود ہے :

'ہر آینہ اہرمن پرست و کافرستم ، نورِ درخشندۂ ہور بہ نزدیک و دور بخشندۂ سور است ... ہنجار و روشِ خود از نیرو ہاے درونی ست : آموزش را درین پردہ راہ نیست ، و اگر گویند کہ ہست ، ہر آینہ می توانم گفت کہ نیست ، مگر بہ ہم نشینی و ہم زبانی ۔'

اندر اور باہر کی جس شہادت تک ہماری رسای ہے ، اس کی بنا پر یہ اشارہ موثرات کے ان ہی دو دھاروں کی طرف ہوسکتا ہے جو ان کے شعور اور کلام میں دو مختلف سمت بہتے رہے : ایک طرف وہ جس کا سرچشمہ سید صاحب اور شاہ صاحب تھے ، اور دوسری طرف وہ جس کا مخرج مولوی فضلِ حق تھے ۔

غالب جس طرح اپنے منظوم کلام میں مسلکِ فقر و فنا کا دم بھرتے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق طلب کرتے رہے ، اسی جذبے کا انھوں نے نثر میں بھی اظہار کیا ہے :[1]

'بو کہ از مےِ مرد افگنِ آن خمستان (مے خانۂ نیستی) پارۂ بہ سفالم ریزد ، تا بہ سرمستیِ آن بادۂ روشن انبوہے نمایشِ آز و آرزو از ہم پاشد ، و نمودِ بے بود از پیشِ نگاہ برخیزد!'

[1] 'عقیدت در ہر رنگ جگر تشنۂ ذوقِ اظہار است'

غالب

عسکری آہنگ اور اس کا مخرج

بہ اقبالِ ایمان و نیروے دین
سخن رانم از سید المرسلین

زبان تازہ سازم بہ نیروے بخت
بہ ذکرِ شہنشاہِ بے تاج و تخت

آبای ورثہ :

غالب ، بہ گہر ز دودۂ زاد شمم
زان رو بہ صفاے دمِ تیغ است دمم

چون رفت سپہ بدی ، زدم چنگ بہ شعر:
شد تیرِ شکستۂ نیاگان قلمم

سید صاحب کا تصرف :

میراث رسید است ز خونین نفسانم

آباے مرا تیغ ، و مرا کلک بہ ساز است
دستے است جدا گانہ بہم کارِ ہمم را

دریاب ، کز الماس بود جوہرِ تیغم
ہرچند بہم برزدہ بینی دم و خم را

آن کس کہ شناسائے آہن بودش خوے
جوہر نگرد تیغِ فرو ریختہ دم را

زہے ز رتبہ ملقب بہ سید الشہدا!

بیان ز حزمِ تو صورت کشائے صلح و صلاح
نشان ز عزمِ تو معنی نمائے جد و جہاد

من سخن گوے عطارد دمِ ناہید نشید

از تو آید کہ فزای نفسم را نیرو:
از من آید کہ دسم در تنِ اندیشہ روان

از لبم مصرعۂ برجستہ پر آید در وجد
بہ ادائے کہ رود تیرِ تو بیرون ز کمان
تیزیِ فکرِ من از تست......

'آہنگِ عربدہ' سے گریز کی توجیہ:

شیفتہ/حسرتی کے نام ایک خط میں یہ اعتراف ملتا ہے:

'ہر چند درازنفسیِ خواہش در آغازِ حال بہ خروشم آوردہ بود، و می خواست کہ خواہی نخواہی غبارِ نالہ بہ پردۂ

گوشِ الہام نیوش نشاند ، اما دور اندیشیِ فطرت با خودم در ستیز افگند ، و پس ازان کہ بر افتادنِ پردہ از روے کار و آشکارا گشتنِ رازِ نارسایِ فہم و ناتمامیِ دانشِ من بر ہم نفسان خاطر نشانِ من شد ، مرا از آہنگِ عربدہ باز آورد ، و مہرِ خموشی بر دہان نہاد ۔

کلیاتِ شیفتہ و حسرتی ، نظامی پریس، ۱۹۱۶

’آہنگِ عربدہ‘ سے باز رہنے کی جو توجیہ اس خط میں کی گئی ہے ، وہ مدافعانہ انداز میں غالب اپنی نظم اور نثر میں برابر کرتے رہے ۔ اس کی دو مثالیں دی جاتی ہیں :

’کیست تا از من پرسد ، و اگر نا پرسیدہ گویم در دلش فرود آید ، کہ درین سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزش ہا روے دادہ ، و پس‌ازان کار بدان جا رسیدہ کہ از کوفتگیِ ہمدگر فرو مانند ؟‘

’گفتم : درویش باشم ، و آزادانہ رہ سپرم ۔ ذوقِ سخن ، کہ ازل آورد بود ، راہ زنی کرد ، و مرا بدان فریفت کہ آینہ زدودن و صورتِ معنی نمودن کارِ نمایان است. . . صوفی گری بگزار ، و بہ سخن‌گستری روے آر ۔ ناگزیر ، ہم چنان کردم ، و سفینہ در بحرِ شعر ، کہ سراب است ، روان کردم : قلم علم شد ، و تیر ہاے شکستہ‘ آبا قلم ۔‘

'غالب ِ گسستہ دم'

'تا بہ نمودِ بے بودِ خویشم شناسا کردند ، پندارِ پیدای نہ ماند ، و گمانِ ہستی برخاست[1]. . . دلے ، کہ گوی نہ داشتم، از ہم پاشید ، و بندے ، کہ پندارم نہ بود ، فرو ریخت - لا جرم روان افسرد و آن ورزش سر آمد - روزگارے است کہ خاکم بے غبار است ، و آتشم بے دود -'

'بہ تنہا روے مانم کہ در صحراے پایش بہ گل فرو رود ، و ہر چند خواہد کہ بالا جہد ، نہ تواند ، و فرو تر رود -'

'جانے کہ الطف اجزاے آن بہ تحلیل رفتہ ، و کدورتے چون درد از بادہ و خاکستر از آتش ، وا ماندہ است ، اگر بہ پاے دوست افشانم ، ترسم کہ پاے ناز نینش رنجہ گردد ، و اگر آمادۂ این نثار نہ گردم ، در عالمِ مہر شرمسار بودہ باشم -'

---

[1] یہ اشارہ ہے مولوی فضلِ حق کے 'نمودِ بے نمود' کے تصور کی طرف ، جس سے غالب اثر پذیر ہوے ، اور انھیں اپنی بے عملی کا ایک فکری جواز ہاتھ لگا -

سید صاحب اور غالب

دستِ پنہان و قلم بین ، خط گذار :
اسپ در جولان ، و ناپیدا سوار

پس یقین در عقلِ ہر دانندہ است
این ، کہ باجنبیدہ جنبانندہ است

رومی

مبین بہ زخمہ، و جنبش نگر، کہ آن ز کجاست

جنبشِ خاکم ز ہوائے شہ است
جوہرِ نامم من ، و شہ جوہرے است

عزمش بانگ بر اشہب زند
قافلۂ خور بردلِ شب زند

غالب

نو دریافت بیاض کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرزا کے روحانی اتالیق اور سرپرست[1] شاہ اسماعیل انھیں سید صاحب کے

---

[1] بہرِ پروردن سراسر لطف گستر سایہ ہے :
پنجۂ مژگاں ، بہ طفلِ اشک ، دستِ دایہ ہے

یہ 'پنجۂ مژگاں' شاہ صاحب کا پنجہ ہے ، جن کے مژگاں سے شہید ہونے کے غالب عمر بھر آرزو مند رہے ، اور 'طفلِ اشک' نو عمر میرزا ہیں ، جنھیں ، تہذیبِ نفس کے مرحلے سے گزار کے ، مردِ مجاہد بنانے کی کوشش میں وہ دیر تک لگے رہے -

حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کی ترغیب دے رہے ہیں - یہ شروع ۱۸۱۸ کا وہی زمانہ ہے جس میں ، ولی اللہی خاندان کی تقلید میں' مومن اور ذوق سید صاحب کے سلسلے میں شامل ہوئے' :

اے اسد ، واشدنِ عقدۂ غم گر چاہے
حضرتِ زلف میں ، جوں شانہ ، دلِ چاک چڑھا

سید صاحب سے اظہارِ ارادت مندی سے لے کر اس کے مضمرات سے عاجز آنے اور آن سے عملاً گریز کرنے تک ، میرزا جن جن کیفیتوں سے گزرے ، ان کی روداد کچھ نئی بیاض اور کچھ نسخۂ بھوپال میں موجود ہے - یہ واردات غالب کی تخلیقی کدو کاوش کا عمر بھر مرکز و محور بنی رہی - اس کے ابتدای مراحل کا اندازہ بیاض کے ان اشعار سے ہو جائے گا :

وردِ اسمِ حق سے دیدارِ صنم حاصل ہوا :
رشتۂ تسبیح تارِ جادۂ منزل ہوا

اے خوشا شوقِ سبک تازِ شہادت کہ ، اسد
بے تکلف بہ سجودِ خمِ شمشیر آیا !

' ہو گیے ہیں جمع اجزاے نگاہِ آفتاب
ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

غالب

شامِ فراقِ یار میں جوشِ خیرہ سری سے ہم نے، اسد!
ماہ کو در تسبیحِ کواکب جائے نشینِ امام کیا

'جوشِ خیرہ سری' میں اُس جذبے کی طرف اشارہ ہے جو سید صاحب کی امامت کا اقرار کرنے اور صفِ مجاہدین میں شامل ہونے کے وقت اُن کے دل و دماغ میں موج زن تھا۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ غالب نے اپنے مسحور ہونے کو ایک دوسری نظر سے دیکھنا شروع کر دیا:

آخرِ کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا
دلِ وارفتہ، کہ بیگانۂ ہر مذہب تھا

یادِ روزے کہ نفس درگرہِ 'یا رب' تھا!

اس سے پتا چلتا ہے کہ جب بیاض کا یہ مصرع کہا گیا، اس وقت تک میرزا صاحب کا مذہبی جوش اور عسکری جذبہ فرو ہوچکا تھا۔ اس کی مزید شہادت بعد کے کلام سے ملتی ہے:

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ:
اس قدر تنگ ہوا دل، کہ میں زنداں سمجھا

(سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی)

مجبوری، و دعوائے گرفتاریِ الفت:

دستِ تہِ سنگ آمدہ احرامِ وفا ہے!

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے ، کیا معلوم تھا
یعنی ، یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

مگر یہ ناقابلِ یقین تعلق آخر پیدا کیسے ہوا ؟ اس کی روداد غالب سے سنیے :

ستمِ نسبتِ زلف
موکشاں خانۂ زنجیر میں لایا ہے مجھے

ہوں میں وہ داغ[1] کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے

وارستہ مزاج نوجوان شاعر کو زبردستی 'خانۂ زنجیر' میں گھسیٹنے والے شاہ صاحب ہی ہیں[2] -

سید صاحب کا عمل توجہ اور غالب :

سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے اور اُن کے 'عملِ توجہ' کی کیفیت میرزا نے بار بار قلم بند کی ہے :

---

[1] غالب کے اعترافی کلام میں 'داغ' ایک مخصوص معنی رکھتا ہے :

داغوں کا نظر آنا خود چشم نمائی ہے
داغِ تر دستیِ اشکم

[2] بہ زورِ تند خوی خستگاں را رامِ خود کردن
بہ آتش بردن است از موے تابِ پیچشِ مورا

شیشۂ آتشیں رخِ پر نور

ہے نفس تارِ شعاعِ آفتاب آینے پر

بس کہ آینے نے پایا رخ کی گرمی سے گداز :
دامنِ تمثال ، مثلِ برگِ گل ، تر ہوگیا

عکسِ رخِ افروختہ تھا تصویر بہ پُشتِ آینہ

ان مصرعوں میں خود کو 'آینہ' اس عمل کے معمول اور عکاس ہونے کی رو سے کہا ہے۔

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے ، اسد !

یک نگاہِ گرم ہے ، جوں شمع ، سرتا پا گداز

سید صاحب کی 'توجہ' کے غالب کے دل و دماغ پر جو مختلف اثرات مرتب ہوئے ، ان کا اظہار وہ رہ رہ کے کرتے رہے :

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے ، غالب :
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

'مرگیا' یعنی غفلت طاری ہوگئی :

دیا یاروں نے بے ہوشی میں درماں کا فریب آخر :
ہوا سکتے سے میں آینۂ دستِ طبیب آخر

کچھ ایسا گمان گزرتا ہے کہ 'توجہ' کے اس تاثر میں مولوی فضلِ حق صاحب کی رائے کو دخل ہوگا ، جو سید صاحب کے ہر قول و فعل کو پر فریب ٹھہراتے تھے -

ذیل کے اشعار بھی 'توجہ' کے تجربے پر مبنی ہیں :

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا ، تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر ؟
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

جلتا ہے دل ، کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گیے:
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار ، حیف !

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں ؟
ہم نہیں جلتے ، نفس ہر چند آتش بار ہے

'نفسِ شعلہ بار' کے باوصف ، 'ذوقِ فنا' کی اس 'ناتمامی' کا شعور رہ رہ کر غالب کے احساس کو چھیڑتا رہا -

جس توقع پر میرزا کو اس عمل سے گزارا گیا ، وہ پوری نہ

ہوی[1] :

رہا بیگانۂ تاثیر افسوں آشنای کا'

وا کیا ہرگز نہ میرا عقدۂ تارِ نفس

ذیل کے شعر میں نگاہِ غلط انداز سے غالب نے اشارہ کیا ہے ان توقعات کے پورا نہ ہونے کی طرف جو سید صاحب کے کایا پلٹنے والے کمالات کے بارے میں شاہ صاحب نے دلای تھیں ، اور خود ان پر سید صاحب کے 'تیرِ نیم کش ، کی خلش کی طرف ، جس کا نشانہ ، شاہ صاحب کے بقول ، بے خطا تھا ، مگر ان پر سے اچٹتا ہوا گزر گیا :

ہم دم ، کہ ز اقبال نویدِ اثرم داد

اندوہِ نگاہِ غلط انداز نہ دانست

یہی 'اندوہ' اس مصرعے میں بیان ہوا ہے :

دیگر من ، و اندوہِ نگاہے کہ تلف شد

ایک اور جگہ 'نگاہِ غلط انداز' سے اشارہ ہے سید صاحب کی پہلی مہم کی ناکامی اور 'تیرِ دگر' سے مہم کے دوسرے دور کی طرف :

تیرِ نخست را غلط انداز گفتہ ام :

اے وائے گرنہ تیرِ دگر برنشان رسد!

---

[1] واماندۂ عجزیم ز افسونِ تعلق

بیدل

مومن نے بھی 'توجہ کی قوت' محسوس کی ہے اور ، غالب کی طرح' اپنی اس محرومی پر تاسف کیا ہے کہ اس سے دل کی گرہ نہ کھلی :

چاک کر کھول دیا گرچہ یہ سینہ تو نے
تو بھی دل کی نہ گرہ، ناخنِ شمشیر ، کھلی

دل ہوا خوں ، خیالِ ناخنِ یار :
خوب دل کی گرہ کشای کی !

مگر پوری طرح کارگر نہ ہونے کے باوجود ، اس نگاہ کا تاثر غالب کے شعور سے کبھی زائل نہ ہوا :

شمشیر آب دار ، و نگہ آب دار تر!
اس چشم سے ہنوز نگہ یادگار ہے

عملِ توجہ کی گرمی اور روشنی کا تاثر بعد کی شاعری میں برابر اُبھرتا رہا :

اے نگاہت الفِ صیقلِ سا !

دیدہ وراں را کند دیدِ تو بینش فزون :
از نگہِ تیز رو گشتہ نگہ توتیا

ز گرمی نفسات دل در اهتزاز آمد

ز گرمیِ نگہ ات خونِ دل بہ جوش آمد
ز شادیِ ستم‌ات سینہ در خروش آمد
نگاه از تابِ رویت موے آتش دیده را ماند

بہ گرمی ز رویش نگہ تاب خورده
زہے گرمی ، نگہ صیادِ آہو دیده را ماند!

سید صاحب کا عمل توجہ

'سید صاحب نے (ایک شخص کو) بیعت کیا اور علیحدہ لے جا کر کچھ تعلیم فرمایا... (چند روز بعد) وہ آیا تو نہایت پریشان اور روتا ہوا آیا، اور عرض کیا کہ...
'کل کو ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔ مجھے اپنی محرومی اور حضور کی مفارقت کا نہایت صدمہ ہے۔ سید صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر شاہ عبدالقادر صاحب کے حجرے میں لے گیے اور آدھ گھنٹے یا پون گھنٹے حجرے میں رہے۔ اس کے بعد سید صاحب تنہا حجرے سے باہر نکلے، اور ہم لوگوں سے فرمایا کہ ان کو باہر اٹھا لاؤ اور ہوا دو، اور یہ کہہ کر تیز قدمی کے ساتھ دوسرے حجرے میں تشریف لے گیے۔ ہم لوگ جب اندر گیے تو دیکھا کہ وہ شخص بالکل بے ہوش تھا۔ اسے حجرے سے سہ دری میں لے آے اور پانی کے چھینٹے دیے، پنڈول سنگھایا۔ کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آیا، تو اس کی یہ حالت تھی کہ بالکل مست تھا اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، اور کہتا تھا: 'واللہ باللہ' جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں، سید صاحب ہی نظر آتے ہیں۔ وہ

میری آنکھوں میں بھی ہیں ۔" یہ الفاظ اس نے تین دفعہ زور زور سے کہے ۔ سید صاحب نے کواڑ کھول کر اپنا چہرہ نکالا ، اور زور سے فرمایا : 'خاموش ! اور مجھ کتے کی صورت اپنے سامنے سے منہدم کر ۔' یہ الفاظ آپ نے بھی تین مرتبہ فرمائے ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ بالکل اچھا ہوگیا....

(ایک اور شخص) پر جوں ہی اثر پڑا ، تو وہ بد نصیب جوتیاں بھی وہیں چھوڑ کر بھاگا کہ یہ شخص (سید) بڑا جادو گر ہے ۔' "ارواحِ ثلاثہ" ۳۶-۱۳۵ ، تیسرا ایڈیشن

'شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کا بیان ہے کہ شاہ عبدالعزیز جب 'توجہ' دیا کرتے تھے ، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مہین بوندوں کی پھوار پڑ رہی ہے ، لیکن سید صاحب کی 'توجہ' کا اندازہ لوہاروں کی دھونکنی جیسا تھا ۔'

مہر "سید احمد شہید" ۱۹

' سامنے جو پڑ گیا ، دیوانہ' بے باک تھا :
پھاڑ کر آنکھیں جسے دیکھا ، گریباں چاک تھا

آتش

غالب کی گریز پای

شروع میں تو میرزا نے اپنے پیچھے ہٹنے کی ذمہ داری، شاعرانہ انداز میں، سید صاحب ہی پر ڈالنی چاہی:

خورِ شبنم آشنا نہ ہوا، ورنہ میں، اسد!
سر تا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

مگر اس معاملے کی اصل نوعیت، جو اتنی سیدھی سادی نہ تھی، رفتہ رفتہ خود ان کی زبان سے ظاہر ہوتی چلی گئی۔ ہم اس پر روشنی ڈالنے کے لیے متن میں صرف نسخۂ بھوپال سے کام لیں گے اور حاشیے پر فارسی کے کچھ ہم مضمون شعر درج کریں گے:

اے نو آموزِ فنا، ہمتِ دشوار پسند!

یعنی، 'فقر و فنا' کے مطالبے پورے کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا، جس کی تاب ان کی طبعِ نرم و نازک نہ لا سکی[1]:

تپش تو کیا، نہ ہوی مشقِ پر فشانی بھی:

رہا میں ضعف سے شرمندۂ نو آموزی

[1] ہر چہ با شوق ملایم نہ فتد، مرگِ دل است
ہر چہ بر طبع گوارا نہ بود، جان فرسا است

تپشِ دل نہیں ہے رابطۂ خوفِ عظیم :
کششِ دم نہیں ہے ضابطۂ جرِ ثقیل

غالب نے اپنے راہِ عمل سے فرار اور اس کے محرکات کا اعتراف کیا ہے :

عشق کمین گاہِ درد : وحشتِ دل 'دور گرد

میں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں

جنوں افسردہ و جاں ناتواں...

رہا غفلت سے دور افتادۂ ذوقِ فنا

مگر اپنی اس رمیدگی کے باوجود 'پیراہنِ خسک میں غبارِ شرر'[1]

---

[1] اس واردات کی شعری سرگزشت غالب نے کئی جگہ 'خس و شرر' کے ایک دوسرے پر اثر سے واضح کی ہے :

اے کہ از تو می آید خس شرر کردن !

خاشاکِ مرا تابِ شرر چہرہ فروز است

خار و خس ہر کہ در آتش رفت، آتش می شود

صبر مشتے از خس ، و ذوقِ تماشا آتش است

ہم چو خسے ، کش شرر چہرہ کشای کند
صورتِ آغازِ ما معنیِ انجام شد

حسرتی نے بھی دعوتِ جد و جہاد ، خصوصاً شاہ اسماعیل سے اپنا ربط اسی پیرائے میں بیان کیا ہے :

حسرتی در شمارِ خس ، اما
شعلۂ شوخ در نہادِ خس است

کا ادعا پھر بھی برقرار ہے :

میں دور گردِ قربِ بساطِ نگاہ تھا :
بیرونِ دل نہ تھی تپشِ انجمن ہنوز

ادعا تو یہ ہے ، مگر اپنے دل میں 'معزولیِ تپش' کا احساس موجود ہے :

پر افشاں ہو گیے شعلے ہزاروں
رہے ہم داغ اپنی کاہلی سے[1]

تپش اندوزی کے دعوے کو خود غیر حقیقی سمجھتے ہیں :

میں ہوں سرابِ یک تپش اندوختن ہنوز

اس کا اعتراف ایک اور صورت میں بھی کیا ہے :

بلبلِ تصویر ، و دعوائے پر افشانی عبث

---

[1] یہ شعر بیدل سے ماخوذ ہے :

شرر ہائے زمیں گیر است ہر سنگے کہ می بینی :
تن آسانی فسردن می کند آتش عنانی را

'کاہلی' سے چھٹکارا پانے کی کوشش کا ذکر اس شعر میں کیا ہے :

در خواہشِ بریدن پیوندِ کاہلی
ہمت ز تیزیِ دمِ خنجر گرفتہ ایم

الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے کی سب وجہیں انھوں نے، ایک ایک کر کے، گنوا دی ہیں :

جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں[1]

دھمکی میں مر گیا جو، نہ بابِ نبرد تھا :
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا :
اڑنے سے پیش تر بھی مرا رنگ زرد تھا

کروں بیدادِ ذوقِ پر فشانی عرض، کیا قدرت!
کہ طاقت اڑ گئی، اڑنے سے پہلے، میرے شہپر کی

متداول دیوان کے یہ شعر جتنے امیر خاں پر صادق آتے ہیں اتنے ہی میرزا صاحب کے بھی حسب حال ہیں، جو اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر کبھی کڑھتے تھے، کبھی ہنستے تھے، اور کبھی ناز کرتے تھے[2] - ایک خاص وصف ان میں اور بھی تھا،

---

[1] کوچۂ یار میں میں نے، تسکیں!
پاؤں رکھا تھا، کہ سر یاد آیا!
تسکین

[2] نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی!

اور وہ تنہا اپنے پر تعریض کرنے کا ۔ اگر اس صفت میں ان کے ساتھ ایک ہی سانس میں کسی شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے ، تو وہ مومن ہیں ۔ اس حد شناسی کی ایک مثال اپنی گریز پای پر آن کے یہ شعر ہیں :

رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے!'
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم، منزل میں ہے!

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق :
جو پاؤں اٹھ گیے ، وہی ان کے علم ہوئے!

سر گرمیِ شوقِ تو بود حوصلہ فرسا

دارم سرِ عشقِ تو ، ولے ترسم از آشوب

زین دو سر ہنگ کہ پویند بہم ، می ترسم

دل و دستے کہ مرا بود ، فرو ماند ز کار

' 'عشق ہے !' مرحبا ! آفرین !

اس شعر کو سمجھنے کے لیے دوسرے مصرعے میں 'قدم' کے بعد وقفہ ہونا چاہیے' حامد علی خاں

چون نقشِ پا ، ہمہ افتادگی است ہستیِ من

تا بہ خود او افتادہ ایم، از تو کرا نہ کردہ ایم

اس ضمن میں ایک حل طلب سوال یہ ہے کہ 'ترکِ نبردِ عشق' یا ، خود ان کے بقول ، اس کوچے سے 'بہت بے آبرو ہو کر نکلنے ، یا نکالے جانے کی نوبت' کیوں آئی - اس کا جواب بھی ، اور سب سوالوں کی طرح جو ان کے کسی شخصی معاملے یا فن کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں ، انھوں نے خود بڑی صاف گوئی سے دے دیا ہے - اس معاملے کی چھان بین اور اس کے ثبوت میں 'شعروں کا انتخاب' ان پر چھوڑا جاتا ہے جو ان امور کو کریدنے سے شغف ، اور اس کام کی علمی اور ادبی استعداد رکھتے ہیں - ان معذوریوں کے علاوہ جن کی طرف اشارہ کیا جا سکا ہے ، اس کی جامع و مانع وجہ مختصراً یہ تھی :

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

---

۱ اس ذلت کو بھی غالب نے ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی ہے ، مگر ان کا اصل تاثر اس شعر سے ظاہر ہے :

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے ، غالب !
ہم بھی گئے واں، اور تری تقدیر کو رو آئے!

سید صاحب ، شاہ صاحب اور غالب

غالب نے ایک جگہ یہ سوال پوچھا ہے کہ ان کی گرمیِ خون کا منبع کس کی 'رزم گہ' ہے ، اور پھر اس 'معنی تماے جدوجہاد' سوال کا جواب بارہا دیا ہے :

در گردِ نالہ وادیِ دل رزم گاہِ کیست ؟
خونے کہ می رود بہ شرایین ، سپاہِ کیست ؟

'فقر و فنا' کی اس 'رزم گہ' کا 'مردِ راہ' وہ ہے جس کی صفات اور تصرف کا تذکرہ غالب نے ، خود کو 'ترکِ تباہ اندیشہ' قرار دے کے ، 'در عنوانِ حمد' کیا ہے :

عاشقان در موقفِ دار و رسن وا داشتہ
غازیان در معرضِ تیغ و سنان انداختہ

سر بہ تیغ از دوشِ جان بازان سبک برداشتہ
بار بردل ہائے نامردان گران انداختہ

آن چنان شمعے بہ راہِ شب روان افروختہ
این چنین گنجے بہ جیبِ بے دلان انداختہ

جادہ پیمایان راہت نہ فلک را ، چون جرس
در گلوے ناقہ ہاے کاروان انداختہ

آتشے از روے گل ہاے بہار افروختہ :
شعلہ در جانِ مرغِ صبح خوانِ انداختہ

دجلہ در ساغرِ معنی طرازان ریختہ

رنگ ہا در طبعِ اربابِ قیاس آمیختہ
نکتہ ہا در خاطرِ اہلِ بیان انداختہ

جز بہ این الماس ، نہ توان این چنین دردانہ سفت :
رخنہ از اسلام در کیشِ مغان انداختہ

آخری شعر میں 'الماس' کا لفظ تصریح چاہتا ہے - اسے 'اسماعیل' (ا س م ا ع ی ل) کا معما بنا کر غالب نے اردو اور فارسی میں کئی جگہ استعمال کیا ہے - سب سے پہلا استعمال یہ ہے :

جراحت تحفہ ، الماس ارمغان ، داغِ جگر ہدیہ :
مبارک باد ، اسد ، غم خوارِ جانِ دردمند آیا

'جانِ دردمند' کے غم خوار سید صاحب ہیں - مجوزہ علاج کا نسخہ پہلے مصرعے میں درج ہے - علاج کا ایک عنصر 'الماس' بھی ہے -

اردو کے ایک اور شعر میں 'نسخۂ مرہمِ جراحتِ دل'، میں 'ریزۂ الماس' کو 'جزوِ اعظم' کہا گیا ہے۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہوے کہ روحانی اور جسمانی آلام کا جو علاج سید صاحب کر رہے تھے، اس میں شاہ اسماعیل ان کے مشیرِ خاص تھے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس مرض کا علاج کیا جا رہا ہے، وہ اتنا شدید ہے کہ بہ جز اس کے چارہ نہیں کہ نسخے میں ایک بہ ظاہر مہلک جزو، یعنی جدوجہاد، بھی شامل کیا جائے۔

فارسی میں 'الماس' کئی جگہ یہ ظاہر کرنے کو استعمال کیا ہے کہ شاعر کا تب و تاب شاہ صاحب سے ماخوذ ہے:

دریاب کہ از الماس بود جوہرِ تیغ ام

برق بہا نالۂ الماس کارے داشتم

رازدانِ نالۂ الماس پاشم کردہ اند

شاہ صاحب کے جس 'نالے' کے غالب 'راز دان' ہیں، اس کا ایک موضوع سید صاحب کے اس منصوبے کی ناکامی ہے جو امیر خان سے وابستہ تھا:

باد برد آن گنجِ باد آورد، و غالب را ہنوز
نالۂ الماس پاش و چشمِ گوہر بار ہست

'گنجِ باد آورد' میں اس چوٹ کی طرف تعریضی اشارہ ہے جو مولوی فضلِ حق جدوجہد کے اس پہلو پر کرتے رہتے تھے - ایک اچٹتی نظر خود اپنے دولت اڑانے پر بھی ڈالی ہے -

ذیل کے اشعار کا مرجع صریحاً سید احمد شہید ہی ہیں :

حقا کہ لفظِ 'احمد' و لطفے کہ تحتِ اوست
گنجے است شایگان و طلسمے است استوار

('حقا' میں اشارہ ہے کہ یہ سرمایہ اندوزی اور جادوگری کے ان الزامات کی کاٹ ہے جو مولوی فضلِ حق سید صاحب پر تھوپتے رہتے تھے)

از فیض بخششِ نفسش غفلت آگہی
از دل نوازی کرشش جبر ، اختیار

در بزمِ رنگ و بوے نگاہش ز مرتضٰی:
در رزم آبروے سپاہش ز ذوالفقار

عزمِ مجاہدانِ تو با چرخ ہم عنان :
سعیِ موافقانِ تو با خلد ہم کنار

غالب کی نظر میں سید صاحب 'مردِ عشق' اور 'مردِ راہ' دونوں

کی صفات کا مجموعہ ، اور ان کی نے نوازی کا مصدر تھے :

در ہزاران مرد ، مردِ رہ یکے است
آدمی بسیار ، اما شہ یکے است

مرد باید آن کہ باشد مردِ عشق
لب ترنم خیز[1] ، و در دل دردِ عشق

آن کہ چون از رازِ وحدت دم زند
دفترِ کون و مکان برہم زند

نالۂ نے از دمِ مردِ رہ است

---

[1] سید صاحب اکثر مندرجۂ ذیل شعر پڑھا کرتے تھے :

اے آن کہ زنی دم ز محبت
از ہستیِ خویش بہ پرہیز
برخیز ، و بہ تیغِ تیز بہ نشین
یا از سرِ راہِ دوست برخیز

در مسلخِ عشق جز نکو را نہ کشند
لاغر صفتانِ زشت خو را نہ کشند
گر عاشقِ صادقی ، ز کشتن مگریز :
مردار بود آن کہ او را نہ کشند

دلم بہ راہِ تو صد پارہ باد ، و ہر پارہ
ہزار ذرہ ، و ہر ذرہ در ہواے تو باد!

منقول از مہر : ''سید احمد شہید'' ، ۴۸۷

اسی 'مرد' کی تعریف و توصیف میں یہ شعر بھی ہیں :

مردِ فقیر از سرِ سجادہ جست
جام بہ دستے و سبوے بہ دست

تا نمِ آبے بہ گلوہا رسید
دورِ پیالے بہ سبوہا رسید

ریشہ ٔ ہستی بہ دمیدن رسید
نشہ ٔ مستی بہ رسیدن رسید

(کہ) اندر رہِ دینِ شاہ چہ مردانہ قدم زد !

(تا) مرد کند جلوہ گری در صفِ ہیجا

مرد آن کہ در ہجومِ تمنا شود ہلاک

مرد از تفِ سموم بہ صحرا شود ہلاک

گردم ہلاکِ فرۂ فرجامِ رہ روی

کاندر تلاشِ منزلِ عنقا شود ہلاک

غالب کی 'شاہ راہِ مدح' کا مرجع بھی سید صاحب ہی ہیں :

مرد بودم : بہ سجودِ شہِ مردان رفتم

راہِ مدحِ تو بہ سرگرمیِ ایمان رفتم

راہِ صحرائے خیالِ تو چوں مستان رفتم[1]

(مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال)

از صعوۂ بے بال و پرِ من چہ کشاید ؟
پروازِ ثنایت طلبد شہ پرِ عنقا

ترکانہ زدم زمزمۂ مدح و ثنایت
دور از اثرِ عربدہ و بحث و ستیزہ[2]

---

[1] مستانہ رہِ مے کدہ طے می کنم امشب :
پرواز ز بال و پرِ مے می کنم امشب
طالب آملی

[2] فارغ از کش مکشِ غمزہ ، جنونے دارم
پشت پائے بہ سرِ کوہ و بیابان زدہ اے
غالب

مدحِ تو دوانیدہ بہ دل ریشۂ احیا

الغرض ، کوئی صنفِ سخن نہیں ، خواہ اس کا عنوان کچھ ہو ، جس میں غالب نے ، کسی نہ کسی پیرائے میں ، کہیں سید صاحب کے ، کہیں شاہ صاحب کے ، کہیں ملے جلے طریقے سے اس 'نقشِ دو پیکر ، کے ، گن نہ گائے ہوں :

دو پیکر دو جا در نمود آمدہ
اثر ہا بہ یک جا فرود آمدہ

دو فرخندہ یارِ گران مایہ بین :
دو قالب ز یک نور و یک سایہ بین

بدان اتحادے کہ صافی بود
دو تن را یکے سایہ کافی بود

ازان سایہ بہ یک جا گرایش کنند
کہ احمد ز حیدر نمایش کنند

زان گونہ در آمیخت یکے باصنمِ خویش
کش نقشِ دو پیکر بہ نمودار برآمد[1]

[1] سید صاحب اور شاہ اسماعیل صاحب دونوں ، 'روحاً و معنیً ایک وجود رکھتے ہیں ۔'
سید ابوالاعلیٰ مودودی : ''تجدید و احیاے دین''

ایک قصیدے کے بعض اشعار میں ، جس کا عنوان مخطوطہ رام پور اور دیوان مطبوعہ دہلی کے حوالے سے ، مہر صاحب نے 'در مدحِ بہادر شاہ' دیا ہے ، غالب نے تحریک و محرکِ جد و جہد کی نسبت اپنے عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار کیا ہے :

در وادیِ مقدسِ مدحِ تو از ادب
اندیشہ را عنانِ تگاور گرفتہ ایم

(شاہ صاحب کے سید صاحب کے گھوڑے کی لگام تھامنے سے اپنی عقیدت کی مماثلت ظاہر کی ہے) :

برخود فسونِ دولت و اقبال خواندہ ایم
در سر ہوائے رایت و لشکر گرفتہ ایم

دانی ز باز گشتِ سخن ، بر طریقِ رجز
کائینِ سرکشانِ دلاور گرفتہ ایم

در خواہشِ بریدنِ پیوندِ کابلی
ہمت ز تیزیِ دمِ خنجر گرفتہ ایم

گرشہ کند قبول ، زہے آبروے ما !
بیعت بہ نامِ او ز سکندر گرفتہ ایم

یہ تو واضح ہے کہ یہ 'رایت و لشکر' کس کا ہے ، اور یہ بھی کہ 'فسونِ دولت و اقبال' کس نے پھونکا ہے - مگر 'بیعت'

اور غالب ! اور یہ 'سکندر' کون ہے جس کے ذریعے یہ بیعت لی گئی ؟ اس حیرت انگیز معاملے تک نظر بڑے پیچ و خم سے گزرنے کے بعد پہنچی - کامل یقین حاصل کرنے کے لیے ایک ایک لفظ ، 'پیوندِ لفظ و معنی' اور ان کے متعلقات اور مضمرات پر بارہا نظریں گاڑنی پڑیں - ما فی الضمیر تک رسای کے لیے کلام کو الٹ پلٹ کے دیکھنا پڑا ، مختلف سیاق و سباق میں داخلی شہادت مہیا کرنی پڑی ، اور اس کی وجہ سے لامحالہ بعض امور کی تکرار کی ضرورت پیش آی -

یہ ماجرا غالب نے کئی جگہ بیان کیا ہے ، مگر ہر بار بڑے پیچ در پیچ 'ہنجارِ رمز' کے پردے میں -

وہ صبح کے وقت فکرِ سخن میں غلطاں و پیچاں تھے :

صبح گاہے

می زدم برگلِ نہ شگفتہ' معنی دستان

ناگہ آن آفتِ نظارہ و غارت گرِ ہوش

کہ غزالے است سخن گوے و نہالے است روان

آمد :

گفتم :

'اے خانہ بر انداز مغان شیوہ بتان !

بہ شمہ آوردہ ام از روئے ارادت ایمان

در وفا عہد من آن است کہ باشم یک رنگ'[1]

یہ 'خانہ برانداز مغان شیوہ بتاں'، ہی، جو اسلام سے 'کیش مغاں' میں 'رخنہ' ڈالتا ہے، وہ 'سکندر' ہے جس کے ذریعے سید صاحب کے ساتھ اقرار ارادت مندی اور عہد یک رنگی کیا گیا۔

شاہ صاحب کے سید صاحب کا 'محضر' لانے اور اس پر غالب کی مہر کرانے کی ایک اور روداد یہ ہے :

محضرے آورد قاصد از علی اللہیان :

پیش ازاں کز بیش پرسم' مہر بر محضر زدم

اسی غزل میں سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر بھی آیا ہے :

---

[1] غالب نے نثر میں خود کو 'اسد یک رنگ' 'یک رنگ بے رنگ' کہہ کر ایسا ہونے کی آرزو ظاہر کی ہے اور نظم میں دعوی کیا ہے کہ :

نیست دوی در روش دین من

مگر درحقیقت ان کے فکر و جذب کی رنگا رنگی آخر دم تک قایم رہی۔

صبح سر مستانہ پیرِ خانقہ را در زدم :
در بہشت از گرمیِ دل غوطہ در کوثر زدم

'سرمستی' اور 'گرمیِ دل' میں وہ پوری کیفیت آگئی جس کے زیرِ اثر اس ناقابلِ یقین تعلق نے صورت پکڑی ۔ اس کیفیت کو اردو کے ایک شعر میں 'جوشِ خیرہ سری' کہا گیا ہے ۔

یہی ماجرا ایک اور جگہ یوں بیان ہوا ہے :

نا خواندہ آمد صبح گہ ؛ بندِ قبایش بے گرہ
و اندر طلب منشورِ شہ، نکشودہ عنوان، در بغل

تنگم کشید از سادگی در وصلِ جانان در بغل

یہ وہی 'منشور' یا اعلامِ امامت ہے جس کی 'ہوا داری' کا اقرار، اپنے 'ناپارسا' اور 'کج اندیشہ' ہونے کے باوجود ، غالب ہمیشہ کرتے رہے :

کہ البتہ این رندِ ناپارسا
کج اندیشہ گبرِ مسلمان نما

پرستارِ فرخندہ منشورِ تست
ہوا دارِ فرخندہ دخشورِ تست

غالب نے نثر میں خود کو 'مسلمان زادہ ایست کافر ماجرا، و گبرے است مسلمان نما' کہا ہے ' اور اپنی 'آشفتگیِ راے' کا

ایک شعر میں اعتراف کیا ہے :

در دایرۂ فکر ، ز آشفتگیِ راے
ہر دم نفسم پیچ خورد ، چون خطِ ترسا ¹

'خطِ ترسا' سے اشارہ ہے انگریزوں کی طرف میلان سے ، جس کے زیر اثر

سنگ و خشت از مسجدِ ویرانہ می آرم بہ شہر :
خانہ در کوے ترسایان عمارت می کنم

'منشور' سے غالب کی عقیدت ان اضافتوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے : 'منشورِ یزدانی' : 'منشورِ امامت' : 'منشورِ روشنی'۔

اسی منشور کے معتقد ہونے کی حیثیت سے کہا ہے :

منشورِ فروغِ سحرم دیر و حرم را

چونکہ یہ منشور ملک کے سب باشندوں کو غلامی سے آزاد کرانے کی دعوت تھی ۔

---

¹ شیرین تر از حکایتِ ما نیست قصہ اے
تاریخِ روزگار سراپا نوشتہ ایم
برما مسلم است کہ منشورِ راستی
بس واژگون تر از خطِ ترسا نوشتہ ایم
نظیری

اپنی ارادت اور بضاعت کی حدود غالب برابر ، دونوں زبانوں میں ، بے کم و کاست واضح کرتے رہے :

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں !

گنجایشِ عداوتِ اغیار یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں !

خیالِ وحشت، از ضعفِ روان ، صورت نہ می بندد:
نفس ، با این ضعیفی ، بر نہ تابد شورِ 'یا رب' ہا

گر در طلبِ دوست بود پاے تو سست
غم گین مغنو
ور خود باشی بہ جست و جو چابک دست
مغرور مشو
اخلاص بہ نسبت است ، و نسبت ازلی است
چو شبنم و مہر
گر جذبہ قوی فتاد ، و پیوند درست
بے خود می رو

قوی فتادہ چونسبت ، ادب مجو ، غالب !
نہ دیدہ ای کہ سوے قبلہ پشتِ محراب است ؟

غالبا ، حسنِ عقیدت بر نہ تابم بیش ازین

نازشِ ناموسِ نسبت بر نہ تابم بیش ازین

بے خودم : پاسِ محبت بر نہ تابم بیش ازین

آبروے دین و دولت بر نہ تابم بیش ازین

قیدِ قانونِ شریعت بر نہ تابم بیش ازین

معاملہ درحقیقت 'ضعفِ رواں' ہی کا نہ تھا ۔ ان کی تہ نشین نفسی ترکیب (neurosis) کا بھی تھا ۔ جس سے ان کی تخلیقی سرگرمی ایک حد تک وابستہ تھی ۔ وہ اپنے مزاج کے سارے کل پرزوں سے خوب واقف تھے :

درد منت کشِ دوا نہ ہوا :
میں نہ اچھا ہوا ، برا نہ ہوا

بر نہ تابم آرزوے چارۂ دل خستگی

چو زلف ، جوہرِ تیغم بود پریشانی :
چو چشم ، ناز بہ خویشم رسد ز بیماری

نہ جہد زیرِ سر انگشتِ تو نبضم ، کہ مرا
نیست در دے ، کہ تمنائے دوا خیزد ازو

جلوہ ، اے داغ ، کہ ذوقم ز نمک می خیزد !
مژدہ ، اے درد ، کہ ننگم ز دوا می آید !

اسی بنا پر جیمز جوایس نے ژونگ سے اپنی نفسی تحلیل نہیں کرای - یوں بھی وہ فرایڈ اور ژونگ کو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے سمجھتا تھا ، اور نہ اس کا قابل تھا ، نہ اس کا - کم از کم ایک عارضہ اس میں اور غالب میں مشترک تھا : دونوں 'حریصِ لذتِ آزار' masochist تھے -

اس 'حرص' کا ایک تقاضا محبوب ممدوح کے لیے 'قہر و عتاب' کا موقع خود پیدا کر کے اس سے حظ اندوز ہونا بھی ہے :

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ھل من مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ 'الاماں' نہیں

در راہِ ثوابش قدِ افراختہ نیست
در بزمِ عتابش رخِ افروختہ ہست

در تاب مرو ، غالب اگر بیہدہ گردد :
در کوے تو گوی سگِ پا سوختہ ہست

اپنے لیے خود ذلت و خواری کی صورتیں نکالنا ، اور ان سے ایک گونہ تشفیِ نفس حاصل کرنا بھی اسی مزاج کا ایک رخ ہے :

خویش را سرمست و رسوا خواستیم

غالب نے اپنی اس علت کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں چھوڑی :

لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمک داں ہونا

رفوے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی

ذوقِ غم حوصلہ لذتِ آزارم داد

ما را ، کہ محوِ لذتِ بیداد گشتہ ایم
با ما سخن ز مہر و مدارا چہ می رود ؟

نشاطِ لذتِ آزار را نازم

سرمستِ مےِ لذتِ دردم

شاہ صاحب اور غالب

غالب نے شعری فکر کو 'آینہ' تصویر نما' کہا ہے ، اور اپنی شعر گوی کے جن محرکات کی صراحت کی ہے ، ان میں کسی 'شاہد' کا وجود اور تصور بھی شامل کیا ہے ، اور اس کی بعض صفات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے :

نیست چون در منطقش ، جز ذکرِ شاہد ، حرف و صوت
شاہدے باید ، کہ غالب را بہ گفتار آورد

نطق تنہا نہ بود مشقِ سخن را کافی :
سخن این است ، کہ این تیر کمانے دارد

اے کہ در بزم دل افروز نگاہش دیدی
بین ، کہ در رزم جگر دوز سنانے دارد

ہم ازین جاست کہ دانا دلِ شیراز سرود :
'بندۂ طلعتِ آن باش کہ آنے دارد''

ان کی رنگینیِ خیال کسی ایسے ہی شخص کی رہینِ منت تھی - اس کا 'پرتوِ نقشِ خیال' ان کی شاعری پر ضو فگن رہا ، اور کوی

---

[1] غالب نے ایک خط میں وہ خوبیاں گنوای ہیں جو وہ دلی تعلقِ خاطر کے لیے ضروری سمجھتے تھے :
'میں تمھارا عاشق ہوں ، اور کیوں عاشق ہوں؟ صورت کے تم اچھے ، شیوہ و روش کے تم اچھے - خالق نے خوبیاں تم میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں - مہر : ''خطوط'' ۸۱۳

دوسرا وجود اس کی جگہ نہ لے سکا[1] :

'غزل کا ڈھنگ بھول گیا - معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آے ؟ رہا قصیدہ ، ممدوح کون ہے ؟ ہاے انوری ! گویا میری زبان سے کہتا ہے :

اے دریغا ! نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح !
اے دریغا ! نیست معشوقے سزاوارِ غزل !

مہر : "خطوط" ۶۲

غالب نے ، از راہِ رشک ، یہ بھی کہا ہے کہ 'ظہوری کا ممدوح و معشوق ایک ہی ہے -' خود ان کا ایک ممدوح ایسا ہے جس پر 'معشوق' کا ، ظہوری کے مفہوم میں ، اطلاق نہیں ہوتا ، چونکہ وہ خالصتاً ایک 'شاہدِ روحانی' ہے - میرزا صاحب کا ایک 'شاہدِ آرزو' ایسا بھی ہے جس میں انھیں جسم و جان کی وہ ساری خوبیاں نظر آئیں جو کسی مثالی مگر مادی ممدوح و محبوب میں یک جا پای جا سکتی ہیں -

'غازہ کاری' تو انھوں نے ، بقولِ خود ، دونوں کے 'رو و مو' کی ہے ، مگر جس پیراے میں یہ سراپا نگاری ہوی ہے ، اس سے ایک حد تک دونوں میں امتیاز کیا جا سکتا ہے - ایک کا تاثر

---

[1] 'شگرف کاری بخت را نازم ، کہ شمعِ انجمنِ وصال نیفروختہ ، بہ داغِ فراق آزر فشانم!'

سراسر ارادت و احترام میں ڈوبا ہوا ہے، دوسرے سے شخصی شیفتگی بھی ٹپکی پڑتی ہے۔ چونکہ دونوں ذات و صفات میں ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں، اس لیے کچھ کلام ایسا بھی ہے جو دونوں پر یکساں صادق آتا ہے، اور یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ غالب کا روے سخن ان میں سے بالخصوص کس طرف ہے۔

معما بہ اسمِ اسماعیل :

از شنیدنِ 'اسم'
نشان دہد کہ چہ در دل بود مسمیٰ را

ز ہے، ز روے شناساوری، شناساگر
رموزِ تفرقہ و جمع و لا و الا را !

پہلے ہم کچھ ایسے اشعار درج کرتے ہیں جن میں غالب نے 'اسماعیل' کے 'اسمِ سامی' کا 'معما' بنایا ہے :

بہ اسمے ز اسما ظہورش بود

چو مربوطِ این اسمِ سامیستم
نشان مندِ این نامِ نامیستم

فروغِ حقایق ز اسما ستے

کز این اسم روشن شود نامِ او
بہ آن باشد آغاز و انجامِ او

(آغاز : 'اسما' ؛ انجام : 'عیل' 'علی')

بود ہر چہ بینی بہ سودائے دوست
پرستارِ اسمے ز اسمائے دوست

ہر آینہ درکارگاہِ خیال
کزان جاست انگیزشِ حال و قال

لبم در شمارِ ولی اللہی است :
دلم رازدارِ علی اللہی است

نہ آساید اندیشہ ، جز با 'علی' :
بہ 'اسما' نہ اندیشم الا 'علی'

بہ بزمِ طرب ہم نوایم 'علی' است
بہ کنجِ غم اندہ ربایم 'علی' است

بہ تنہای ام راز گوی بہ اوست :
بہ ہنگامہ ام پایہ جوی بہ اوست

بہ آینۂ خاطرم رو دہد :
بہ اندیشہ پیوستہ نیرو دہد

ماہ و سہر و شب و روز اوست
دل و دیدہ را محفل افروز اوست

بہ صحرا ، بہ دریا براتم از اوست
بہ دریا ز طوفان نجاتم از اُوست

شاہ صاحب پر سید صاحب نے اپنا ایسا گاڑھا رنگ چڑھایا[1] کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہو گیا کہ ان میں سے غالب کا مرجعِ سخن کون ہے - غالب کو سید صاحب کے اس رنگ کا شعور اور احساس شاہ صاحب ہی کی وساطت سے ہوا :

نظارہ عرضِ جالت ز نو بہار گرفت :
شکوہِ صاحبِ خرمن ز خوشہ چین پیداست

انہوں نے جس قدر اثر سید صاحب کا قبول کیا ، وہ اس کشش سے

---

[1] از تو باید کہ فزای نفسم را نیرو
از من آید کہ دمم در تنِ اندیشہ روان

از لبم مصرعۂ برجستہ بر آید در و جد
بہ ادائے کہ رود تیرِ تو بیرون ز کمان

تیزیِ فکرِ من از تست : ز گردون چہ خطر ؟
سختیِ دہر شود تیغِ مرا سنگِ فسان

ہم آمیز تھا جو شاہ صاحب ان کے لیے رکھتے تھے :

ہم بہ سودائے تو خورشید پرستم : آرے
دل ز مجنون برد آہو ، کہ بہ لیلا ماند

'خورشید' کا نشان سید صاحب کے لیے ، 'لیلا' کا شاہ صاحب کے ، غالب کے علاوہ دوسرے معاصر شاعروں نے بھی استعمال کیا ہے - کچھ کلام ایسا ہے جو ان یک جان و دو قالب 'یارانِ گران مایہ' پر یکساں صادق آتا ہے ، مگر کچھ کلام ایسا بھی ہے جس کے 'شاہدِ سخن' شاہ صاحب ہی ہو سکتے ہیں - اس کا اندازہ شعری لب و لہجے کی رو سے لگایا جا سکتا ہے -

من عاشقِ شاہ ام . . .

پیکرش عیدِ نگاہ است : بہ قربان رفتم

(نام کی رعایت سے)

نظر محوِ حسنِ خداداد تو :
ستم کشتۂ غمزۂ دادِ تو[۲]

[۱] 'فرمانِ دوست' سے سرتابی کے بعد :
من کافرِ ز نہاریِ شاہ ام

[۲] بر گنج روا داشتہ تیغ تو ستم را

شہیدِ چشمِ تو گشتم ، کہ خوش سخن گوی است

شہیدِ آن مژہ ہاے دراز باید بود

در ہواے قتل سر بر آستانش می نہم
تا ز نقشِ مدعا لوحِ خدا ساز افگنم

صعوۂ من ہرزہ پرداز است: بو کہ از فرطِ مہر
بے خودش در آشیانِ چنگلِ باز افگنم

پہلے شعر میں 'آستانہ' سید صاحب کا ہے - دوسرے شعر میں 'فرطِ مہر' سے بے خود ہو کر چنگلِ باز کی گرفت میں آنے کی آرزو غمازی کر رہی ہے کہ تہ میں روے سخن شاہ صاحب کی طرف ہے -

بدین خوبی ، خرد گوید ، کہ کامِ دل مخواہ از وے :
نکو رو و نکو کام و نکو نام است ، آہ از وے !

---

[1] یہ شعر عرفی کے اس شعر پر مبنی ہے :

از بانگِ طبلِ بازِ دلِ ما نہ می رمد:
ما کبکِ خود بہ چنگلِ شہ باز دادہ ایم

نگارم سادہ ، و من رندِ رنگ آمیزِ رسوایم :
چہ نقشِ مدعا بندم ، بہ این روے سیاہ ، از وے !

تو پارسا طلبی عاشق ، و من آن رندم
کہ مے بہ حلقۂ اوباش اشکار کشد

سیماب تنے ، کز رمِ برق است نہادش
گردیدہ مرا مایۂ آرامشِ جان ، ہاے !

انگارہ ای ، مثالِ سراپاے کیستی ؟

نہ شعلے میں یہ کرشمہ ، نہ برق میں یہ ادا :
کوی بتاو کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے !

برق تمثالِ سراپاے تو می خواست کشید
طرزِ رفتارِ ترا آینہ دار آمد و رفت

اپنی شیفتگی کے باوصف ، اپنے محبوب ۔ ممدوح سے حسب دل
خواہ بہرہ یاب نہ ہونے کی محرومی کا اظہار غالب نے معنی خیز

الفاظ میں کیا ہے :

گارے نہ دید آن کہ توان در من آفرید :
در شورہ زارِ خویش بہ باران خورم دریغ[1] !

اس محرومی کے اسباب ان کے قلب و ضمیر پر روشن تھے :

نگہ ز شعلۂ حسنت چہ طرف بر بندد
چنین کہ طاقتِ ما را بنا بہ مہتاب است ؟

انہی 'بے اعتدالیوں' کی بدولت ، ان سے نوجوانی کی راہ و رسم ترک ہو جانے کے بعد بھی شاہ صاحب کی ہر نقل و حرکت ، تحریر و تقریر میں غالب کتنی گہری دل چسپی رکھتے تھے ، ان سے کتنے باخبر تھے ، اور انھیں کس طرح اپنے کام میں لاتے تھے ، اس کا ایک ثبوت اس واقعے سے ملتا ہے جسے ہم مرزا حیرت کی ''حیاتِ طیبہ'' سے نقل کرتے ہیں :

'صاحبِ ''ذکرِ جلی'' ایک قصہ مولوی محمد علی رام پوری کی زبانی تحریر کرتے ہیں ، کہ ایک روز مولوی اسمٰعیل صاحب ، مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسے کے دروازے

---

[1] نظیری علیہ الرحمہ کا ایک شعر ایک کاغذ پر لکھ کر میرے گلے میں ڈال دیجیے ، شعر یہ ہے :

جوہر بنیشِ من در تہِ زنگار بہ ماند :
آن کہ آیئنۂ من ساخت ، نہ پرداخت ، دریغ

مہر : ''خطوط'' ، ۵۰۴

پر کھڑے تھے ، آپ نے دیکھا کہ بہت سی جوان اور خوب صورت عورتیں رتھوں اور بہلیوں میں سوار ہو کر بلا پردہ کہیں کو جا رہی تھیں - مولوی صاحب نے لوگوں سے پوچھا کہ 'یہ کون عورتیں ہیں ؟' ایک شخص نے کہا کہ 'یہ سب کسبیاں فلانی بڑی کسبی کے گھر کچھ تقریب ہے ، وہاں جا رہی ہیں -' مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ 'کیا یہ مسلمان ہیں ؟' اس شخص نے کہا کہ 'ہاں ، یہ مسلمان ہیں -' تب مولانا نے فرمایا : 'تب ہماری بہنیں ہیں - کیا خدا وند تعالی ہم سے نہیں پوچھے گا' کہ اس قدر مسلمان عورتیں بدکاری اور زنا کاری میں گرفتار تھیں ، اور تم نے انھیں نصیحت نہیں کی ؟ اس واسطے میں تو اب ان کے مکان پر جا کر ان کو نصیحت کروں گا '. . . جب شام ہوی مولانا صاحب درویشوں کا سا بھیس بدل کر اس کسبی کے مکان پر پہنچے جہاں سب کسبیاں جمع ہو کر کچھ گا بجا رہی تھیں . . . آپ نے وہاں جا کر دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ 'آو ، اللہ والیو! آو ، اللہ والیو!' اس وقت ان ان چھو کریوں نے دروازے پر آ کر پوچھا کہ 'کون ہو ؟' آپ نے جواب دیا کہ 'فقیر ہے ، کچھ صدا سنائے گا ، اور تماشا دکھائے گا -' وہ سمجھیں کہ کوئی تماشا گر فقیر ہے ، دروازہ کھول کر اندر بلا لیا . . . مولوی صاحب نے حایل

کھول کر ایسی خوش الحانی سے قرآن پڑھا کہ اس کو سن کر لوٹ پوٹ ہوگییں ۔ پھر آپ نے ان آیتوں کے معانی بیان کرکے ہر ایک چیز دنیاوی کی بے ثباتی کا اس طرح ذکر کیا کہ یہاں نہ حسنِ جوانی کو قیام ہے ، نہ مال و زندگانی کو ، یہاں کی ہر چیز فانی اور زوال پذیر ہے ۔' یہ بیان ایسی شرح و بسط اور فصاحت و بلاغت سے ہوا کہ ہر ایک نے رونا شروع کیا ۔ اس کے بعد مولانا نے موت اور جان کندنی کی سختی اور اس وقت کی بے کسی اور وحشت اور اس عالم کی مفارقت کا افسوس ایسے پر درد طور سے بیان کیا کہ ساری عورتیں ہوش باختہ ہو گئیں ۔ پھر اس کے بعد قبر کی تنہای اور منکر و نکیر کا سوال اور وہاں کے عذاب کا بیان کیا ہے ۔ یہ بیان بھی ایسا گرم ہوا کہ کسبیوں کی ہچکیاں بندھ گئیں ۔ تب آپ نے آبِ توبہ سے ان خستہ دلوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے توبہ کی فضیلت بیان کرنی شروع کی ، اور کہا کہ 'توبہ سے سب گناہ صاف ہو جاتے ہیں ۔' اس بیان سے ان بے دلوں کو کچھ ہوش آیا ۔ ۔ ۔ جب یہ وعظ ہو رہا تھا ، اس کی شہرت تمام شہر میں ہو کر ہزاروں خلقت اس کے سننے کو وہاں آ کر جمع ہوگیی تھی ، راستے بند ہو گیے تھے ، آس پاس کے کوٹھے اور بالا خانے خلقت سے بھر گیے تھے ۔' (۲ - ۳۳۱)

اس 'گرم وعظ' کی گونج غالب کے کلام میں دو جگہ سنی جا سکتی ہے - ایک جگہ تو صاف صاف بزمِ عیش و نشاط کی ناپایداری کا وہی مضمون دہرایا گیا ہے اور اس کی تاثیر بیان کی گئی ہے جو اربابِ نشاط کے سامنے شاہ صاحب نے بیان کیا :

ہم فروغِ شمعِ ہستی تیرگی خواہد گزید :
ہم بساطِ بزمِ مستی پر شکن خواہد شدن

از تب و تابِ فنا یک بارہ چون ستی سپند
ہر یکے گرمِ وداعِ خویشتن خواہد شدن

حسن را از جلوۂ نازش نفس خواہد گداخت :
نغمہ را از پردۂ سازش کفن خواہد شدن

دوسری جگہ اسی واقعے کو تہذیب نفس کی ایک موثر تلقین کے طور پر ادا کرنے کی بجائے یوں بیان کیا ہے جیسے یہ ایک طرح کا سانگ تھا جو غالب نے خود اس کے ڈرامای پہلو سے لطف اٹھانے کی خاطر رچایا :

رفتم ، کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم :
در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

در وجدِ اہلِ صومعہ ذوقِ نظارہ نیست :
ناہید را بہ زمزمہ از منظر افگنم !

معشوقہ را ز نالہ بدان سان کنم حزین
کز لاغری ز ساعدِ او زیور افگنم !

صرف یہی مضمون شاہ صاحب سے اخذ نہیں کیا گیا ۔ آن کے خیالات غالب کے 'شاہدِ مضمون' اور وہ خود ان کے 'شہریِ جان و دل' ہیں :

شاہدِ مضمون ، کہ اینک شہریِ جان و دل است

کس حسرت سے کہتے ہیں :

آن کہ صورِ نالہ از شورِ نفس موزون دہد
کاش دیدے کاین نشیدِ شوق فن خواہد شدن !

سیرت اور عمل کی ، ان کی بساط سے باہر ، وہ توقعات پوری نہ کر سکنے پر جو شاہ صاحب نے ان سے باندھیں ، غالب ساری عمر اظہارِ ندامت کرتے رہے ۔ ایک جگہ انھوں نے اس قلق کا بھی اظہار کیا ہے کہ شاہ صاحب ان کے بارے میں غم و غصہ لے کے دنیا سے رخصت ہوے ، اور انھیں یہ اندازہ لگانے کا موقع نہ ملا کہ ، 'ذوقِ خرابی' کے باوجود ، ان کی بدولت ، ان کے پرستار کے کلام میں کیسا بیش بہا خزانہ مدفون ہے :

'غالب' ز غصہ مرد : پہانا خبر نہ داشت
کاندر خرابہ گنجِ نہانے نہادہ ای[1]

[1] اندیشہ گنج ہاے نہان آشکار یافت
غالب

اس شیفتگی ، بلکہ وارفتگی کی رعایت سے جو شاہ صاحب نے آن کے بچپن ہی سے ان کے تن بدن میں سلگای ، غالب نے کبھی انہیں 'غالب' بنایا اور کبھی خود ان کا روپ دھارا :

نہانِ خود از پردہ کرد آشکار :

در اندیشہ پیوندِ قالب گرفت :
بہ خود در شد، و شکلِ 'غالب' گرفت

گم شوم در خود، و در نقشِ تو پیدا باشم

خود را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم
تا با تو خوش نشینم ، و نظارہ ہم کنم

نقشم گرفتہ دوست . . . .

صورتِ ما شدہ عکسِ تو در آینہٴ ما

'منصبِ شیفتگی' کے قابل نہ رہنے ، یا اس سے معزول ہونے کے بعد غالب اپنے کلام میں کبھی جگہ انہیں نیچے دھینچ کر اپنی سطح پر بھی لاے ہیں اور اپنے رنگ میں رنگا ہے ، اور

کبھی اس جذبے کو بھی راہ دی ہے جس کے زیرِ اثر بعض اوقات انسان ، جھنجلاہٹ یا ہٹ دھرمی سے ، اپنے محبوب ترین اشخاص اور اپنی عزیز ترین قدروں کی بے حرمتی کرتا اور انہیں ملوث یا پامال کرتا ہے -

شاہ صاحب کی شہادت کے بعد دہلی میں ہر علم و فن میں چوٹی کے آدمیوں کی کوئی کمی نہ تھی ، مگر جو جگہ وہ خالی کر گیے ، وہ خالی ہی رہی - اس کا دل دوز احساس غالب سے بڑھ کر کسے ہو سکتا تھا ، جن کی نظر میں وہ جلال و جمال کے امتزاج اور جسم و جان کی ہر خوبی کا مرقع تھے[1] اور جس کے تصور سے ان کے خیال میں آب و رنگ تھا :

چمن پر از گل و نسرین ، و دل ربائے نے :
بہ دشتِ فتنہ ازین گردِ بے سوار چہ حظ ؟

ہجومِ گل بہ گلستان ہلاکِ شوقم کرد
کہ جانہ ماندہ، و جائے تو ہم چنان خالی است

---

[1] ہیں شہ میں صفات ذوالجلالی باہم :
آثارِ جلالی و جمالی باہم

یہ 'شہ' سید صاحب یا/اور شاہ صاحب ہی ہو سکتے ہیں ، کہ ان صفات میں، یہ دونوں ہم رنگ تھے -

به بزمِ سوختن دود از چراغان بر نه می خیزد:
به باغِ خون شدن بو از گلستان بر نه می آید

مگر آتش نفس دیوانه ای مرد از اسیرانت
که دود از روزنِ دیوارِ زندان بر نه می آید

آن شور که گردابِ جگر داشت، نه دارد
ای لختِ دلِ غرقه به خون ناب، کجای؟

بوی گل و شبنم نه سزد کلبهٔ مارا:
صرصر، تو کجا رفتی، و سیلاب، کجای؟

نورِ نظر، ای گوهرِ نایاب، کجای؟

ایمانِ من، ای لذتِ دیدار، کجای؟

شوری است نوا ریزیِ تارِ نفسم را
پیدا نه ای، ای جنبشِ مضراب، کجای؟

سید صاحب اور شاہ صاحب

سید صاحب کا شاہ صاحب پر شورش انگیز اثر :

وقتِ کار این جنبشِ خلخال اندر ساقِ تست
حلقۂ رغبت بہ گوشِ خونِ منصور افگند

سرشک افشانیِ چشمِ ترش بین :
شہِ خوبان ، و گنجِ گوہرش بین !

ادائے دل ستانی رفتہ از یاد :
ہوائے جان فشانی در سرش بین !

چکد در سجدہ خون از چشمِ مستش :
گدازش ہائے نفسِ کافرش بین !

خداوندا بہ خونِ ما مگیراد !
بہ بے تابی نگہ بر خنجرش بین !

جنونِ الفت ہم چو خودے دارد ، تماشا کن :
شکستِ صد دل از رنگِ رخش پیداست ، پنداری

(نویدِ وعدهٔ قتلے بہ گوشِ من رسد ، غالب !
لبِ لعاش بہ کامِ بے دلان گویا است، پنداری)

نیرنگِ عشق شوکتِ رعنایِ تو برد :
در طالعِ تو گردشِ چشمِ سیاهِ کیست ؟

شکست رنگِ تو در عشق: خوش تماشاے است :
بہارِ دہر بہ رنگینیِ خزانِ تو نیست !

با حسن ، خویش را چہ قدر می توان شکست :
عبرت ز حالِ طرفِ کلاہش گرفتہ ایم

با خوبیِ چشم و دلش ، با گرمیِ آب و گلش
چشمِ گہر بارش بہ بین ، آه شرر نا کش نگر !

بر مقدم صید افگنے ، گوشے بر آوازش بہ بین :
در بازگشتِ توسنے، چشمے بہ فترا کش نگر !

نفس گداختنِ جلوہ در ہوائے قدت
ز خوئے فشانیِ آن روئے نازنین پیداست!

''بیعت کے بعد شاہ صاحب فنافی الشیخ ہو گیے۔۔۔مولانا محمد حسین لکھتے ہیں: راستے میں حضرت فرماتے تھے کہ 'مولانا' خدا نے سواری دی ہے، سوار ہو لو۔ بس جا کر سوار ہو جاتے۔ بیس قدم چل کر پھر اتر پڑتے اور شکار بند آکر پکڑ لیتے۔ پھر حضرت فرماتے: 'مولانا' منزل تک سوار چلو۔' ہاتھ باندھ کر عرض کرتے کہ 'حضرت، اسماعیل کو اتنی مفارقت بھی گوارا نہیں۔'

مولانا عبدالحی: ''ارمغانِ احباب''

مولوی ذوالفقار علی صاحب دیو بندی فرماتے ہیں کہ 'جب حضرت سید صاحب کی تشریف آوری کی خبر مشہور ہوئی تو۔۔۔ لوگ استقبال کو نکلے۔۔۔سید صاحب نظر آئے: ایک تانگھن پر سوار تھے، اور دونوں طرف دو شخص رکاب تھامے ہوئے چلے آتے تھے۔۔۔سید صاحب نے فرمایا کہ 'ان سے ملو: یہ مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عبدالحی ہیں۔' یہ بھی فرمایا کہ 'ان اطراف میں دیکھنے والوں نے بیان کیا ہے کہ شب کے وقت سید صاحب چارپای پر استراحت فرماتے تھے، اور ایک جانب مولانا عبدالحی، دوسری جانب مولانا محمد اسماعیل صاحب بیٹھ کر صبح کر دیتے تھے۔' بیعت کے بعد سفر حضر میں دونوں بزرگ سید صاحب کے ساتھ رہے۔۔۔فاقے کیے، لکڑیاں کاٹیں، گھاس چھیلی، اینٹیں تھاپیں، مکانات، مسجدیں بنائیں۔۔۔

مولوی محمد جعفر صاحب ''سوانحِ احمدی'' میں لکھتے ہیں:

'جس تاریخ سے یہ دونوں بزرگ داخلِ خدام ہوتے تھے، اس تاریخ سے تا مرگ بلا کسی دینی ضرورت کے آپ کی خدمتِ با برکت سے ایک دم بھی علیحدہ نہیں ہوئے۔۔۔ان کی جاں نثاری اور

اس سوز وگداز کا ابتدای مرحلہ اردو میں بیان ہوا ہے ، جس میں شاہ صاحب کے عزیز مولوی عبدالحی بھی شریک ہیں - دونوں پر اس تاثرکی روداد مہر صاحب اور ابوالحسن علی ندوی صاحب نے سید صاحب کے سوانح میں بیان کی ہیں - اس کا نچوڑ غالب کے اس شعر میں کھنچ آیا ہے :

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گیی :
دونوں کو اک نظر میں رضامند کر گیی

سید صاحب ، شاہ صاحب اور غالب : ایک مثلث

اس داستان کو شاہ صاحب کے ساتھ اپنی آمیزش سے غالب نے ایک رومانی مثلث کی شکل دے دی ہے - سید صاحب کے تصرف سے شاہ صاحب کی قلبِ ماہیت پر ان کی لطیف تعریض کے لب و

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

فرماں برداری ضرب المثل ہے - دونوں بزرگ آپ کی پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنے کو فخر دارین جانتے تھے ، اور ان دونوں سرتاج علماء دہلی نے ، جن کی تعظیم بادشاہِ دہلی تک کرتے تھے ، اپنے تئیں بالکل مٹا دیا تھا -' 'جب سے مولوی عبدالحی نے 'زبدۂ ساداتِ کرام' اسوۂ اولیاے عظام' سید احمد مغفور مبرور کی خدمت میں : پہنچ کر بیعت کی تادمِ زیست ان کے سایہ عاطفت سے کبھی علیحدہ نہ ہوے - سفر حضر میں ، مثل سایے کے ، ان کی بیعت میں حاضر رہتے-' ''آثار الصنادید''

لہجے کی سطح آشنایانہ ہے :

آینہ دیکھ ، اپنا سا منہ لے کے رہ گیے:
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا !

دل لگا کر آپ بھی 'غالب' ، مجھی سے ہو گیے ؟
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحبؔ مجھے !

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا :
بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پای داد یاں !

عاشق ہوے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر :
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے !

بعد کے کلام میں سید صاحب کی خدمت میں شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی کی مستقل یک جای کا حال موجود ہے :

سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دل کش سے جو گلزار میں آوے

(کانٹوں کی زباں سوکھ گیی پیاس سے ، یا رب !)
اک آبلہ پا وادیِ پر خار میں آوے)

غالب نے جس انداز سے شاہ صاحب کو مسخر کر کے سید صاحب

کے دہلی سے رخصت ہونے کا ذکر کیا ہے ، اس سے ان کا رقیبانہ جذبہ صاف جھلکتا ہے :

رہ زنی ہے ، کہ دل ستانی ہے ؟
لے کے دل ، دل ستاں روانہ ہوا!

('رہ زنی' سید صاحب کی امیر خاں کے ساتھ پرانی رفاقت کی رعایت سے) -

دیوانۂ ما را صنمِ سلسلہ مو برد

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر ، غالب !
وہ کافر ، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے!

'خرام' :
پروفیسر حمید احمد خاں نے 'غالب کی شاعری میں حسن و عشق' پر اپنے مضمون میں ان کا یہ شعر نقل کیا ہے :

بتے دارم کہ گوی گر بہ سوے سبزہ بخرامد
زمین ، چو طوطیِ بسمل ، تپد از ذوقِ رفتارش

ا ممکن ہے امیر خسرو کا یہ شعر بھی غالب کے ذہن میں ہو :
عزمِ تماشا کردہ ای : آہنگِ صحرا کردہ ای
جان و دلِ ما بردہ ای : این است رسمِ دل بری؟

اگلے شعر کے اس مصرعے سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے :
عالم ہمہ یغماے تو : خلقے ہمہ شیداے تو

اس پر ان کا حاشیہ یہ ہے :

'اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس زندگی سے بھرپور ، متحرک اور مضطرب حسن سے غالب کے دل و دماغ کو کیا تعلق ہے ۔'
اختر اقبال کمالی صاحب نے غالب کی تماثیل کا مطالعہ بڑے بامعنی طریقے سے کیا ہے ۔ اس بحث پر گفتگو کے ضمن میں انھوں نے لکھا ہے :

'ان کی تماثیلِ شعری عموماً ساکن و جامد نہیں ہوتیں ، بلکہ ان میں (بالفعل نہیں ، بالقوۃ) حرکت ، تیز روی اور گرم جولانی کا احساس ہوتا ہے ، جو بداہتہً حسِ حرکت (Kinaesthetic sense) کی پیداوار ہے ۔' رفتار و خرام سے ان کی وابستگی کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ انھوں نے جس خیالی معشوق کا مرقع کھینچا ہے' اس کے سامانِ حسن و رعنائی میں اندازِ خرام کو خاص حیثیت حاصل ہے ۔'

'صحیفہ' ، جنوری ۱۹۶۹

ان اہلِ نظر نقادوں کی نظر ان صفات کے حامل تک نہیں پہنچی ، چونکہ ، روایت کے مطابق ، وہ پہلے ہی سے یہ طے کر چکے تھے کہ یہ محبوب محض 'خیالی' ہے ۔ اگر ان نشانات کو جو خود ان کے بیانات میں آئے ہیں اور زیادہ کریدا جاتا ، تو وہ ذات اور

'دراصل غالب کے کلام میں سکون اور حرکت دونوں کی آمیزش اور آویزش ملتی ہے ۔ اس سے ہم الگ بحث کریں گے ۔

جذبہ جن کی انھیں جستجو تھی ، خود بہ خود رونما ہو جاتے - ہم پہلے غالب کے کچھ ایسے شعر ایک جگہ کرتے ہیں جن میں 'خرام' کا لفظ ایک مخصوص مفہوم میں استعمال ہوا ہے :

خرامے ز مقراضِ لا تیز تر

رفتارِ تو گر آینہ خاک زواید
از پردۂ ہر دیدہ دمد دیدۂ بینا

ہم موجہ رفتارِ تو ذوقِ رخِ یوسف

در گردِ خرامِ تو نگہ ریشہ طوبیٰ

بہ رگ نشتر زن از موجِ خرامِ ناز صحرا را

چمن سامان بترے دارم ، کہ دارد وقتِ گل چیدن
خرامے، کز ادائے خویش ہر گل کردہ دامان را

بہ اندازِ صبوحی ، چون بہ گلشن ترکتاز آی
پریدن ہائے رنگِ گل شفق گردد گلستان را

ز مستی محوِ پاکوبی بود ہر گرد باد این جا :
رواجِ خانقاہ است از کفِ خاکم بیابان را

دماغِ تشنہ می نازد بہ سامانِ رسیدن ہا :
طلوعِ نشہ گردِ راہ باشد خوش خرامان را

(رسیدن ہائے منقار بہ براستخوان ، غالب !
پس از عمرے بہ یادم داد راہ و رسمِ پیکان را)

یہ 'پا کوبی' جو بہ یک وقت 'رواجِ خانقاہ' سے بھی تعلق رکھتی ہے ، اور بیابان اور گرد باد سے بھی ، جس کے 'ترکتاز' اور 'راہ و رسمِ پیکاں' میں اتنی حرارت ، اتنی شادابی ہے ، کرشمہ ہے ایک 'چمن ساماں بت' کا ، کہ جگہ جگہ سے اپنی جھولی پھولوں سے بھرتا پھرتا ہے ۔ اس 'بتِ عربدہ جو' 'بیداد فن' کا ایک روپ 'ہما' کا بھی ہے ، جس کی 'منقار' اس کے جاں باز معتقد ہیں ، جن کے ذریعے وہ ایک زوال آمادہ قوم و ملت کو جدوجہد کے ذریعے نئی زندگی بخشنا چاہتا ہے ۔ اسے غالب نے 'ساقیِ طاؤس خرام' بھی کہا ہے ۔ طاؤس کے لفظ میں 'روانیِ روش و مستیِ ادا' کے علاوہ ، تختِ طاؤس کا تصور بھی مضمر ہے ، جو قوت و شوکت کی علامت ہے ، جس کی بازیابی کے لیے یہ 'سرو قد گرمِ خرامِ ناز' تھا ۔

اب اردو کلام سے کچھ شعر نقل کیے جاتے ہیں ، جن میں 'خرام' یا 'نقشِ قدم' آیا ہے :

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں!

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا :
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گیی !

اس رفتار اور نقشِ قدم نے غالب پر وارفتگی کی کیفیت طاری کی مگر جنبش کی قوت نہ بخشی :

صورتِ نقشِ قدم ، ہوں رفتہ' رفتارِ دوست

ڈاکٹر خورشیدالاسلام نے غالب پر اپنی تالیف میں لکھا ہے :
'یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا . . . . .
غالب کی شاعری میں . . . . حیات و کاینات کی کوی ایسی

''جہاں جہاں حضرت (سید احمد) کے قدم گیے ، وہاں وہاں برکت کے آثار پاے جاتے ہیں ۔ گویا ایک نور مستطیل ، ہے کہ جدھر جدھر وہ گیے ، آدھر آدھر وہ پھیل گیا ۔'

منقول از ''ارمغانِ احباب''

'آپ کا پورا سفر بارانِ رحمت کی طرح تھا ، کہ جہاں سے گزرتا ہے سرسبزی و شادابی ، بہار و برکت چھوڑ جاتا ہے'. . .

اس تمام سفر میں مولانا اسماعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب ہم رکاب تھے ۔ ان کے مواعظ سے بہت اصلاح و انقلاب ہوا ۔'
''سیرتِ سید احمد شہید''

تصویر بھی ہے جس کو دیکھتے ہی ہمارے سامنے وہ صحرا بے حجاب ہو جائیں جہاں قیس کی رفتار خود بہ خود تیز ہو جاتی ہے ، اور جرس کی آواز سنای دینے لگتی ہے ۔'

اس سوال کا جواب بھی ، اور سب سوالوں کی طرح جو غالب کے کلام کے بارے میں اٹھائے گیے ہیں یا اٹھائے جا سکتے ہیں ، خود کلام میں موجود ہے :

راز زہن دیدہ وران 'پرس' کہ در گرم روی[۱]
جادہ ، چون نبض ، تپان در تنِ صحرا بینند

اس صورت میں 'صحرا' خود بہ خود 'بے حجاب' ہو جائے گا :

سپہے چند پراگندہ بہ میدان نگرند
علمے چند درخشندہ بہ پہنا بینند

صحرا میں یہ منتشر سپاہ اور تابندہ علم سید احمد شہید کی مہمِ آزادی کے ہیں ۔ یہ 'صحرا' ہی جد و جہاد کا وہ میدانِ کارزار ہے جس کے تصور سے غالب زنداں میں بھی بیاباں نورد

---

۱ 'رفتارِ گرم' کے ساتھ غالب ایک جگہ 'تیشہ' تیز' لاے ہیں ، اور ایک دوسری جگہ کہا ہے :
در گرم روی سایہ و سرچشمہ نہ جوییم

رہے[1] اور جس کے اتار چڑھاو کی رو داد ان کی تخلیقی کاوش کا ایک اہم ترکیبی عنصر ہے :

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا ، کہ صحرا جل گیا

جنوں بہ بادیہ پروازِ گلستاں بخشید

خزانِ ما بہارِ دامنِ صحراست ، پنداری

بہ گوشم می رسد از دور آواز درا امشب
دلے گم گشتہ اے درام ، کہ در صحراست ، پنداری[1]

یہ آن بھی نبرد آزما صحرا نوردوں کا فیضان ہے کہ

غبارِ طرفِ مزارم بہ پیچ و تابے ہست :
ہنوز در رگِ اندیشہ اضطرابے ہست

---

[1] شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو ، کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

ہنوزم در آینہ رنگے ہست
خیالے ازان عالمِ نور ہست

کہ بینی بہ تاریکئِ روزِ من
فروزان سوادِ دل افروزِ من

کفِ خاکِ من زان ضیا گستری ست
کہ چون ریگِ رخشاں بہ انجم گری ست

بعدِ مردن مشتِ خاکم در نوردِ صرصراست :
بے قراری می زند موج از سراپا یم ہنوز

یہی وہ صحرا ہے جس کا 'قانونِ باغبانی' انھوں نے لکھا ہے -

'حرفِ ندا'

سید صاحب :

اے بہ فرتابِ نظر ، مظہرِ آثارِ خرد!

اے نگاہت الفِ صیقلِ ما!

اے بہ خلا و ملا خوے تو ہنگامہ زا!

اے متاعِ دو جہان رنگ بہ عرض آوردہ!

اے آنکہ کند سایۂ دستِ تو ہمای!

اے کہ از تو می آید خس شرر کردن!

شادباش ، اے غم ، زبیمِ مرگ ایمن ساختی!

شاد صاحب :

فرصت باد ، ساقیِ چالاک!
اے بہ دفعِ غم ایزدی سرہنگ!

اے بہ رخ ماہ و اے بہ خوے پلنگ!

اے مرگ ، مرحبا : چہ گران مایہ دل بری!

ایمانِ من ، اے لذتِ دیدار ، کجای؟

نورِ نظر ، اے گوہرِ نایاب ، کجای؟

اے لختِ دلِ غرقہ بہ خون ناب ، کجای؟

سید صاحب اور شاہ صاحب سے وابستگی کا اتار چڑھاو

غالب نے تحریک و محرکینِ جد و جہاد، خصوصاً شاہ اسماعیل سے اپنے لگاو کی نوعیت اور اس کے اتار چڑھاو کی روداد بڑی دیانت داری سے رقم کی ہے۔

'دوست':

گر دوست، و گر خواجہ پہان است
رنگے کہ در خیالِ خود اندوختم ز دوست

نقشے ز خود بہ راہ گزر بستہ ایم ما:
با دوست راہِ ذوقِ نظر بستہ ایم ما

از کوے دوست رختِ سفر بستہ ایم ما

آن کہ از دوست درین دایرہ تنہا ماند
جز دران خانہ نہ ماند کہ بہ صحرا ماند

مست و پر عربدہ برخارِ بیابان غالب
کز رہِ دوست نشان برہمہ اعضا ماند

جا گرفتن به دلِ دوست نه اندازهٔ ماست

غالب و دوست آبگینه و سنگ!

شکوه از دوست نه توان کرد :
بادهٔ تند سازگار تر است

(نگه از تیغ آب دار است)

نشسته ام به رهِ دوست پر ز دوست

جنونِ ساخته دارم : چه خوش بود ، غالب!
که دوست سلسلهٔ امتحان بجنباند!

'عشق' :

منم آن بنده که با خواجه بمی و رزم عشق

شررِ آتشِ رخشندهٔ عشقم

دعویِ عشق ز ما کیست که باور نه کند؟
می جهد خونِ دل ما ز رگِ گردنِ ما

دارم سرِ عشقِ تو، ولے ترسم از آشوب

عشق ز خاکِ درت سرمۂ بینش گرفت :
باوه در آمد ہوس : نسخۂ اکسیر برد

گیرم ز داغِ تو طرفے نہ بست دل
اینم نہ بس بود کہ جگر روشناسِ کیست؟

صاحبدل است و نامور : عشقم بہ سامان خوش نہ کرد
آشوبِ پیدا ننگِ او ، اندوہِ پنہاں خوش نہ کرد

'شوق':

این چہ شور است کہ از شوقِ تو در سر دارم؟
دلِ پروانہ و تمکینِ سمندر دارم

ہر ذرۂ خاکم ز تو رقصان بہ ہواے ست :
دیوانگیِ شوق سرانجام نہ دارد

ترکتازِ شوقِ تو ام از جا ربود
ورنہ با خود پاسِ ناموسِ غبارے داشتم

عرصهٔ شوقِ ترا مشتِ غباریم

کار فرمایِ شوقِ تو قیامت آورد

سر گرمیِ شوقِ تو بود حوصله فرسا

شوقِ تو جاده کرد رگِ خوابِ پاے را

شوقت محیط ، وما ، چوخس ، از سبک سری
خود را درین محیط شناور گرفته ایم !

'زیر و بمِ نغمۂ ہستی و عدم'

کوی سرسری مطالعہ کرنے والا بھی غالب کے خیالات اور جذبات کے تنوع ، بلکہ عدم توافق اور تناقض ، سے ٹکرائے بغیر نہیں رہ سکتا :

غالب ، تو زیر پردہ نوائے دارد :
ہر گوشہ اے از دہر فضائے دارد !![1]

مگوے زا پیچ ، کاین جامع ایست از اضداد

مافیہ کی یہ صورت کیسے پیدا ہوی ، اس پر میرے علم میں کسی ناقد نے توجہ نہیں کی - اس سوال پر ایک مدت کی آدھیڑ بن کے بعد ، مجھے جو کچھ حاصل ہوا ، وہ یہ ہے کہ تخلیقی عمر شروع ہوتے ہی غالب کی اثر پذیر طبیعت کا سابقہ شاہ اسماعیل اور مولوی فضلِ حق جیسے دو سراسر مختلف مزاج اور متناقض مسلک کے جید (اور جابر) معلموں سے پڑا ، اور دونوں نے انھیں اپنے رنگ میں رنگنے اور اپنے مخصوص عقاید کا ترجمان اور نقیب بنانے کی خاطر ایڑی سے چوٹی تک زور لگایا ، اور اسے گویا اپنی قوتِ

---

[1] زمان و مکان را ورق در نورد :
خیالے برون ریز از ہر نورد

اقبال

تسخیر کا امتحان بنا لیا ۔ ذوق کا ایک مصرع ہے :

ایک طعمہ ، مچھلیاں دو ؛ کش مکش آپس میں ہے

یہ تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ایسے لکھتے وقت یہی کھینچاتانی پیشِ نظر تھی ، مگر اس سے وہ صورتِ حال بڑی خوبی سے بیان ہوگئی ۔ شاہ اسماعیل نے اپنی مقناطیسی شخصیت اور مجاہدانہ حرارت کے زور سے نوجوان میرزا کو کچھ دیر کے لیے زبردستی سید احمد شہید کے حلقۂ ارادت میں داخل کرایا ، اور درپے وہ اس کے تھے کہ انھیں اپنے ساتھ میدانِ کارزار میں بھی گھسیٹیں ۔ مگر ان کی ذات سے انتہای شیفتگی اور جذباتی ہم فکری کے باوجود ، اپنے بے تکلف دوست فضلِ حق کی مشفقانہ روک تھام[۱] اور ڈانٹ ڈپٹ[۲]، اور خود اپنی وارستہ مزاجی[۳] اور 'ذوق کام جوی'[۴]

---

[۱] اے عدوے مصلحت ، چندے بہ ضبط افسردہ رہ
اے دل ناعاقبت اندیش ، ضبطِ شوق کر

[۲] نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آی

[۳] نو دریافت بیاض میں اس کی شہادت موجود ہے کہ نو عمری ہی سے وہ زندگی کے اس ڈھرے پر پڑ لیے تھے، جس پر وہ اظہارِ ندامت و ملامت کے باوجود ، کم و بیش ساری عمر چلتے رہے :

ہمیشہ مجھ کو طفلی میں بھی مشق تیرہ روزی تھی
شومیِ طالع سے ہوں ذوقِ معاصی میں اسیر
خمیدن نشۂ مے میں ہے شرمِ زشت اعمالی

[۴] در پرستش سستم ، و در کام جوی استوار

کی بدولت ، جو بچپن ہی سے ان کی خصلت بن چکے تھے ، ان کا جد و جہاد کا ولولہ ، جسے بعد میں انھوں نے 'جنونِ ساختہ' قرار دیا ، کچھ دیر کو ابلا ، پھر بیٹھ گیا ۔ مگر یہ جذبہ ان کے دست و بازو کے رگ پٹھے سے نکل کر ان کے دل و دماغ میں سما گیا ، اور برابر اظہار پاتا رہا ۔ دوسری طرف مولوی فضلِ حق کا اثر بھی ، بعض لحاظ سے ، بڑا قوی تھا ۔ ان کے توحیدِ وجودی عقیدے کی گرفت غالب کے روز افزوں 'عافیت گزیں' اور صلح کل میلان کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی ، اور وہ ان کے تخلیقی شعور پر آخر دم تک اثر انداز ہوتا رہا ۔ غالب کے کلام میں تخالف اور تناقض کے جو اجزا ملتے ہیں ، وہ زیادہ تر ان ہی دو غیر متجانس اثرات سے نکلے ہیں ۔ مگر ان کے اپنے مزاج میں گونا گوں تصورات اور جذبات کو یکے بعد دیگرے ، اور پہلو بہ پہلو ، جگہ دینے کی صلاحیت نہ ہوتی تو یہ ، خود ان کے الفاظ میں ، 'بہ اضداد بخشد آمیزش ، کی صورت کیسے پیدا ہو سکتی تھی ؟

اس دعوے کے ثبوت میں کچھ ایسے شعر پیش کیے جاتے ہیں جن میں امیر خان کی سپرافگنی اور تحریکِ جد و جہاد کے سیاق و سباق میں ، دو مختلف مزاج اور مسلک جھلکتے ہیں : ایک فعال ، دوسرا مجہولیت و عافیت پسند ۔

سرنگونی کی مذمت اور مخالفت/حمایت :

عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سایل باندھا

جز خطِ عجز ، نقشِ تمنا نہ کھینچیے

دام گاہِ عجز میں سامانِ آسایش کہاں ؟

نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وا ے تسلیم و بدا حالِ وفا !

اسد ، سودا ے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر

سید صاحب کے زیرِ سایہ جد و جہد کا جذبہ/ اس کی مخالفت :

یک بیاباں سایۂ بالِ ہما ہو جا ے !

وحشت بہ زیرِ سایۂ بالِ ہما کروں

سرپر وبالِ سایۂ بالِ ہما نہ مانگ[1]

---

[1] ہما کی سایہ گستری کا ناگوارِ خاطر ہونا :

اے کہ اندرین وادی مژدہ از ہما دادی
برسرم ز آزادی سایہ را گرانی ہاست

بہ فرقم ارہ طلوعِ پرِ ہما دارد

'ہما' سے سید صاحب مراد ہیں ، جن کے زیرِ سایہ قوت و شوکت کی بازیابی مطلوب اور متوقع تھی۔

ابتدای ناکامی کے باوجود ، جد و جہد جاری رکھنے کا مشورہ/اس کی مخالفت :

دردِ طلب بہ آبلۂ نا دمیدہ کھینچ

پائے طلب بہ آبلۂ پا نہ کھینچیے

اے خارِ دشت ، دامنِ شوقِ رمیدہ کھینچ

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے رو کشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں !

رفتار سے شیرازۂ اجزاے قدم باندھ

جب کہ نقشِ مدعا ہووے نہ جز موجِ سراب
وادیِ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث

انتہای بے بضاعتی کے باوجود ، سید صاحب کی دعوتِ عمل سے توقع/اس کی حوصلہ شکنی :

مگر ایک شہ پرِ مور کرے سازِ بادبانی

چیونٹی کے پر سرو برگِ خود آرای نہیں

شیرازۂ دو عالم یک آہِ نارسا ہے

جب نالہ خوں ہو، ظالم، تاثیر کیا بلا ہے!

اشک پیدا کر، اسد گر آہ بے تاثیر ہے

اشک دو بے سرو پا باندھتے ہیں

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟

کس نے دیکھا اثرِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کس نے پایا اثر نالۂ دل ہائے حزیں؟

جذبۂ آزادی / عافیت طلبی:

اے بالِ اضطراب، کہاں تک فسردگی؟

عافیت سرمایۂ بال و پرِ نکشودہ ہے

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

بیضہ آسا، ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس :

از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

ادعائے قوت/ناطاقتی :

اک پرزدن میں کرِ نفس ہے تمام

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا

رگِ رہ کیوں کھینچے؟ واماندگی کو عشق ہے

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال وپر میں خاک نہیں

جد و جہد آزادی کی تڑپ/اسے ہوس پر محمول کرنا اور فریب قرار دینا :

بس کہ ہوں، غالب، اسیری میں بھی آتش زیرِ پا

نالۂ دامِ ہوس ، و دردِ اسیری معلوم !

ہے مشق ، اسد ، دست گہِ وصل کی منظور

اے اسد ، دست گہِ وصلِ تمنا معلوم !

ہزیمت اور بے سرو سامانی کے باوجود، جد و جہد کی از سرِ نو تیاری راسے 'سعیِ بے حاصل' سمجھنا :

کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

پیچ و تابِ جادہ ہے خطِ کفِ افسوس و بس !

مگر وہ شوخ[1] بے ساماں طرازِ شوقِ خوں ریزی

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز

بے سرو ساماں اسد[2] فتنۂ سرانجام ہے

دست گہِ دیدۂ خوں بارِ مجنوں دیکھنا !

---

۱ 'شوخ' : شاہ صاحب

۲ 'اسد' : سید صاحب

دست فرسودِ ہوس وہمِ توانائی

جوش و ولولہ/افسردگی :

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی

رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو !

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے

موجِ مے ، مثلِ خطِ جام ، ہے ہر جا ماندہ

صبا خرامیِ خوباں بہار ساماں ہے

غنچۂ خاطر رہا افسردگی مانوس ، و بس !

غیر مسلم تصرف پر پیچ و تاب/تقاضائے مصلحت :

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے ، جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

زنار باندھ : سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال :
رہ رو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

اب کچھ ایسے شعر پیش کیے جاتے ہیں جن سے ، اسی پس منظر میں ، غالب کے جذبات کے اتار چڑھاو کی اور شہادت ملے گی - یہ کسی بیرونی اثر کا نتیجہ نہیں : ان میں تمام تر آن کی طبعی رنگارنگی اور خود شناسی جھلکتی ہے -

سید صاحب کی تحریکِ اصلاح و عمل سے تعلق : ادعا اور حقیقت :

نگہ کی ہم نے پیدا رشتۂ ربطِ تعلق سے

کچھ نہیں حاصل تعلق میں بغیر از کش مکش

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں آئینے کا سبز ہو جانا

صفائے حیرتِ آینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

اے جوشِ عشق، بادۂ مرد آزما مجھے!

ہے یوں کہ مجھے دردِ تہِ جام بہت ہے

خم خانۂ جنوں میں دماغِ رسیدہ ہوں

اے دماغِ نارسا، خم خانۂ منزل نہ پوچھ!

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینا بے شراب، و دلِ بے ہوائے گل

چشم بے خونِ دل، و دل تہی از جوشِ نگاہ:
بہ زباں عرضِ فسونِ ہوسِ گل کب تک؟

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا

الفتِ گل سے غلط ہے دعویِ وارستگی

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ ، اسد!

محبت تھی چمن سے ، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس ، واں نکہتِ گل ہے :
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوای کا

(دگل: سید صاحب/شاہ صاحب)

ہنوز اک پر توِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا ، غالب!
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزاے پریشاں کا

ہے شعلۂ شمشیرِ فنا حوصلہ افگر

تسکیں کو ہو نوید ، کہ مرنے کی آس ہے

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے؟

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں :
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں اس کے توسن کو

جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟

رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

ہم کوی ترکِ وفا کرتے ہیں ؟
نہ سہی عشق : مصیبت ہی سہی!

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت :
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

دلِ گداختہ کے مے کدے میں ساغر کھینچ

ہے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں

گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں

شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

کچھ اور مثالیں، جن سے فکر یا جذبے کا زیر و بم ظاہر ہوتا ہے:

فریاد سے پیدا ہے، اسد، گرمیِ وحشت

آہ، وہ جرأتِ فریاد کہاں؟

عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

عشق پر عربدہ کے گوں دلِ رنجور نہیں

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب

حاصل نہ کیجیے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم؟ اندھیر ہے!

رشک آسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

بے رونقی سوادِ چراغِ کشتہ ہے

گیی نہ خاک ہوے ہر ہوائے جلوۂ ناز

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں :
بارے اب ، اے ہوا ، ہوسِ بال و پر گیی

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں

نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آی

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ایسا آساں نہیں لہو رونا

ہیں گرفتارِ وفا : زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ؟

ہاں ، کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا

غالب نے اپنے آہنگ کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ

ہنجارِ دم از زیر جدا ساختہ بم را

دادی صلائے جلوہ، وغالب کنارہ کرد :
کو بخشِ آن گدا کہ ز غوغا نفور بود ؟

دارم بہ کنجِ غم کدہ رشکِ کسے، کہ او
در جلوہ گاہِ دوست بہ غوغا شود ہلاک

صلائے قتل دہ ، و جان فشانیِ ما بین !

اس کے ثبوت میں ان کے کچھ فارسی شعر پیش کیے جاتے ہیں ، جن سے ان کی خود نگری بھی واضح ہوتی ہے - پس منظر ان کا بھی وہی ہے -

ذوقِ ایمان در نہادم بود تا گفتم : بلے !

منم کہ بر دل و دین اعتمادم نیست

ز ایمانیان گویم ، ایما نیم

رخشندگیِ جوہرِ ایمانم سوخت

ز سرد مہریِ ایام نیستیم نزند
کہ در خرابۂ ما روے آفتابے ہست

آن اسیرِ تیره روزستم، کہ عمرے درجہان
آفتاب از روزنِ دیوارِ زندان دیدہ ام

از مہرِ جہان تاب امیدِ نظرم نیست

پر توِ مہر سیاہی ز گلیمم نہ برد

('آفتاب' : سید صاحب)

از فیض بخشیِ نفسش غفلت آگہی

دریغ آگہیے، کہ فسردگی گردد سر و برگش!

قماشِ ہستیِ من یکسر آتش است، آتش!

سرابِ آتش از افسردگی، چون شمعِ تصویرم

رفتارِ گرم، و تیشۂ تیزم سپردہ اند

بدین سوزم رواجے نیست: بے فرہاد را نازم
کہ از تابِ شرارِ تیشۂ گرم است بازارش!

آرایشِ زمانہ ز بیداد کردہ اند :
بر خون کہ ریخت ، غازۂ روے زمین شناس

آن کہ خواہد در صفِ مردان بقاے نامِ خویش
خونِ دشمن سرخ تر از خونِ فرزندش بود

طرفِ فتنۂ دل ہاے توانا باشم
نہ توانست بہ ہنگامہ طرف شد

نویدِ التفاتِ شوق دادم از بلاجان را
تاب و طاقت بہ خمِ دامِ بلاگشت تلف

رفت آن کہ خویش را بہ بلاشاد کردمے
دلم در حلقۂ دامِ بلا می رقصد از شادی

پاے کوبان بہ سرِ خارِ مغیلان رفتم

آغشته ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل

مست و پر عربدہ بر خارِ بیابان غلتم

پائے بر نہ می تابد رنجِ کاوشِ خارے

پا و داغِ رفتارے ! دست و حسرتِ کارے !

آیینِ برہمن بہ نہایت رسانده ایم :
غالب ، بیا کہ شیوۂ آزر کنیم طرح

دلم در کعبہ از تنگی گرفت : آوارۂ خواہم
کہ با من وسعتِ بت خانہ ہائے ہند و چین گوید

'پارۂ' بیش است از گفتارِ ما کردارِ ما'

بو کہ توفیق ز گفتار بہ کردار برد !

در بادۂ اندیشہ' ما درد نہ بینی

' ظہوری

بہ دردِ مے از جامِ اندیشہ مست

خوے سر کشم دادی : عجزِ من دستگاہ

اسداللہ بخت برگشتہ :
در خم و پیچِ عجز سر گشتہ

در مشربِ حریفاں منع است خود نمای

طبع را از خود نمای احترازے بودہ است

'خود نمای خدا پرستی ہا ست'[1]

سختیِ دہر شود طبعِ مرا سنگِ فسان

شود روانیِ طبعم فزون ز سختیِ دہر

بہ سنگِ تیز تواں کرد تیغِ براں را

---

[1] یہ مصرع ظہوری کا ہے

ہر چہ با شوق ملایم نہ فتد ، مرگِ دل است
ہر چہ بر طبع گوارا نہ بود ، جان فرساست

صلہ جو نیستم ، و شعر فروشی نہ کنم

من ثنا خوانِ شہنشاہِ فرنگم

خطاب و خلعتِ و پنسن ز شاہ می خواہم

غالب نے اپنی طینت کے اجزائے ترکیبی کا جو تجزیہ کیا ہے ، اس کی رو سے یہ طینت مشتمل ہے جسم و جان کی فعال اور مجہول، نرم اور گرم کیفیتوں پر ، جنھیں انھوں نے 'طریقِ عربی ''مذاقِ مشربِ فقرِ محمدی' ، اور 'نہادِ عجمی' کا نام دیا ہے - اب ہم ان کے کلام کے کچھ ایسے ٹکڑے پیش کرتے ہیں جن سے ان اجزا کی رونمائی ہوگی ، اور اندازہ ہوگا کہ غالب نے اپنے مزاج میں کس بصیرت سے غواصی کی ہے :

نہ مومن ، نہ کافر :

غالب نہ بود مومن ، و کافر نہ توان گفت

عمل اور، عقیدہ اور :

قدم بہ بت کدہ ، و سر بر آستانۂ تست

'مشربِ حق' اور 'رندی' کی آمیزش :

منصورِ لا ابالیے بے دار و بے رسن

ہلاکِ مشربِ رندانِ پارسا ستمے

مشربِ حق گزیدہ ایم ، عیشِ مغانہ کردہ ایم

فیضِ نتیجۂ ورع از مے و نغمہ یافتیم :

زہرۂ ما بر این افق دادہ فروغِ مشتری

جلوۂ برقے در ابرِ دامنِ تر داشتم

(رندی کے پسِ پردہ جذبۂ فقر و فنا)

سختی اور نرمی کی آمیزش :

سخت جانیم ، و قماشِ خاطرِ ما نازک است

"مرا از وارستگی ہم دل نرم است ، و ہم زبان درشت"

"پنج آہنگ"

باوجودِ سختِ جانی ہا ، تنک رویم ما

من ، کہ طبعِ بلبل و شغلِ سمندر داشتم

دلِ پروانہ ز تمکینِ سمندر دارم

از برون سو آبم ، اما از درون سو آتشم :
ماہی ار جوی ، سمندر یابی از دریاے من

بیداری اور بے خودی کی آمیزش :

ہوش پرکار کشاے ورقِ بے خبری است

آمیزشے غریبے باشد بہ ہوش رم را

نمک فشانیِ مستی بہ مغزِ ہشیاری

مرا کہ ز بیداریِ دل دیدہ بہ خواب است

جمود میں حرکت :

پیوستہ پر فشان ، و نہ جستہ ز آشیان :
وا ماندنم ز پویہ بہ جولان برابر است

رگِ سنگم : شرارے می نویسم
کفِ خاکم : غبارے می نویسم

کس بر نہ تابد این دو صفت ضدِ یک دگر :
و اماندہ ام چو خاک ، و پراگندہ چون غبار

تحریکِ جد و جہاد سے غالب کے تعلق کی حدود

کشش اور گریز کی ملی جلی کیفیت :

بہرہ از وجودم نیست : زین کشش کشودم نیست :
پا و داغِ رفتارے ! دست و حسرتِ کارے !

وہ کہ، با چنین طاقت ، راہ بر دمِ تیغ است !
پائے بر نمی تابد رنجِ کاوشِ خارے

بگزار ، کہ از راہ نشینانِ تو باشم
پائے کہ شود مرحلہ پیمائے ، نہ دارم

نازِ تو فراوان بود ، و صبرِ من اندک :
تو دست و دلے داری ، و من پائے نہ دارم

خود رشتہ زند موجِ گہر گرچہ ، من اکنون
جز رعشہ بہ دستِ گہر آمائے نہ دارم

دل زان مژۂ تیز ، بہ یک بار کشیدن[1]
دامن ز درشتی بود از خار کشیدن

از بس کہ دل آویز بود جادۂ راہت :
ز حمت دہدم پائے ز رفتار کشیدن

بہ گل ہائے بہشتم مژدہ نہ توان داد در راہش
من و خاکے ، نہ از نقشِ کفِ پائے نشان دارد

غالب کے دل و دماغ میں کش مکش : ضبط و تحمل سے بیزاری ، مگر عمل کی کڑیاں نہ جھیل سکنا :

دل از تمکین گرفت ، و تابِ و حشت نبرد ، غالب !

اپنی اس مخلوط داخلی کیفیت کا غالب نے معروضی محاکمہ بھی کیا ہے :

ازان گردے کہ در راہش نشیند بر رخم ، غالب !
چہ خیزد ، چون ہم از من رخ ، ہم از من آستین باشد

---

[1] اس 'مژہ' کا مرجع اس مصرعے سے ظاہر ہے :
شہیدِ آن مژہ ہائے دراز باید بود

تحریک سے اثر اندوزی کا اشارتی اظہار

اپنے مزاج کے عشرت و عافیت کوش پہلو، اور اپنے مصلحت اندیش دوست فضلِ حق کی روک تھام کے باوجود، غالب نے شاہ اسماعیل کے زیرِ اثر، ابتدائے سخن، سرای سے شوریدہ و شورش انگیز خیالات و جذبات کا اظہار شروع کر دیا۔ روک تھام اور اس کی خلاف ورزی کا اندازہ ان اشعار سے ہو جائے گا:

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے:
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

علی الرغمِ دشمن، شہیدِ وفا ہوں

بہ سودایت بہاں اندازِ از خود رفتنی دارم
اگر، چوں نالہ‌ٔ زنجیر، بند از آہنم باشد

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

جس 'خوف و خطر' کے عالم میں انھوں نے اس نوعیت کے قافیہ کو اپنے کلام میں جگہ دی، اس کی شہادت یہ شعر دیتے ہیں :

ہم ز آغاز بہ خوف و خطر ستم، غالب !
ہرچہ ز اندیشہ خاست، در خط افتادہ است

چون نویسم غزل، اندیشہ ز غماز کنم

ہر چند اظہار کا مرموز پیرایہ اختیار کیا گیا، پھر بھی :

در پردہ سنجی از دمِ خویشم رسد گزند :
در رہ روی ز سایۂ خویشم بود ہراس

چونکہ سابقہ مولوی فضلِ حق جیسے 'شیخِ نکتہ داں' سے تھا اور اندیشہ تھا کہ بات کہیں ان ہی تک نہ رہے اور اغیار کے کانوں تک پہنچ جائے - ان خدشوں میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود، غالب تحریک و محرکینِ جد و جہاد کے بارے میں اپنے اصلی جذبات ادا کرنے سے کبھی نہیں چوکے - اس غرض سے انھوں نے جن متنوع نشانوں سے کام لیا، اور انھیں جس طرح وہ اپنے کام میں لائے، اس کی کچھ مثالیں ہر نشان کی سرخی بنا کر پیش کی جاتی ہیں -

'لا' :

چون طرح شود با الفِ صیقلِ ایمان
در دیدۂ توفیق دہد جلوۂ الا

وان تیغِ دو سر ، کز اثرِ شرک زوای
بر کو کبۂ کفر زند صاعقۂ لا

ساقیِ ہمت کہ صلا می دہد
بادہ ز خم خانۂ لا می دہد

چاکِ لا اندر گریبانِ جہت افگندہ ایم

لا کے تصور سے بے خرد ہونا :

بے خویش قدح می زنم از خم کدۂ لا

'فقر و فنا' کی 'خلوت سرائے فرضِ محال' میں جھانک کر پیچھے ہٹنا :

بہ خلوت خانۂ کامِ نہنگِ لا زدم خود را
ستوہ آمد دل از ہنگامۂ غوغائے مطلب ہا

'نہنگِ لا' سے سید صاحب کی سکھوں کے خلاف خفیہ تیاری کی طرف اشارہ کیا ہے -

'فنا' :

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا ، غالب !
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزاے پریشاں کا

فنا کو سونپ ، اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا :
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

غالب پر درسِ فنا کا تاثر :

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم :
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک[1]

ہے شعلۂ شمشیرِ فنا حوصلہ افگار

تحریک سے اصولی موافقت کے باوجود ، اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہ ہونا :

---

[1] پامال اک نظر میں ثبات و قرار ہے :
اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

مومن

تابِ نگہِ حوصلہ فرسا نہیں رکھتے

شیفتہ

جی جلے ذوق فنا کی نا تمامی پر نہ کیوں ؟
ہم نہیں جلتے ، نفس ہر چند آتش بار ہے

توفیقِ عمل کی آرزو :

می زند دم ز فنا ، غالب ، و تسکینش نیست :
ہو کہ توفیق ز گفتار بہ کردار برد !!

اے فنا ، درے بکشا ، ہو کہ در تو بگریزد
ہم ز خلق نومیدی ، ہم ز خویش بیزاری !

نا طاقتی کی بنا پر روگردانی :

درِ آگہیِ فنا زدہ اے
برقِ بے طاقتی بہ جان زدہ اے

' مسلکِ فنا کے باب میں ظفر علی خاں کے یہ اشعار غالب کے بھی حسبِ حال ہیں :

میری جاں پر چھای جاتی ہے فنا کی آرزو
اور زباں پر آئے جاتی ہے بقا کی آرزو

میں خبر جس مبتدا کی ہوں ، کہاں گم ہو گیا ؟
میری آنکھوں کو ہے میرے نقشِ پاکی آرزو

دست وپا بشکستگی پر بھی ، مرے دل میں رہی
زورِ بازوے علیِ مرتضیٰ کی آرزو

'لیس للانسان الا ماسعیٰ' کو بھول کر
آرزو میری بھی ہے کیسی بلا کی آرزو !

خسِ طوفانیِ محیطِ بلا
سر بہ سر گردِ کاروانِ فنا

مسلکِ فنا سے عالمِ بے خودی میں تعلق :

مدہوشِ رہ و رسمِ فنایم ، خبرے نیست :
بے خویش قدح می زنم از خم کدۂ لا

'مرگ' :

تا چہ راز اندر تہِ این پردہ پنہان کردہ اند
مرگ مکتوبے بود ، کو راست عنوان زیستن

داری چہ ہراسِ جان ستانی از مرگ ؟
می جوے حیاتِ جاودانی از مرگ

زیست بے ذوقِ مرگ خوش نہ بود

عمرے ز ہلاک تلخ تر رفت :
مرگے ز حیات خوش تر آور

اے مرگ ، مرحبا ! چہ گران مایہ دل بری !
چشمِ بد از تو دور ، نکویان سپندِ تو

بہ خاطرے کہ در آی بہ جلوہ آرای
بلاے ظلمتِ مرگ از روان بہ گردانی

مرگ سے اصلاحِ احوال کی امید و بیم :

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے :
تسکیں کو دے نوید ، کہ مرنے کی آس ہے !

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے؟
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی[1]

قضا :

سید صاحب کا حیات بخش پیغام :

قضا از ذوقِ معنی شیرہ می ریخت در جان ہا :
نمی از لاے پا لایش چکید ، و آبِ حیوان شد

تحریکِ جد و جہد سے حصولِ مقصد کی امید وابستہ کرنا :

غبارِ شوق بہ خون نایہ[2] امید سرشت
دمے کہ خواست قضا طرحِ این بنا ریزد

---

[1]نویدِ قتل سے ہو بھی دلِ مضطر کو کیا تسکیں
کہ قدرِ نیم رقصِ مرغِ بسمل جا زمیں پر ہے؟
مومن

تحریک کا متوقع انجام :

قضا آئینہ دارِ عجز خواہد نازِ شاہی را :
شکستے در نہاد استے ادائے کج کلاہی را

دعوتِ جہاد پر غالب کا ردِ عمل :

رنجِ قضا است ہمتِ آسان گزارِ ما

ذوقِ شہادتم را دستِ قضا بہ حنا :
سیرِ سعادتم را پائے ستارہ در گل

غالب کا ادعائے جاں فشانی اور اس کی حقیقی صورت :

وائے گر جان بہ سرِ راہ گزارے نہ دہی!

صلائے قتل دہ ، و جان فشانیِ ما بین !

تو سکرفے دہ ، چو ما ، از سرِ جان بر خیزد؟

گر از فشاندنِ جان شور نیست در سرِ غالب
چرا بہ سجدہ نہد سر بر آستان اش ، و ارزد؟

زین حد نه شناسی

در پائے تو می خواستم افشاندنِ جان را

جان بہایش گفتم ، و اندر ادایش کاہلم

غالب کا ادعائے ارادت ، سید صاحب کی نظر میں :

'عقلِ فعال' یعنی سید صاحب نے ایک مخفی بزمِ شعر و سخن منعقد کی ، جس میں خاص خاص شاعروں کو بلایا گیا ۔ اس کی تخئیلی کاروای غالب نے یوں قلم بند کی ہے :

عقلِ فعال سرا پردہ زد ، و بزم آراست :

خواند از دیدہ وری، دیدہ وران را بہ بساط

من کہ آزادی ام انداز ، و رم از خویش اداست

رفتم آشفتہ و سر مست ، و پس از لابہ و لاغ
گفتم: 'اینک دل و دین' ؛ گفت: 'خوشت باد! کجاست؟'

'این فریبندہ سخن ہاے شناسایے راز
نہ شناسیم ، کہ مارا سخن از برگ و نواست

'کہ نہ داریم درین دایرہ آہنگِ سماع :
حاصلِ ما زنے و چنگ ہمین صوت و صداست ،

غالب اپنا 'دل و دین' پیش کرتے ہیں ، جن کا ، سید صاحب کی نظر میں ، سرے سے وجود ہی نہیں :

بہ پایش جان فشاندن شرمسارم کرد: می دانم
کہ داند ارزشے نہ بود متاعِ رایگانے را

آن خود بہ بازی می برد ، وین را بہ دوجو نشمرد :
نبمو دش دین ، خندہ زد؛ آوردمش جان ، خوش نہ کرد

(آشوبِ پیدائنگِ او : اندوہِ پنہان خوش نہ کرد)

ایسی سخن آرائی کو وہ بے حقیقت سمجھتے ہیں جس میں ، عرفی کے بہ قول ، 'سخن ہائے آشنا' کا ادعا ہو ، مگر جو حقیقی جذب سے عاری ہو :

ایمان اگر بہ خوف و رجا کردم استوار
اخلاص در نمود ، و وفایم دورو گرفت

'قیامت' :

زسا گرم است این ہنگامہ : بنگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انسان شد[1]

'قیامت' کا محرک : وطن کی اندوہ ناک حالت پر غم خواری کا جذبہ :

شبِ غربت بہانا شیوۂ غم خواریِ دارد
کہ ہم در ماتمِ صبحِ وطن زلفش پریشان شد

('زلف' میں مجاہدین کی گوناگوں پریشانیوں کے باعث سکھوں کی زیادتیوں طرف بھی اشارہ ہے) -

عافیت طلبی اور اصلاحِ احوال سے مایوسی کی مخالفت :

تا چند بہ ہنگامہ سلامت باشی؟
تا چند ستم کشِ اقامت باشی؟
گفتی ، کہ نہ باشد شبِ غم را سحرے[2]:
حیف است کہ منکرِ قیامت باشی!

---

[1] خلقے است این گردِ ہوس ، یعنی ز افسونِ نفس
شورِ قیامت در نفس ، آشوبِ طوفان در بغل — بیدل

[2] غالب نے ایک جگہ تسلیم کیا ہے کہ شبِ فراق کے سحر ہونے کی بات پر وہ محض خود کو دلاسا دینے کی خاطر کان دھرتے ہیں :

شبِ فراق نہ دارد سحر ، ولے یک چند
بہ گفتگوے سحر می توان فریفت مرا

ایک اور ضمن میں اسی قسم کی روش کو انھوں نے 'طفل تسلی' سے تعبیر کیا ہے -

تحریکِ جد و جہاد سے متحرک نہ ہونے کی بے حسی پر تعریض :

بہ روزِ رست خیز از جنبشِ خاکم برآشوبی :
تو و یزدان! چہ سازد کس بدین صبر آزمای ہا؟

'فتنہ' :

خانقاہ از روشِ زہد و ورع قلزمِ نور

شاہدِ بزم دران بزم ، کہ خلوت گہِ اوست
فتنہ بر خویش ، و بر آفاق ، کشادہ آغوش

دماغِ فتنہ می ناد و بہ سامانِ رسیدن ہا :
طلوعِ نشہ گردِ راہ باشد خوش خرامان را!¹

شوخیِ چشمِ حبیب فتنۂ ایام شد

چو فتنہ ، جامعِ قانونِ عالم آشوبی

---

¹ ہوا ز گردِ رہت شیشۂ مے ناب است

تاچند بلہوس مے ، و عاشق ستم کشد ؟
کو فتنہ تابہ داوریِ ہم علم کشد ؟

تا فتنہ در نظر نہ نہی ، از نظر چہ سود ؟
تا دشنہ بر جگر نہ خوری ، از جگر چہ سود ؟

بہ دشتِ فتنہ از این گردِ بے سوار چہ حظ ؟

'فتنہ' اور غالب :

فتنہ' چند ز ہنگامہ ستانے بہ من آر
(شمعِ بالین ز درخشندہ سنانے بہ من آر)

دل فتنہ جوے ، و فرصتِ تکمیلِ عشق نیست

چو مژدہ ، دوست نوازم ؛ چو فتنہ ، خصم گداز

ہر فتنہ در نشاط و سماع آورد مرا

حرف حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت

'ہنگا آراے ناز' :

اے بہ خلا و ملا خوے تو ہنگامہ زا!

صد قیامت بہ گدازند و بہم آمیزند
تاضمیرِ دلِ ہنگامہ گزینِ تو شود

(خوش بہشتے است کہ کس راہ نشینِ تو شود!)

ز گرمی کہ باشد بہ ہنگامہ اش
ز تیزی کہ دارد قطِ خامہ اش

زبان ہاے افسردگان آتشین[1]

ابتدای ناکامی کے بعد بھی سید صاحب کا وہی ولولہ :

ہنگامہ گرم سازیِ کوشش بجانہ ماند
خون ہمچنان بہ آتشِ سوزان برابر است

(بے دست گہ نہ ام ، کہ ہنوز از ہواے وصل
شورے است در سرم ، کہ بہ سامان برابر است)

'ہنگامہ' اور غالب :

کنی سازِ ہنگامہ اندر ضمیر

سازِ ہنگامہ نہ اندر خورِ طاقت کردم

---

[1] زہے ز حرفِ تو اندیشہ را مدد گاری!

ہنگامے کی تخئیلی کشش ، مگر اس کے اجر اور قیود سے بے تعلقی :

ہنگامہ دل کش است : نویدم بہ خلدچیست ؟
اندیشہ بے غش است : نیازم بہ بند نیست

ناطاقتی :

طاقت نہ تو انست بہ ہنگامہ طرف شد

جان بر نہ تابد ، اے دل ، ہنگامۂ ستم را

خارج از ہنگامہ ، سر تا سر بہ بے کاری گزشت

(تار و پودِ ہستیِ ما اضطرابے بیش نیست)

ہنگامے سے بے تعلقی کا مشورہ :

از پےِ گرمیِ ہنگامہ منہ دل بہ خروش

'بلا' اور غالب

دماغِ اہلِ فنانشۂ بلا دارد

نظارہ ، با ادایت ، موسیٰ و طورِ سینا :
اندیشہ ، با بلایت ، ہاروت و چاہِ بابل

دین و دنیا را بلا گردانِ نازت کردہ ام

نویدِ التفاتِ شوق دادم از بلا جان را

غالب ، بہ این نشاط کہ وابستہ ٔ کہ ای
بر خویشتن بہ بال ، و بہ بندِ بلا بہ رقص

شاہ صاحب کی خواہش کہ غالب کو سکھوں کے خلاف جنگ میں جھونکنے کی نیت سے اپنی گرفت میں لائیں :

خواہدم در بندِ خویش ، اما بہ فرجامِ بلا
حلقۂ دامِ من از کامِ نہنگ آرد ہمی !

خواہم ز بہرِ لذتِ آزار زندگی :
بردل بلا فشانم ، و برجان خورم دریغ

(عبادت برق کی کرتا ہوں، اور افسوس حاصل کا)

بال و پر شاید، و میرم ، کہ در این بندِ گران

تاب و طاقت بہ خمِ دامِ بلاگشت تلف

خسِ طوفانیِ محیطِ بلا :
سر بہ سر گردِ کاروانِ فنا

دلم‌در حلقہ دامِ بلا می رقصد از شادی[1]

بندم منہ ز طرہ ، کہ تابم نہ ماندہ است :
رفت آن کہ خویش را بہ بلا شاد کردمے

'غوغا' :

غوغاے رست خیز بہ گوشِ شہیدِ عشق
بالحن و صوتِ مرغِ سحر خوان برابر است

رہ گزارت را دل و جان ہم چنان فرش است ؟ ہان !
جلوہ گاہت را ز جان بازان ہہان غوغا است ؟ ہست !

---

[1] چندان کہ بلابیش تر ، طرب بیش تر

فیضی

'غوغا' اور غالب

دادی صلاے جلوہ ، و غالب کنارہ کرد :
کو بخشِ آن گدا کہ ز غوغا نفور بود ؟

دارم بہ کنجِ غم کدہ رشکِ کسے ، کہ او
در جلوہ گاہِ دوست بہ غوغا شود ہلاک

مولوی فضلِ حق کا مسلکِ تسلیم و سکون :

عالم آینۂ راز است ، نہ بازیچۂ کفر:
عارف آن بہ کہ بہ نظارہ ز غوغا ماند

دور از اثرِ عربدہ و بحث و ستیزہ
وین بندگیے ، پاک ز آلایشِ غوغا

غالب کی آرزو کہ اپنے شورش انگیز کلام سے مولوی فضلِ حق کی طرح کے 'ہوش مندوں' کو جھنجوڑیں اور متحرک کریں :

اے ذوقِ نوا سنجی ، بازم بہ خروش آور :
غوغاے شبیخونے بر بنگہِ ہوش آور

بخت در خواب است : می‌خواہم کہ بیدارش کنم :
پارۂ غوغاے محشر کو ، کہ در کارش کنم ؟

(یہی خواہش ایک اور شعر میں ظاہر کی ہے :

لافِ ہرکاری ست صبرِ روستای شیوہ را :
خواہش کاندر سوادِ اعظمِ ناز افگنم

مولوی فضلِ حق کے حق میں ان کی یہ آرزو کہیں ۱۸۵۷ میں جا کر پوری ہوئی) ۔

'جنون' :

جد و جہد کا محرک : سیاسی زوال و انحطاط

چو بوے گل ، جنون تازیم : از ہستی چہ می پرسی ؟
گسستن دارد از صد جا عنانِ اختیارِ ما

چمن طرازِ جنون ایم ، و کوہ و دشت از ما امت
جنون بہ بادیہ پردازِ گلستان بخشید

'جنون' کی کیفیت اپنے فکر پر طاری کرنا :

اندیشہ را ہواے جنون در سر افگنم
برجنون صلاے زن : عقل را قفاے زن !

'سودا' :

شورِ سودائے تو نازم...

نازم بہ گران مایگیِ دل، کہ ز سودا
ہر قطرۂ خون یافتہ پروازِ سویدا

زین عربدہ بالیدنِ آثار بہ ہر جا

'دیوانہ' :
(شاہ صاحب)

در خزان بیش بود مستیِ دیوانۂ ما

شاہ صاحب کا سید صاحب کے سلسلے میں داخل ہو کر ان کے ہمراہ ہو لینا :

دیوانۂ ما را ضمِ سلسلہ مو برد

'شور' :

این چہ شور است کہ از شوقِ تو در سر دارم؟

در دل ز تمنائے قدم بوسِ تو شورے است

شورِ شوقم ز گرمیِ رفتار

جوش سے بے قابو ہو کر ہیجان آور کلام کہنا اور اس پر لرزنا :

ز شورِ نالہ‌ٔ دل دارد اضطراب روانم
چو رایضے ، کہ ز کف در رود عنانش ، و لرزد

گر از فشاندنِ جان شور نیست در سرِ غالب
چرا بہ سجدہ نہد سر برآستانش ، و لرزد ؟

کلام کا شور انگیز آہنگ :

فغانم را نوائے شورِ محشر ہم عنان استے
بیانم را رواجِ شورِ طوفان در رکاب استے

شہادت کے بعد اس کے محرک کی کمی محسوس کرنا :

شور است نوا ریزیِ تارِ نفسم را
پیدا نہ ای ، اے جنبشِ مضراب ، کجای ؟

آن شور کہ گردابِ جگر داشت ، نہ دارد
اے لختِ دل غرقہ بہ خون ناب ، کجای ؟

حسرت ، کہ کاش شاہ صاحب ہوتے اور دیکھتے کہ ان کی شورش افزا دعوتِ فکر و عمل کس طرح موضوعِ سخن بنای گی :

آن کہ صورِ نالہ از شورِ نفس موزوں دمید
کاش دیدے، کاین نشیدِ شوق فن خواہد شدن!

'ہوا' :

برخود فسونِ دولت و اقبال خوانده ایم
در سر ہوائے رایت و لشکر گرفتہ ایم

کاخِ دماغ را بہ ہوائے عروجِ فکر
اندازۂ بلندیِ منظر گرفتہ ایم

دل ہوائے خرام ناز سے پھر
محشر ستانِ بے قراری ہے

در ہوائے قتل سر برآستانش می نہم

ہوائے ساقیِ دارم ، کہ تابِ ذوقِ رفتارش
صراحی را ، چو طاؤسانِ بسمل، پرفشان دارد

ہر ذرۂ خاکم ز تو رقصان بہ ہوائے مست

دارم ہوائے آن پری، کو بس کہ نغز و سرکش است

(یہ 'پری' شاہ اسماعیل ہیں)

غلتد دمم بہ مشک ز فیضِ ہوائے زلف

زند ز موجۂ خون دیدہ در ہوائے تو بال

تا در سرم ہوائے کہ باشد، کہ آن ہوا
کاہِ مرا مجادلہ با کہکشان دہد؟

اندیشہ را ہوائے جنون در سرافگنم

غالبِ وحشی نگر، کش چہ ہوا در سر است!

بے دست گہ نہ ام، کہ ہنوز از ہوائے وصل
شورے ست در سرم، کہ بہ سامان برابر است

گر ہوشِ ما بساطِ ہوائے خرام نیست
نقشے توان بہ صفحۂ دیبائے خواب زد

گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

بارے اب، اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی!

'فسوں':

سید صاحب کی قوتِ تسخیر کو مولوی فضلِ حق ان کی ساحری پر محمول کرتے تھے۔ اس لفظ کے استعمال میں ان کی تحریک

کے خلاف اس الزام کی طرف اشارہ بھی ہے، اور اس کی کاٹ بھی :!

لذت ایجاز از : افسونِ عرضِ ذوقِ قتل

بہ حرفے حلقہ در گوش افگنی آزاد مردان را :
چہ افسون خوانده ای درگوشِ دل امیدواران را!

تازه فسونے بہ تمنا دمید

برخویشتن دمیده فسونِ دلاوری

برخود فسونِ دولت و اقبال خوانده ایم :
در سر ہوائے رایت و لشکر گرفته ایم

تاچہ افسون بہ خود از ہیبتِ صیاد دمم!
تاچہ خون در جگر از حسرتِ پرواز کنم !

ایک ابتدای شعر میں غالب نے اپنے زبانی جمع خرچ پر تعریض کی ہے :

چشم بے خونِ دل ، و دل تہی از جوشِ نگاه !
بہ زباں عرضِ فسونِ ہوسِ گل تا چند ؟

۱ آتش نے تحریک کے حق میں پانسا ایک دوسری صورت سے پلٹا ہے:
زاین اعجازِ جنوں سے عقل کا افسوں ہوا

'تمثالِ ناز' : 'معنیِ ناز' :

غالب نے ایک شعر میں بہ ظاہر کہا تو یہ ہے کہ 'ناز و غمزہ' کو 'دشنہ و خنجر' کہے بغیر چارہ نہیں' مگر ان کا مقصد دراصل یہ کہنا ہے کہ انھوں نے 'ناز و غمزہ' (خصوصاً 'ناز' سے) جہاد اور اس کے داعیوں کا کنایۃً تذکرہ کیا ہے۔[1] اس کا ثبوت ہم پہلے اردو کلام سے پیش کرتے ہیں :

لذتِ ایجادِ ناز : افسونِ عرضِ ذوقِ قتل :
نعل آتش میں ہے تیغِ یار سے نخچیر کا

قاتل بہ عزمِ ناز ، و دل از زخم در گداز :
شمشیر آب دار ، و نگہ آب دار تر

(ایجادِ ناز : جدوجہاد کا منصوبہ ؛ افسونِ عرضِ ذوقِ قتل : دعوتِ جہاد کا کشش انگیز پیرایہ)

یہ 'قاتل' سید صاحب ہیں جو جد و جہاد کا منصوبہ بنا رہے ہیں ، اور شمشیر سے زیادہ آب دار نگاہ ان ہی کی ہے - غالب ایک بار نوجوانی میں اس نگاہ کی زد میں لائے گیے - اس کے جو تاثرات انھوں نے مختلف وقتوں میں بیان کیے ہیں ، ان میں سے کچھ

---

[1] نگاہِ بے حجابِ ناز تیغِ تیزِ عریاں ہے

یہ ہیں :

رفتم سوے وے ، و مژہ اندر جگر خلید
زان پیش تر کہ سینہ بہ نوکِ سنان رسد

مرے دل سے کوی پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو :
یہ خلش کہاں سے ہوتی ، جو جگر کے پار ہوتا ؟

جگر ز گرمیِ این جرعہ تشنہ تر گردید :
فغان ز طرزِ فریبِ نگاہِ نیم رسش !

ایک شعر میں 'آشنا' کے لفظ سے خیال ہوتا ہے کہ یہ 'نگاہِ ناز' شاہ صاحب کی ہے۔ بعید نہیں کہ تحریکِ جدوجہاد کے لیے 'ناز' کا نشان اختیار کرتے وقت غالب کے پیشِ نظر ان کی دل کش و دل دوز شخصیت بھی ہو :

وہ نیشتر سہی ، پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے ؟

اسی تعلقِ خاطر کی بنا پر محسوس ہوتا ہے کہ اس شعر میں بھی ان ہی کی 'تیغِ ناز' کا 'زخم' مطلوب ہے :

' آشنا یا نہ کشد خار رہت دامنِ ما
گوییا ، بود ازاین پیش بہ پیراہنِ ما

جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو :
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

انحطاط و زوال کے باوجود ، سید صاحب کی بدولت ، جاہ و جلال کی بازیابی کی آرزو :

تو ہوا جلوہ گر ، مبارک ہو !
،
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست:
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

بہ جز پروازِ شوقِ ناز ، کیا باقی رہا ہوگا ؟
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر !

شاہ صاحب کی رقت آمیز اور شور انگیز دعوتِ جہاد :

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے :
روز بازارِ جاں سپاری ہے

سید صاحب/شاہ صاحب کی جاں فزا تقریر :

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خوں بار میں آوے

یہ پوری غزل تحریکِ جدوجہاد سے متعلق بعض مضامین پر مشتمل ہے :

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دل کش سے جو گلزار میں آوے

'تو' سے سید صاحب مراد ہیں ۔ تو 'سرو و صنوبر' شاہ صاحب اور مولانا عبدالحی ہوئے ۔ مگر 'قدِ دل کش' شاہ صاحب کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے ۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے ، یا رب !
اک آبلہ پا وادیِ پر خار میں آوے !

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے ، جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے ؟

ان دونوں شعروں میں پنجاب کے مسلمانوں کی زار و نزار حالت کا نقشہ کھینچا ہے ۔ 'خمِ حلقۂ زنار' سکھوں کی بالا دستی کا پھندا ہے ۔

---

۱ خجستہ طالعِ دستے کہ ، بے توقعِ مزد
ز پاے رہ روِ آزردہ پاے خار کشد !

سعی‌ام ز پاے محنتیان می کشید خار

غالب

اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح ، آینہ گفتار میں آوے

یہ سید صاحب اور شاہ صاحب کے حسبِ منشا سخن سرای کا اقرار ہے -

قافلہ سالارِ جدوجہاد بہ طورِ 'ناز' :

بہ 'ناز' می جہد . . . .

سوارِ توسنِ ناز است ، و بر خاکم گزر دارد
بہ بال ، اے آرزو ، چندان کہ دریای رکابش را

خرامِ نازِ تو باصحنِ گلستان دارد
رعایتے کہ بہ درویش می توان کردن

می کند ناز . . . .
خیز تا شعبدۂ جذبِ نظر بنمایم

دگر نگاہِ ترا مستِ ناز می خواہم :
حسابِ فتنہ ز ایام باز می خواہم

(زمانہ خاکِ مرا در نظر نہ می آرد
ز نقشِ پاے تو اش سرفراز می خواہم)

بہ رگ نشتر زن از موجِ خرامِ ناز صحرا را

چو شوق بال کشاید، بہ خود توان بالید :
چو ناز جلوہ گر آید، نیاز باید بود

('شوق' : شاہ صاحب ؛ 'ناز' : سید صاحب)
کمر نہفتہ بہ تاراجِ خویش باید بست :

شریکِ مصلحتِ سعیِ ناز باید بود

(شہیدِ آن مژہ ہاے دراز باید بود)

ز بس کز لالہ و گل حسرتِ نازِ تو می جوشد :
خیابان محشرِ دل ہاے خون گردیدہ را ماند

ودیعت بودہ است اندر نہادِ عجزِ ما نازے :
جدا از قطرہ نتوان کرد طوفان دست گاہی را

بہ نیم ناز کہ طرحِ جہانِ نو فگنی
زمین بہ گستری ، و آسمان بہ گردانی

نازم بہ دستِ سبحہ شمارے

نازم آیینِ کرم را ، کہ بہ سرگرمیِ خویش
دشت را شمع ، و چراغِ شبِ تار است بہار

راحتِ دایمیِ ذوقِ طلب را نازم

سودِ غارت گری ہاے غمت را نازم

آتش کدۂ خوے تو نازم

بہ نازم گرمیِ خون گرم محبوبے

نازم بہ گران مایگیِ سعیِ تحیر
کز سرحدِ این دیرِ خرابم بدر آورد

شورِ سوداے تو نازم ....

نازم خطر ورزیدنش

نشاط انگیزیِ اندازِ سعیِ چاک را نازم

نازم دماغِ ناز : نہ دانی ز سادگی است
کشتن بہ ظلم ، و کشتہٴ احسان شناختن

تیشہ را نازم ، کہ برفرہاد آسان کرد مرگ

بدین سوزم رواجے نیست : ہے ، فرہاد را نازم
کہ از تابِ شرارِ تیشہ اے گرم است بازارش !

افسوں گری ، فریب دہی ، فتنہ انگیزی ، آزار کوشی ، بے سروسامانی بے سروپای کے اعتراضات کے باوجود ، ناز سے وابستگی :

محوِ افسون گر ناز ایم ، کہ او را باما
دور باشے ست کہ آہنگِ بپاخیزداز او[1]

[1] ہرچند اگر عمرِ گراں مایہ در مخالفتِ رب العالمین و نفاقِ منافقین و دوستیِ کافرِ لعین صرف نمودید ، و راہِ نفس پرستی و دنیا طلبی شب و روز پیمودید . . . ہمین بیت در مخاطبتِ شما بر زبان می رانم :

باز آ ، باز آ ، ہر آن چہ کردی باز آ
صد بار اگر توبہ شکستی ، باز آ

از دوستیِ کفار دست می بر دارید - آخر مرد ہستی و لافِ مردانگی می زنی - اگر این مردانگی در راہِ خداوندِ خود صرف می کردی ، مردی ، و الا از ہمہ نامردی ، و در حسرت و ندامت مردی . . .
(از مکتوبِ سید احمد شہید)

نازم بہ فریبے کہ دہی اہلِ نظر را

نازم آن فتنہ . . .

نشاطِ لذتِ آزار را نازم

نازم بہ گران مایگیِ بے سروپای

خوشاے رنگیِ دل : دست گاہِ شوق را نازم

ناز سے باز رہنے کا مشورہ :

پشیمان می شوی از ناز : بگذر زین گران جانان !

ناکامی پر حسرت و تاسف :

سعی در مرگِ رقیبانِ گران جان کردی :
می شناسم کہ چہ از ناز و اداگشت تلف

غالب 'ناز' کے لفظ کو جنسی مصرف میں بھی لاے ہیں :

ہم ز شادابیِ نازِ تو بہ خود می بالم :
ریشہ در آب ز تارِ دمِ خنجر دارم

تا دخلِ من بہ عشق فزون تر بودز خرج
خواہم کہ از تو بیش کشم ناز ، و کم کنم

ز تیغت منتِ زخمے نہ دارم : خویش را نازم
کہ حسرت غرقِ لذت داردم از لب گزیدن ہم !

دل را بہ کارِ ناز چہ سرگرم کردہ ای :
یعنی ، بہ خویش ہم کند ، و از تو ہم کشد

کلام میں 'ناز' کی آینہ داری :

مو بہ مو ام خبر از جلوۂ نازے دارد

ناز را آینہ ما ایم

ز تارِ شمعِ تیز آہنگ ذوقِ ناز می بالد

بہ قلم نازم ، اگر تکیۂ موسٰی بہ عصا است

بہ رفتارِ ناز اندر آرم قلم را

خامهٔ من دمِ انشا بہ غزالے ماند

کہ سیہ مستِ مے ناز بہ صحرا پوید
و ز ان پویہ از او نافہ بہ صحرا ماند

نازکی تاب نہ لانا :

بہ توانائ نازِ تو بہ عجز ایم گواہ

بامن ، کہ تابِ نازِ نکویان نہ داشتم

نازِ تو فراوان بود ، و صبرِ من اندک :
تو دست و دلے داری ، و من پاے نہ دارم

(بگزار کہ از راہ نشینانِ تو باشم
پاے کہ شود مرحلہ پیماے ، نہ دارم

داعیانِ جہاد کا قہر و عتاب :

نازم بہ خواجگی : غضب آلود می رود

دوزخے ازگرمیِ نازش عتابے پیش نیست[1]

---

[1] بے طاقتیم و رسوا : جرم و گناہِ ما را
ہم خود مگر بسوزی از شعلهٔ عتابے

ظہوری

اس کے باوجود ، اُن سے اپنے پرانے راہ و رسم پر فخر :

نہ توان گرفت از من بہ گزشتہ ناز کردن!

آخر میں ہم ایسی اضافتیں درج کرتے ہیں جو 'ناز' کے ساتھ آئی ہیں - ان سے اور بھی واضح ہو جائے گا کہ "تمثال ناز' کا وہی مفہوم ہے جو ہم نے اس سے منسوب کیا ہے یعنی 'ناز شہادت -'

تکیہ گاہِ ناز : لنگرِ ناز : سوادِ اعظمِ ناز : پیش گاہِ ناز : سلسلۂ ناز : جلوۂ ناز : بزمِ ناز : شرعِ ناز : شہیدِ ناز : سوارِ سمندِ ناز : گرمِ خرامِ ناز: سرگرمیِ ناز : مسندِ بارگاہِ ناز : ہنگامہ آرائے ناز : نگہِ ناز : حیرت گاہِ ناز : افسوں گرِ ناز : طلسمِ ناز : شاہدِ ناز : عنقائے ناز : اے دل و اے جانِ ناز ، اے دین و اے ایمانِ عجز : دو عالم ناز یک صیدِ شہِ دلدل سوار : سامانِ ناز : سر و برگِ ناز: ناوکِ ناز : سرگرمیِ ناز: رفتارِ ناز : ستمِ ناز: گزرگاہِ ناز: مشقِ ناز: سبقِ ناز: درسِ خرامِ ناز: عزمِ ناز: کارِ ناز : سعیِ ناز : رسوایِ ناز : حسرت گاہِ ناز : جگر تشنۂ ناز -

---

۱ آخر نہ بود ایم در اول خدا پرست ؟

غالب

'آینۂ صورتِ خود'

'چشم' :

منت کشِ چشمم ، کہ حقیقت نگر آمد
سرِ تارِ نظر شد رشتۂ تسبیحِ کوکب‌ہا

'دل و دماغ' :

غالب ، دل و دماغِ تو بسیار نازک است

'سر' :

در سر ہوائے رایت و لشکر گرفتہ ایم

تا در سرم ہوائے کہ باشد ، کہ آن ہوا
کاہِ مرا مجادلہ با کہکشان دہد ؟

این چہ شور است کہ از شوقِ تو در سر دارم !

سرِ پر شورم از آشفتگی ماند بہ دستارش

ستم کشِ سرِ ناموس جوے خویشتنم

برسرم ز آزادی سایہ را گرانی ہا است

گر از فشاندنِ جان شور نیست در سرِ غالب
چرا بہ سجدہ نہد سر بر آستانش، ولرزد؟

گویند: اینک خیرہ سر، کز دوست فرمان خوش نہ کرد

سرم گوے، اندیشہ میدانِ من

دیدم آن ہنگامہ: بے جا خوفِ محشر داشتم:
خود ہمان شورے است، کاندر زیست در سر داشتم

'گوش':

سامعہ آتش کدۂ راز . . .

نویدِ وعدۂ قتلے بہ گوشم می رسد، غالب!

بہ گوشم می رسد از دور آوازِ درا امشب!

'دل و گوش':

ز دل بانگِ خونم بہ گوش اندر است

'پا و ِگل' :

سیرِ سعادتم را پاے ستاره در گل

تشنۂ ما بر کنارِ آب جو پا در گل است

آبم از شرمِ وفا، و از خودم پا در گل است

'دل و دست' :

دل و دستِ تیغ آزماے نہ دارم

دل و دستے کہ مرا بود، فرو ماند ز کار

تو دست و دلے داری، و من پاے نہ دارم

'سر و دست' :

حسرت صلاے ربطِ سر و دست می زند

'دست و پا' :

پا و داغِ رفتارے! دست و حسرتِ کارے!

'سر و پا' :

ما را زبون مدار ، گر از پا در آمدیم :

از ما عجب مدار ، گر از سر کنیم طرح

'سینہ و پا' :

بہ سینہ می سپرم رہ ، اگرچہ پا خفت است

'پا و افتادگی' :

چہ نقشِ پا ، ہمہ افتادگی است ہستیِ من

'پا' :

فرسودہ گشت پایم از پویہ ہاے ہرزہ

تا بہ زانو سودہ پاے ما، و می پوییم ما

'پا و خار'

جوہرِ آینۂ زانو است خارِ پاے من

پاے بر نہ می زد بد رنجِ کاوشِ خارے

پایم از گرمیِ رفتار نہ می سوخت بہ راہ
در قدم سوختنِ خارِ بیابانم سوخت

تا سرِ خارِ بدامین دشت در پا می خلد
کز ہجومِ شوق می خارد کفِ پایم ہنوز ؟

'مے' :

ہماری رہ نمائی کے لیے غالب نے جا بہ جا نشان چھوڑے ہیں ، اور خود ہی ان سے کام لینے کی دعوت دی ہے :

کیست تا بادہ کشِ جرعۂ تحقیق شود ؟
الحذر ، الحذر ، اے قوم ، کہ این مے ہوش ربا است

یہ 'مے ہوش ربا' کیا ہے ؟ غالب نے ایک قصیدے میں دو قسم کی مے کشی میں تفریق و تمیز کی ہے : ایک تو وہ جو ان کی زندگی کے معمولات میں داخل تھی :

ما ہما نیم ، و سیہ مستیِ ہر روزہ ہمان :
نہ شبِ جمعہ شناسیم ، نہ ماہِ رمضان

مگر جس شراب کے وہ تحقیق طلب ہیں ، یہ وہ 'مے مشک بو' نہیں جس کے عوض انھیں 'شہد و شیر' رضواں کے حوالے کرنے میں کوئی تامل نہ تھا ، نہ وہ 'مے مغانہ' ہے جس نے انھیں 'کردار' سے باز رکھا ۔ یہ وہ شراب بھی نہیں جس کا اپنے لیے جواز انھوں نے یہ کہہ کر پیش کیا :

بہ بادہ گر بود ام میل ، شاعرم ، نہ فقیہہ :
سخن چہ ننگ ز آلودہ دامنی دارد ؟

دل خستۂ غمیم ، و بود مے دوائے ما :
با دل خستگان حدیثِ حلال و حرام چیست ؟

(مے نوشی کا وہ 'عذر' جو بہ یک وقت میرزا صاحب کے شایانِ شان بھی ہے ، اور حقیقت آمیز بھی ، در اصل ان کے ان اشعار میں ادا ہوا ہے :

پزیرد ز مے گوہرم آب و رنگ :
بہ مستی فزون گردد م ہوش و ہنگ

ز ظرفِ غالبِ آشفتہ گر نہ ای آگاہ
بہ آزما بہ مےِ تند ہوش و ہنگ اش را

مستی ام عام مدان ، و روش ام سہل مگیر :
نامۂ شوق ام ، و جبریل حدی خوانِ من است

نادان ، حریفِ مستیِ غالب مشو ، کہ او
دردی کشِ پیالۂ جمشید بودہ است

نہ شوی رنجہ ز رندان ، کہ این قوم
نفسِ بادِ سحر غالیہ سا نیز کنند

طعنہ بر ذائقِ مے آلودم مزن :
نیست ساغر ، مے بہ نیگان می زنم

جس شراب سے (یا جس کی "تلچھٹ"[1] یا کم از کم بو[2] سے) بے خود ہونے کا وہ دعوی کرتے ہیں ، وہ ان کے بقول ، اور ہی ہے :

پرتوِ مہر و مہ است نور بہ چشم اندرون
اگرچہ بود در قدح . اصلِ مے از کوثر است

راہے ز کنجِ دیر بہ مینو کشودہ ام :
از خم شراب گیرم ، و در ساغر افگنم

مستم ، اما نہ ازان بادہ کہ آید ز فرنگ :
مستم ، اما نہ ازان بادہ کہ سازند مغان

للہ الشکر ، کہ در ساغرِ من ریختہ اند
مےِ بے رنگ ز مے خانۂ بے نام و نشان

جس خم کدے میں یہ کشید ہوی ہے ، اسے 'بے نام و نشاں'

---

[1] ہے یوں کہ مجھے دردِ تہِ جام بہت ہے

[2] بے خود بہ بوے بادہ کشیدیم لاے را
غالب

نیم مستم از شرابِ نیم جوش
فیضی

اس لیے کہنا پڑا کہ اسے صیغۂ راز میں رکھنے کی سخت تاکید تھی :

گفتند 'حور و کوثر'، و دادند ذوقِ کار :
منع است نامِ شاہد و مے آشکار برد

روا است شورِ نشیدِ ترانہ مستان را
بہ شرطِ آن کہ نہ گویند رازِ پنہان را

راز داری کی اس تاکید ، اور راز کی نوعیت کی طرف ، غالب نے کئی اور جگہ بھی اشارے کیے ہیں :

زبان ہا لال ، و جان ہا پر ز غوغا کردہ ای
جگر خون است از بیمِ نگہت راز داران را

چو لب ز ہرزہ نوایانِ شوق نہ توان شد

چو دل ، ز پردہ سرایانِ راز باید بود

آن راز کہ در پردہ نہان است ، نہ وعظ است :
بردار توان گفت : بہ منبر نہ توان گفت

مگر اس کڑی روک تھام کے باوجود ، 'شہید' ، یعنی دعوتِ جہاد کے نقیب شاعر ، اس راز کو زبان پر لائے بغیر نہ رہ سکے :

رازِ تو شہیدان را در سینہ نمی گنجد :
بر سبزہ درین مشہد مانا بہ زبان استے

راز کا اظہار کس پیرائے میں ہوا ؟

در نہفتن پردہ از رازِ نہان انداختہ

پا تاسرم اندازِ بیان است ، و بیان نیست

چون بادہ بہ مینا ، کہ نہان است ، و نہان نیست

اس 'مے ہوش ربا' کا ساقی کون ہے ؟

خانقاہ از روشِ زہد و ورع قلزمِ نور

شاہدِ بزم در آن بزم ، کہ خلوت گہِ او است

فتنہ بر خویش ، و بر آفاق ، کشودہ آغوش

ہم چو خورشید ، کز او ذرہ درخشان گردد

خوردہ ساقی مے ، و گردیدہ جہانے مدہوش

یہ وہی 'ساقیِ ہمت'[1] ہے

---

[1] یہ وہی 'ساقی' ہے جس کے لب میں یہ صلاے مکرر تھی :

کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق ؟

'مکرر' سے اشارہ دعوتِ جدوجہاد کی طرف ہے ، جس کی تجدید سید صاحب ، امیر خان کے زوال کے بعد ، کر رہے تھے ۔

کہ صلا می دہد
بادہ ز خم خانۂ لا می دہد :

'ہمت اگر بال کشای کند
صعوہ تواند کہ 'ہمای کند'

اس کے پیمانہ بردار اور اس کی بزمِ مے سے اپنا قلبی تعلق غالب نے یوں بیان کیا ہے :

بہ کامِ دلِ مے پرستان شبے
بہ ساقی گری خاست نوشین لبے[1]

ازان مے کہ خود خورد ، از دست شد
نہ یک تن ، دو تن ، کانجمن مست شد

جگر گون نوائے کہ نامش 'دل' است
ز تہ جرعہ خوارانِ این محفل است

تشنہ لبی اور دل و جان کی افسردگی کے عالم میں ، جو خود ان پر اور ملک و ملت پر طاری ہے ، غالب اس ساقی اور اس کے نوشین لب

---

[1]ساغرے ز آتشِ سیال بہ من پیرِ مغان
داد ، و آن مغ بچہ آبے بہ لبِ چشمۂ نوش
(حسرتی ، حال درین زاویہ جویند ، نہ قال)

حسرتی

پیمانہ بردار سے وہ 'دوشینہ دارو' طلب کرتے ہیں کہ 'ہم آتش، ہم آ بستے'۔

بہ قدرِ ظرف ہے ، ساقی ، خمارِ تشنہ کامی بھی :
جو تو دریاے مے ہے ، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

مگر اس برق تاثیر شراب کے گاہ گاہی جلوے سے زیادہ کی تاب ، اور یہ سنگین تقاضا پورا کرنے کی بضاعت اپنے اندر نہیں پاتے :

دل و دیں نقد لا ، ساقی سے گر سودا کیا چاہے

اپنی اس کم مایگی کے باوجود ، اس شراب کی حیات بخش تاثیر کے وہ قایل ہیں :

جاں فزا ہے بادہ ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا

یہ جام نشان ہے قوت اور اقتدار کا : جس کے یہ ہاتھ آیا

سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

منقبت کے ایک قصیدے میں دو متضاد خیالات پہلو بہ پہلو ملتے

ہیں :

آن وعظِ فقیہانۂ زاہد کہ نہ زیبد
بر صفحۂ دین نقشِ رواجِ غمِ دنیا[1]

وان نغمۂ مستانۂ رندان ، کہ نیرزد
دم سردیِ امروز بہ سرگرمیِ فردا

پہلے شعر میں اس 'فقیہانہ' نظریے کی ترجمانی کی گیی ہے کہ علماء دین کا نہ یہ منصب ہے ، نہ انھیں یہ زیب دیتا ہے کہ وہ دنیا کے دکھ درد دور کرنے کا بیڑا اٹھاییں - دوسرے شعر میں یہ 'رندانہ' جذبہ ادا ہوا ہے کہ آیندہ کے موہوم کیف و سرور کے تصور سے حال کے اعضا شکن خمار کی تلافی نہیں ہوتی - یہ وہی جذبہ ہے جسے غالب نے اردو اور فارسی میں یوں بھی ادا کیا ہے :

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے :
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

جنت نہ کند چارۂ افسردگیِ دل :
تعمیر باندازۂ ویرانیِ مانیست

---

[1] محرکینِ جد و جہاد پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا تھا کہ وہ دین داری کے پردے میں دنیا داری کرتے ہیں - یہ الزام غالب کے ایک متروک شعر میں نظم ہوا ہے :

عبادت خانہ اے خواہم ، چو قیصرِ مغان رنگین :
غمِ دینے کہ من دارم ، غمِ دنیاست پنداری

اسی جذبے کا اظہار مومن نے اپنے تند و تیز لہجے میں کیا ہے :

کیسے آرام پسِ مرگ ؟ مگر ، کافر ، تو
اہلِ اسلام کا ہے دشمنِ جاں ، اے واعظ !¹

یہ سمجھنا بے جا نہ ہوگا کہ 'وعظِ فقیہانہ' زاہد' میں مولوی فضلِ حق اور ان کے ہم مشربوں کا نقطہ' نظر بیان ہوا ہے ۔ دوسرے شعر میں غالب نے ، جو ہر خیال کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں ، 'رندانہ' اور مجاہدانہ نعروں میں ایک گونہ موافقت پیدا کر دی ہے ۔ حسرتی نے یہ رمز کھول دیا ہے کہ شاعری میں 'رند' سے کبھی کبھی کیا مراد لی جاتی تھی :

کارِ رندان ہمہ جان بازی و خون آشامی ہست

'خون' :

دادہ خونین نفسے درسِ خیالم ، غالب !

جوہرِ اندیشہ دل خون گشتنی درکار داشت

---

¹اس شعر کی تشریح پروفیسر ضیاء احمد نے یوں کی ہے :

'تو اہلِ اسلام کو مرنے کے بعد آرام کی امید دلاتا ہے ، تاکہ وہ راحتِ آخروی کی تمنا میں دنیا سے بیزار اور موت کے طلب گار ہوں ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تو مسلمانوں کا دشمنِ جان ہے ۔'

خاکِ وجودِ ماست ز خونِ جگر خمیر

غبارِ شوق بہ خون نابہ' امید سرشت
د سے کہ خواست قضا طرحِ این بنا ریزد

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل :
قانونِ باغ بانیِ صحرا نوشتہ ایم

غمت خون خوار ، و دل ہاے بضاعت

'سراب' :

داعیانِ جدوجہاد پر مولوی فضلِ حق کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ ان کی ساری تگ و تاز کی حقیقت ایک سراب کے تعاقب سے زیادہ نہیں ، اور وہ اپنے سادہ لوح معتقدوں کو بھی اسی گمراہ کن اور مہلک فریب میں مبتلا کر رہے ہیں ۔ غالب اس الزام سے آگاہ تھے ، اور اس میں جو وزن ہے ، اسے بھی خوب سمجھتے تھے :

چونکہ نقشِ مدعا معلوم جز موجِ سراب
وادیِ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث

پھر بھی ان کا قوت و شوکت کا پیاسا دل خودبخود اس 'سراب' کی

طرف کھنچتا تھا :

لب تشنہ جوے آب شما رد سراب را[1]

مگر دہم جگرِ تشنہ را دلے بہ دروغ :
نشان دہید بہ راہش ، اگر سرابے ہست ![2]

سرابے کہ رخشد بہ ویرانہ بہتر
ز چشمے کہ پیرایہٴ نم نہ دارد

بے نم آنکھ سے تعریض مولوی فضلِ حق کی خشک منطقیت پر ہے ۔ سراب سے فریب کھانے کی یہ وہی نفسی اور ذہنی توجیہ ہے جو عرفی نے بھی کی ہے :

ز نقصِ تشنہ لبی دان : بہ عقلِ خویش منا ز
دلت فریب گر از چشمہٴ سراب نہ خورد

---

[1] اسی جذبے کا اظہار اور پیرائے میں بھی ہوا ہے :

شبِ فراق نہ دارد سحر : ولے یک چند
بہ گفتگوے سحر می توان فریفت مرا

[2] یہ شعر صریحاً ظہوری کے اس شعر پر مبنی ہے :

شوم ہلاک ، ظہوری ، فریبِ وعدہٴ وصلے
کہ تشنہ را بہ نظر جلوہٴ سراب دہد

ظہوری کا ایک اور شعر بھی ایسی ہی کیفیت کا مظہر ہے :

داد از تشنگی و سیرابی :
گشتہ ام غرق در محیطِ سراب

اپنے مزاج اور فکر سے ہم رنگ پا کر اقبال نے اپنے خطبات میں اس شعر سے اپنے بعض فلسفیانہ خیالات کی توضیح کی ہے - بعید نہیں کہ یہ شعر کہتے وقت فیض کی نظر عرفی کے اس شعر پر بھی ہو :

وہی چشمۂ بقا تھا ، جسے سب سراب سمجھے:
وہی خواب معتبر تھے ، جو خیال تک نہ پہنچے

کوی داخلی واردات یا خارجی روداد نہیں جس پر غالب نے پہلے رومانی انداز سے نظر نہ ڈالی ہو ، اور پھر حقیقت اندیشی کی کسوٹی پر نہ کسا ہو - چنانچہ انھوں نے جس سراب کا دانستہ فریب کھایا ، اس کے پیچ و خم سے وہ باہر بھی نکلے - اس میں ان کی اپنی افتادِ طبع کے علاوہ ، ان کے زمانہ شناس دوست فضلِ حق کو بھی دخل تھا :

کز پیچ و خمِ موجِ سرابم بدر آورد

یہ 'پیچ و خم' اسی موجِ سراب کا ہے جس کے پیچھے سید صاحب آخر دم تک سرگرداں رہے :

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال :
ہر ذرہ ، مثلِ جوہرِ تیغ ، آبدار تھا

پنجۂ نقشِ قدم زد برلبِ موجِ سراب

تا خاکِ کشگانِ فریبِ وفائے کیست
کاندر ہزار مرحلہ موجِ سراب زد ؟

سراب پر ان دو شعروں سے بھی تحریک و محرکینِ جہاد کے بارے میں غالب کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے :

بیدل ، ازین انجمن سرخوشِ درد است ، و بس :
بزم چون باشد سراب ، آبلہ اش ساغر است

بیدل

چون موجِ سرابیم درین وادیِ خون خوار :
ہر چند طپیدیم ، بہ دریا نہ رسیدیم

حزیں

'موجِ شراب' :

غالب کی اس رمز کشائی کے باوجود کہ بات گو 'مشاہدۂ حق' کی ہو ، اس کے اظہار کے لیے 'بادہ و ساغر' سے کام لیے بغیر بات نہیں بنتی ، ان کے کلام سے ، اس غرض کے علاوہ جو وہ اس سے علانیہ رکھتے تھے ، کوی اور مصرف ڈھونڈنے اور منسوب کرنے میں ان سے سؤ ظن کا پہلو نکلتا ہے - تاہم ، حسنِ عقیدت یا بدظنی بر طرف ، اس میں شبہے کی مطلق گنجائش نہیں کہ مے و ساقی کے پردے میں بھی انھوں نے ، بعض اور نشانوں کی طرح جن کی تشریح کی جا چکی ہے ، دعوت و داعیانِ جد و جہاد کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں :

خود موجِ مے از دشنۂ رستم چہ کم استے؟

اس کی ایک مربوط مثال ان کی یہ تاثیر میں ڈوبی ہوئی اردو غزل ہے :

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب'

'موجِ شراب' سید صاحب کی جاں‌فزا تحریک ، اور 'بطِ مے' اس کے قوی ترین مبلغ ، شاہ اسماعیل ، جنھیں یہ لقب ان کی پیراکی میں غیر معمولی مشق اور مہارت کی رو سے دیا گیا ہے -

پوچھ مت وجہِ سیہ مستیِ ارباب چمن :
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے ، بختِ رسا رکھتا ہے :
سر سے گزرے پہ بھی ہے ، بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم ، کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں ، بہ دمِ آبِ بقا ، موجِ شراب

بس کہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر :
شہ پرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

' دیتی ہے طاقتِ پرواز یہ کیفیتِ مے :
اس ہوا میں ہے بطِ مے، کہ اڑے بے پر و بال
ذوق

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے ، زہے موسمِ گل!
رہ برِ قطرہ بہ دریا ہے ، خوشا موجِ شراب!

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال :
ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب[1]

ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے داغ :
بس کہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ ، اسد!
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

آخری چار شعروں میں 'نوخیز' شاعر نے بالخصوص وہ کیفیت بیان کی ہے جو اس تحریک سے خود اس پرگزری : سید صاحب کے تصرف سے 'نشے کے پردے میں' 'سرِ نشو و نما' ؛ 'جلوۂ گل' سے ہوش اڑنا ، یعنی ان کی تحریک کے کڑے مطالبوں کی تاب نہ لانا ۔

---

[1] دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساقی ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا

(عمل کی بجائے خیال پر قانع ہونا :
ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال)

'گریہ' :

غزل گو شاعروں نے بعض غیر متجانس داخلی اور خارجی امور کی ، اور نہ صرف مضمحل اور منفعل بلکہ فعال کیفیتوں کی ، ایک ہی لفظ سے نشان دہی کی ہے - ان میں 'گریہ' بھی شامل ہے ، جس سے میر تک نے دونوں قسم کے کام لیے ہیں - مگر غالب سے زیادہ اس عمل کو شاید ہی کوی اور شاعر دونوں مصرفوں میں لایا ہو - اس کے ثبوت میں پہلے ان کے اردو کلام سے کچھ ایسی مثالیں دی جاتی ہیں جن میں یہ لفظ اور اس کے مترادفات تحریکِ جد و جہاد کے لیے استعمال ہوا ہے - کہیں اس سے تحریک کی حمایت اور کہیں مخالفت کا پہلو نکلتا ہے :

سرشکِ چشمِ یار آبِ دمِ شمشیرِ ابروا ہے

' کسی کے ابروے خوش خم کا کشتہ ہوں : تعجب کیا
جو میری خاک سے تعمیر محرابِ عبادت ہو

ابرو کے تیغ سے ایما ہے کہ آ :
قتل کرنے کو بلاتے ہیں مجھے ۔
مومن

ذبیحِ ابروے خوں ریز اک زمانہ ہوا
ذوق

گریۂ طوفاں رکاب : نالۂ محشر عناں :
بے سر و ساماں اسد فتنۂ سر انجام ہے[1]

بے ذوقِ گریہ ، عزمِ سفر کیجیے ، اسد !
رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

دیکھتا ہوں وحشتِ شوقِ خروش آمادہ سے
فالِ رسوای سرشکِ سر بہ طوفاں دادہ سے

گر یہ چاہے ہے خرابی مرے ویرانے کی :
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ آ پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

---

[1] ان اشعار میں بھی 'اسد' قائم مقام ہے سید احمد شہید کا ، امیر خاں کی سپر افگنی کے بعد :

نہ پوچھ کچھ سر و سامان و کاروبارِ اسد
جنوں معاملہ ، بیدل ، فقیرِ مسکیں ہے
یارو ، اسد کا نام و نشاں کیا ؟
بیدل ، فقیرِ آفت رسیدہ
(جوشِ جنوں سے ، جوں کسوتِ گل
سر تابہ پا ہوں جیبِ دریدہ)

وفورِ عشق نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گیے مرے دیوار و در ، در و دیوار

عرضِ سرشک پر ہے فضاے زمانہ تنگ :
صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوی ؟

غالب ز بسکہ سوکھ گیے چشم میں سرشک :
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گیی

انفعالی استعمال سے غالب کا اردو اور فارسی کلام تر بتر ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں :

دیدۂ گریاں مرا فوارہٗ سیماب ہے

رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی ، کہ ایک بار
مژگاں کو دوں فشار بے امتحانِ اشک

ضعف سے ، اے گریہ ، کچھ باقی مرے تن میں نہیں :
رنگ بن کر اڑ گیا ، جو خوں کے دامن میں نہیں

در کشمکشِ گریہ زہم ریخت وجودم

---

[1] اشکے نہ ماند باقی از فرطِ گریہ ، غالب !
سیلے رسید گوی ، وز دیدہ شست نم را

دیگر ، بہ ذوقِ گریہ ، بہ دل جوش می زند
خونے ، کہ صد رہ از مژۂ تر گرفتہ ایم

فارسی میں بھی تحریکِ جد و جہاد کے لیے 'گریہ' کی علامت استعمال ہوئی ہے :

گریہ را از جوشِ دل تسبیحِ مرجان کردہ ام

غالب ، مرا ز گریہ نویدِ شہادتے ست

شدہ است گریہ بہ میدانِ کارزار گرہ

زوال و انحطاط کے عالم میں 'گریہ' سے سرگرمیِ عمل کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے :

کم مشمر گریہ ام ، زان کہ بہ علمِ ازل
بودہ درین جوے آب گردشِ ہفت آسیا

گرستیم آن قدر ، کز خون بیابان لالہ زارے شد :
خزانِ ما بہارِ دامنِ صحرا ست ، پنداری

ایک شعر میں شاہ اسماعیل کی فنِ پیراکی میں مہارت کی طرف اشارہ ہے ، جس کی بدولت وہ بہاؤ کے ساتھ اور اس کے مخالف

دونوں سمت تیرنے پر یکساں قادر تھے :

گریہ ارزانیِ آن دل ، کہ بہ نیرو باشد
بہ شناور زیِ سیلابِ خطرہا گستاخ[1]

ایک شعر میں مولوی فضلِ حق کے اس الزام کو بیان کیا گیا ہے کہ شاہ صاحب اپنی رقت آمیز ، شورش انگیز دعوتِ جہاد سے سادہ لوح مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے درپے ہیں[2] :

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو ، اے اہلِ جہاں!
دیکھنا ان بستیوں کو تم ، کہ ویراں ہو گئیں

یہی الزام ایک اور شعر میں اس صورت سے دہرایا گیا ہے :

گریہ کرد از فریب ، و زارم کشت

---

[1] 'مولانا (اسماعیل) دریائے جمن کی راہ سے آگرہ اور آگرے سے دہلی کئی کئی بار ہو آئے ۔' (''حیاتِ طیبہ'')

[2] مولوی فضلِ حق کے اس الزام کی تکرار کئی اور شعروں میں بھی کی گئی ہے :
عبث در آب و آتش رانده ای بازار گانان را

خونِ ہزار سادہ بہ گردن گرفتہ اند
آنان کہ گفتہ اند : 'نکویان نکو کنند'

اس شعر کا دوسرا مصرع ہے :

نگہ از تیغ آب دار تر است

اردو میں یہی مضمون زیادہ ڈوب کر ادا ہوا ہے :

تری طرح کوی تیغِ نگہ کو آب تو دے!

یہ سید صاحب کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جسے اقبال نے ، شاید اسی سے متاثر ہو کر ، 'نگہ کی تیغ بازی' کہا ہے -

دورِ مغلیہ کا زوال اور غالب

دردِ روغن بہ چراغ ، و کدرِ مے بہ ایاغ :
تا خود از شب چہ بجا ماند ، کہ مہمان شدہ‌است ؟

غالب اپنے زمانے کی برائے نام مغل بادشاہت کو ، جو انگریزوں کے رحم و کرم پر موقوف تھی ، کس نظر سے دیکھتے تھے ، اس کا بخوبی اندازہ ان اشعار سے ہو جاتا ہے :

اے کاش بتاں کا خنجرِ سینہ شگاف
پہلوے حیات سے گزر جاتا صاف !

اک تسمہ لگا رہا ، کہ تا روزے چند
رہیے نہ مشقتِ گدای سے معاف

گویا ایسے موہوم ، بے نام و ننگ وجود سے جو

ہر چند کہیں کہ ہے ، نہیں ہے

کے مصداق ہو[1] ، نہ ہونا بہتر - یہی جذبہ فارسی میں یوں ادا کیا

---

[1] ہستی ہماری اپنی فنا پر ذلیل ہے :
یاں تک مٹے ، کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے !

گیا ہے :۔

در تیغ زدن منتِ بسیار نہادند :
بردند سر از دوش ، و سبک دوش کردند

این شمع ، شب آخر شد ، و خاموش نہ کردند

مغل اقتدار کا ٹمٹماتا ہوا دیا ، جس کا ، حالی کے بقول ، سارا تیل جل چکا تھا ، ان کے خیال میں اب اسی سلوک کا مستحق تھا کہ اسے پھونک مار کر گل کر دیا جائے :

بہ ہجران زیستن کفر است : خونم را دیت نبود :
چراغِ صبح گاہم : آشکارم می توان کشتن

غالب نے 'وصل' سے 'جاہ و جلالِ عہدِ بتاں' کو تعبیر کیا ہے :

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں :
آگ اس گھر میں لگی ایسی ، کہ جو تھا جل گیا

اور 'شب ہائے تار' کو 'جہانِ خراب' کی نشانی بنایا ہے :

کب سے ہوں ، کیا بتاؤں ، جہانِ خراب میں
شب ہائے تار کو بھی رکھوں گر حساب میں

اس بھیانک عالم سے نجات کی آرزو بھی انھوں نے ظاہر کی ہے :

درازیِ شبِ ہجران ز حد گزشت : بیا
فدائے روے تو عمرِ ہزار سالۂ ما !

اس آرزومندی کا مرجع سید احمد شہید ہیں ، جن سے یہ توقعات وابستہ تھیں کہ وہ 'ہجر' سے بدلہ لیں گے :

می خواہد انتقام ز ہجران کشیدنی :
خون گرمیِ دل از نفسِ آتشین شناس

مغلوں کے زوال کے بارے میں غالب نے ایک جگہ کہا ہے :

فرمان روانہ گشت مسلمان بہ ہیچ قصر :
مغ رفت گر ز مے کدہ ، ترسا فرو گرفت

گویا فرماں روای ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تو کیا ہوا ؟ ایک تو تاریخی عمل کا تقاضا یہی ہے کہ

سلطنت دست بہ دست آئی ہے

دوسرے بعد کے مغل آخر کون سے ایسے 'مسلمان' ، یعنی 'روشِ دین و دانش' اور 'رہ و رسمِ کارسازی' پر کاربند تھے ؟ یہ نہیں کہ غالب کو زوال و انحطاط کا احساس اور قلق نہ تھا ۔ اس کے شعور اور چوٹ سے تو ان کا کلام لبریز ہے :

دل بہ بے رونقیِ مہرِ درخشانم سوخت

سلطانیِ قلم روِ عنقا به من رسید :
کو نقشِ ناپدید ، که بر خاتم افگنم ؟

روزم از تیرگی آن وسوسه ریزد به نظر
که شبِ تار به هنگامِ فرو مردنِ شمع

فتیلهٔ رگِ جان سر به سر گداخته شد :
ز پیچ و تابِ نفس هاے آتشین پیداست

سوخت آتش کده : ز آتش نفسم بخشیدند :
ریخت بت خانه : ز ناقوس فغانم دادند

هرچه از دستِ گهِ پارس به یغما بردند
تا بنالم هم ازان جمله ، زبانم دادند

در گردِ غربت آینه دارِ خودیم ما
یعنی ، ز بے کسانِ دیارِ خودیم ما

هر کس خبر ز حوصلهٔ خویش می دهد :
بد مستیِ حریف ، و خمارِ خودیم ما

دیگر ز سازِ بے خودیِ ما صدا مجوے :
آوازے از گسستنِ تارِ خودیم ما

نگہ تا دیدہ خون استے ، و دل تا زہرہ آب استے

مگر اپنے پختہ تاریخی شعور کی بدولت ، وہ محض کڑھ کر ہی نہیں رہ جاتے تھے ، بلکہ اپنے تیرہ و تار زمانے کے بعد ایک تاب ناک دور کا خواب بھی دیکھتے تھے ، اور اس کی بشارت بھی دیتے تھے :

مژدۂ صبح درین تیرہ شبانم دادند :
شمع کشتند ، و ز خرشید نشانم دادند

شمع بجھنے پر جو سورج نکلا ، وہ روشنی کے ساتھ جھلسا دینے والی تمازت بھی لایا ، مگر غالب ، ایک کھوکھلے نظامِ زندگی سے چھٹکارا پانے کی خاطر، اس کے لیے بھی تیار تھے کہ ان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے :

خوشا کہ گنبدِ چرخِ کہن فرو ریزد
اگرچہ خود ہمہ بر فرقِ من فرو ریزد !

یہ صورت ان کی زندگی ہی میں پیش آ گئی ، اور اس کی خوں چکاں روداد انھوں نے اپنے خطوں میں بڑی درد مندی سے قلم بند کی ۔

غالب کے قصیدوں اور مثنویوں میں بعض غیر متعلق اجزا

ہر نوا نامِ دگر دارد ، ز فرقِ زیر و بم
ورنہ خود یک زخمہ و یک تار و یک آواستے

سخن یکے ست ، ولے در نظر ز سرعتِ سیر
کند ، چو شعلۂ جوالہ ، نقطہ پرکاری

صنفِ سخن کوئی ہو ، عنوان کچھ ہو ، غالب ان میں ، دانستہ یا بے اختیار ، باتیں وہی کھینچ لاتے ہیں جو ان کے دل و دماغ میں بسی اور رچی ہوئی ہیں -[1] اس کی کچھ مثالیں تو مختلف اصناف کے اشعار سے دی جا چکی ہیں - اب ہم ان کے مختلف قصیدوں سے کچھ ایسے اشعار انتخاب کرکے پیش کرتے ہیں جو اپنے عنوان سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے ، بلکہ ان ہی اشخاص اور معاملات

---

[1] 'خواستہ و بے خواستہ انچہ در دل است ، از لب فرو می ریزد -'
'ہرچہ در دل است ، ازاں پردہ فرو ریزد ، بلکہ پردہ خود از میان برخیزد' (''پنج آہنگ'')

سے متعلق ہیں جو غالب کے شعری کاوش کا حقیقی مرکز و محور ہیں -

جس قصیدے کو مہر صاحب نے 'در مدحِ فتح الملک' کا عنوان دیا ہے ، اس میں بھی ، ممدوح سے بے تعلق ، وہی مضامین بیان کیے گیے ہیں ، جنہوں نے غالب کے دوسرے قصیدوں میں راہ پای ہے - ان مضامین کی تکرار ، اور ان کی 'نایافت' کا اشارہ اس شعر میں موجود ہیں :

پر گفتم ازین راز ، ولے چون نگرستم
ناگفتہ و نا یافتہ بسیار برآمد

ان میں سے کچھ مضامین کی تصریح کی جاتی ہے -

امیر خاں کا سید صاحب سے بے فیض رہنا اور ان کے جادۂ مستقیم سے انحراف :

آن آب ، کہ از خاک ہمی سبزہ دماند
در طینتِ آہن ہمہ زنگار برآمد

دوسرے حریفوں کی طرح ، امیر خاں کا بھی انگریزی فوج کے مقالے میں نہ ٹھہر سکنا :

با لشکرِ اژدر شکن و قاف شگافش
پر سوختہ اختر کہ بہ پیکار برآمد

یا چہرہ شد ، و تیغ دودم بر سرو رو خورد
یا قلعہ نشین گشت ، و بہ زنہار برآمد

('سوختہ اختر' : جنرل 'اختر لونی' سے ٹکرا کر سرنگوں ہونا)

سید صاحب کی دعوت پر فضلِ حق کا 'انکار' اور شاہ صاحب کا 'اقرار' :

گویند کہ در روزِ الست از رہِ مستی
حرفے ز لبِ کافر و دین دار برآمد

آن از 'نعم' آوازۂ انکار در افگند
این را ز 'بلی' معنیِ اقرار برآمد

شاہ صاحب کا سید صاحب کے ساتھ یک دل و یک جان ہونا :

ز ان گونہ در آمیخت یکے با صنمِ خویش
کش نقشِ دو پیکر بہ نمودار برآمد

سید صاحب کے دہلی میں ورود کے بعد شاہ صاحب کی شورش انگیز دعوتِ جد و جہاد اور اس سے شاعروں کا اثر اندوز ہونا :

زاہد بہ نشاطے زدہ از حجرہ بدر گام
کز کنجِ قفس مرغِ گرفتار برآمد

شوریده ادائے بہ دمِ تیشہ روان داد
آشفتہ نوائے بہ سرِ دار برآمد

مرغانِ چمن عربدہ بنیاد نہادند
مہر از آفقِ گنبدِ دوار برآمد

ذیل کے شعر کے پہلے مصرعے میں اشارہ ہے اپنے تحریک کے مذہبی لوازمات کی تاب نہ لانے ، اور دوسرے میں اپنے دوست فضل حق کی زنار پوشی ، یعنی تحریکِ جہاد کی مخالفت کی طرف ، جس کا رخ اب سکھوں کی طرف ہوگیا تھا :

در دستِ یکے آبلہ زد دانۂ تسبیح
بر دوشِ یکے رشتہ ز زنار برآمد

دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں اپنے دوست کے بارے میں کہا ہے :

آن روفت درِ مے کدہ ، و خردۂ زر یافت

دوسرے میں کہا ہے کہ میں نے 'درِ صومعہ' کھٹکھٹایا ہی تھا کہ اندر سے سانپ نے سر نکالا (اور میں الٹے پاؤں جان بچا کر بھاگا) :

این کوفت درِ صومعہ ، و مار برآمد !

بہادر شاہ کی مدح میں امیر خاں کی سپرافگنی کی روداد :

تو اے کہ چون بہ عدو طرحِ آشتی فگنی !
بہ من در افتی . . . . -

ز دست رفتہ عنانم بہ عالمے ، کہ در آن
ز رشتہ ریش کند طفل پاے عنقا را

('رشتہ' : خطِ صلح ؛ 'طفل' : اختر لونی ؛ 'عنقا' : سید صاحب)

بہاے دل نہ شماری مگر فزون ز نیم نگاہ

مگر فروختہ باشم متاعِ یغما را

شکستہ ایم بہ روے بساط مینا را

ولے چہ سود پراگندہ کردن اجزا را ؟

چرا بود کہ سکندر رود بہ تاریکی ؟

کشیدہ اند در آغوشِ زالِ دنیا را

مشتری ستارہ پرستار ، کہ فتابے ہست!
فرو گرفتہ فروغش نہان و پنہان را

(سید صاحب کا دامن چھوڑ کر 'اختر لونی' کی پرستش نہ

امیر خاں کو تختِ دہلی پر بٹھانے کا سید صاحب کا منص
ناکام ہونا : تخت کی بجائے مصلا !

بہ عکسِ خاتمِ جم ، کہ اہرمن ربود از وے

بہ رغمِ تختِ سلیماں ، کہ بر ہوا می رفت
بہ روے آب ہمی گسترد مصلا را !

'بہادر شاہ' کے پردے میں سید صاحب :
زہے ز خویش نشانِ کمالِ صنعِ الٰہ !

دلیلِ راہ روان ، مرشدِ خدا آگاہ

دمِ مراقبہ ، صورت نماے جوہرِ عقل :
گہِ مشاہدہ ، نیرو فزاے نورِ نگاہ

بہ فیضِ آگہی ، آیین شناسِ سیر و سلوک

...کہ از خرابہ ما روے آفتابے ہست
غالب

ز خاکِ رہ گزرش سرمہ آرزوے عیون

بر آستانِ درش سجدہ آبروے جبہہ

در ہزاران مرد ، مردِ رہ یکے است
آدمی بسیار ، اما شد یکے است

شاہِ ما دارد ہم در راہ روی
خرقۂ پیری و تاجِ خسروی

معنیِ رمزے کہ شہ فرمودہ است
حفظِ ناموسِ شریعت بودہ است

سالکِ آزادۂ چابک خرام

ز حق ہر کہ فرمانِ شاہی گرفت
تواند ز مہ تابہ ماہی گرفت

جوہرِ نامِ من ، و شہ جوہرے است

عزمش اگر بانگ براشہب زند
قافلۂ خور بر دلِ شب زند

بہل افسانہ بغدادی و بسطامی را :
شہ بہ بالغ نظری سیرت و شانے دارد

اے کہ در بزم دل افروز نگہش دیدی
بین کہ در رزم جگر دوز سنانے دارد

بہادر شاہ کے نام اردو میں غالب کے دو قصیدے ہیں - ایک میں ممدوح کو 'قبلہ' چشم و دل ، قرار دیا ہے :

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیِ الہام

اور اسے 'نوبہارِ حدیقہ' اسلام' اور 'شہ سوارِ طریقہ' انصاف' کے القاب دیے ہیں -

دوسرے قصیدے میں 'شاہِ روشن دل' بہادر شہ' کی توصیف میں کہا ہے :

رازِ ہستی اس پہ سرتا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دل فریب
تو کہے بت خانۂ آزر کھلا !

اس قصیدے کا ایک معنی خیز مصرع ہے :

ہو سکے کیا مدح ؟ ہاں ، اک نام ہے[1]

پھر بچارے بہادر شاہ ہے وہ ایسی صفات کیسے منسوب کر سکتے تھے ، جن کا سزاوار ان کے زمانے میں سوائے سید صاحب اور شاہ صاحب کے نہ کوی تھا ، نہ وہ کسی کو سمجھتے تھے ۔ غالب نے بہادر شاہ کے بارے میں اپنا اصلی تاثر ایک فارسی شعر میں کھل کر بیان کر دیا ہے ، اور استاد ذوق کے درباری توسل پر بھی چوٹ کر گیے ہیں :

نہ ہما سایہ ام ، نہ سگ طینت :
طعمہ از استخوان نہ می خواہم

---

[1] والا خلفِ شاہِ جہان بین ، و شکوہش :
از شوکتِ محمود چہ گوی، نہ غلام است؟

جس 'محمود' کا دوسرے مصرعے میں نام آیا ، وہ کسی ایاز کا نہیں، انگریز کا 'غلام' ہے ۔ کہاں وہ جاہ و جلال ، کہاں یہ بے دست و پای !

'در مدحِ نصیرالدین حیدر ، کے پردے میں سید صاحب کی خدمت میں باریابی اور ارادت مندی پیدا کرنے پر کشش اور گریز سے مملو کیفیت :

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضوان رفتم
بہوسِ زلفِ ترا سلسلہ جنبان رفتم

شمعِ بختِ جگرِ تشنہ فروزان گردید
کہ اندر آن نور بہ سرچشمۂ حیوان رفتم

اندر آن بقعۂ معمور ، ز دل تنگیِ خویش
حسرت آگین ، چوگنہ گر بہ زندان ، رفتم

نقشِ آوارگیے بود بہ پیشانیِ من

متحیر کہ کجا می برد آوارگی ام :
متألم ، کہ درین مرحلہ از جان رفتم !

طاقتِ عرضِ غبارے بہ کفِ خاکم نیست :
زین چہ خیزد ، کہ بہ جولانگہِ خوبان رفتم ؟

پرفشان بودم ، و بیرون ز خودم راہ نہ بود

جلوه در طالعِ خاشاکِ من افتاد زبون :
شد غلط جادۂ گلخن ، به گلستان رفتم !

کاش می سوختم ، و دادِ فنا می دادم !
شرم بادا ، که بدان تازه خیابان رفتم !

سعی در بابِ رہای نہ بود ، خیرِ فنا :
دودِ آہے شدم : از روزنِ زندان رفتم

تا سبک روحیِ من رنجِ گرانی نہ کشد
شبِ وصلے شدم ، و زود بہ پایان رفتم

نہ بہ دل رفتم ازان بقعہ ، بل از جان رفتم

ناتوانی بہ تواضع ادب آموزِ من است :
پاے سورم : رہِ کوے تو بہ مژگان رفتم

منِ مورِ ضعیف
راہِ نسبت طلبی بین ، کہ چہ شایان رفتم !

قصاید در مدحِ 'صاحبانِ انگلستان' :

'اسٹرلنگ' کے نام ایک قصیدے میں غالب نے شکایت کی ہے، کہ ان کا 'نامہ' شوق' اپنی 'ہرزہ عنوانی' کی وجہ سے 'بہ چار سوے قبولِ نہ برد راہ'؛ 'نکتہ داشتنِ اندازۂ ثنا خوانی' کی

ضرورت جتای ہے ، اور جو پڑھنے والے ، 'اندازۂ ادا فہمی' اور 'اندازِ مدعا دانی' کی 'لطافت' اور 'نزاکت' کی بدولت ، ان کے مافی الضمیر تک پہنچ گیے ، ان کو سراہا ہے - 'فرزانہ پر نسب ، کے نام ایک قصیدہ ہے ، جس میں یہ شعر آتے ہیں :

اے آن کہ کنند سایۂ دستِ تو ہمای !
سہل است کہ شاہی ز تو خواہم ز گدای

اے آن کہ ، بہ فرمانِ قضا ، کعبۂ خلقی !
اے آن کہ در آیینِ وفا قبلۂ مای !

در ناصیۂ جوہرِ جان تابشِ مہری
در مردمکِ دیدۂ دل نورِ وفای

گر مشربِ توحید شود ، چشمہ زلالی
ور صورتِ معنی شود ، آینہ صفای

در مے کدۂ یادِ خدا گردشِ جامی
در قافلۂ فیضِ حق آوازِ درای

'مدحت گری' کا کوی گر نہیں جو میرزا صاحب نظم اور نثر میں کام میں نہ لاے ہوں ، مگر اس فن کا کوی قرینہ ایسا نہیں جس کی رو سے ان اشعار کا ربط 'پرنسپ' سے قایم کیا جا سکے - غالب

کے ممدوحوں میں ، سوائے سید صاحب اور شاہ صاحب کے ، کوی اور شخص نہیں جسے وہ عقیدت کے اس جذبے کے ساتھ خطاب کا مستحق سمجھتے - اسی طرح 'تامس ماڈک' کی تعریف میں یہ شعر ملتے ہیں :

مرحبا داورِ جم مرتبہ ، تامس ماڈک !

شرطِ اسلام بود ورزشِ ایمان بالغیب!
اے کہ تو غایب ز نظر ، مہرِ تو ایمانِ من است

کشتہ تیغِ وفا عشرتِ دیگر دارد :
عید در معرکہ شوقِ تو قربانِ من است

گفتم : این چیست ، کہ ما 'جوشِ بہار' اش گوییم ؟
گفت : فیضِ تو ، کہ آن موجہ طوفانِ من است[1]

در رہت خامہ من خضرِ بیابانِ من است

نامہ شوقم ، و جبریل حدی خوانِ من است

اس کے مخاطب بھی ، ان ہی دو بزرگوں کے علاوہ ، اس عہد کا

---

[1] اگر داغت وجودم را در اکسیرِ نظر گیرد
سراپاے من از جوشِ بہاران پردہ بر گیرد

کوئی فردِ بشر نہیں ہو سکتا ۔ ان اشعار کا عنوان 'ماڈک' کو بنانے کی 'ہرزہ عنوانی' پر غالب خود شرم سار نظر آتے ہیں ، اور واقعی اس ناواجب حرکت پر وہ جتنے شرمندہ ہوتے ، کم تھا :

این چہ حرف است کہ گفتم ، ز سخن شرمم باد !
ناروائے است متاعے کہ بہ دکانِ من است

آخر میں 'چارلس مشکفِ فرخندہ شمایل' کی شان میں ان اشعار کو غور سے پڑھیے ۔ امید ہے کہ آپ غالب کی وہ توقع پوری کریں گے جو اس قصیدے کے ایک شعر میں انھوں نے ظاہر کی ہے :

ہو کہ اندازہ گراید بہ درستی ز خلل !
ہو کہ اندیشہ گراید بہ حقیقت ز مجاز !

'حقیقت' یہ ہے کہ ان کا مرجع بھی سید صاحب اور شاہ صاحب ہی ہیں :

چارلس مشکفِ فرخندہ شمایل ، کہ بہ دہر
بستہ بر دامنِ نظارہ ز فردوس طراز

آن کہ بر خاکِ درش چرخ ، پےِ عرضِ سجود
شب و روز از مہ و خورشید بود ناصیہ ساز

چشمِ بد دور ، نہ ہر جادہ بہ صحرائے تو گشت
تارِ گل دستۂ نقشِ قدمِ شاہدِ ناز

بہ رخ از تابِ رخش فرِ سعادت پیدا :
در رہ از گردِ رہش ، خیلِ ہما در پرواز

عزمِ وے ، در روشِ عربدہ ، با چرخ سہیم :
رائے وے ، در اثرِ جلوہ ، بہ خورشید انباز

فرصتت باد ، کہ آرایشِ ایوانِ تو شد
داورِ عادلِ ظالم کشِ مظلوم نواز !

جوشِ آہنگِ ہزار است ترا بانگِ سرود :
موجِ نیرنگِ بہار است ترا رشتۂ ساز

آخری شعر میں اس بہاریہ آہنگ کی طرف اشارہ ہے جو شاعروں نے، سید صاحب اور شاہ صاحب کی ہدایت پر ، ان کی تحریک کے بارے میں اختیار کیا ۔

ایک قصیدہ نما غزل میں خطاب بظاہر 'جمس طامسن' سے ہے ، مگر ان اشعار کی در و بست دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ ان کا درپردہ مرجع غالب کے حقیقی ممدوح ، شاہ اسماعیل ، نہ ہوں :

عکس روے تو درین آینہ پر تو فگن است

راست گفتارم ، ویزدان نہ پسندد جز راست
حرفِ ناراست سرو دن روشِ امرِ من است

راستی این ، کہ دمِ مہر و وفاے تو بہ دل
باہم آمیختہ مانندِ روان با بدن است

آن چنان گشتہ یکے دل بہ زبانم ، کہ مرا
می توان گفت کہ لختے ز دل اندر دہن است

دوری از دیدہ اگر روے دہد ، دور نہ ای
زان کہ پیوستہ ترا در دلِ زارم وطن است

وکٹوریا کے نام غالب کے تین قصیدے ہیں - اس صنف کے رسمی پہلو کے علاوہ ، تینوں میں کچھ ایسی باتیں ہیں جن کو ممدوحہ سے کوئی علاقہ نہیں - پہلے قصیدے کے کچھ شعر یہ ہیں :

نطقم نخست زمزمۂ خون چکان دہد
کز خون طراز بر ورقِ داستان دہد :

آہ از فلک ، کہ چون زند آتش در آفتاب
نظارہ را بدان بہ فریبد کہ نان دہد !

زین سرگزشت دادِ سخن در بیان دہد

ناسازیِ غم این ، و نہ خواہم بہ بزمِ راز
سازے کہ بانگِ زمزمۂ 'الامان' دہد

تا در سرام ہوائے کہ باشد، کہ آن ہوا
کہ مرا مجادلہ با کہکشان دہد ؟

آن مورِ سر کشم ، کہ چو مرگش امان دہد
از ننگِ پایمال ، بہ پرواز جان دہد

اندیشہ گر ، بہ فرض ، برد رہ بہ منظرش
افلاک را ز دور بہ پستی ، نشان دہد

آن باد ، و در خور است کہ فرمان دہی کنم
غالب ، کہ نامِ من ز حقیقت نشان دہد

لب بستم از خطابِ ز من بوس ، بعدِ مدح :
مشکل کہ سازِ عجز نوائے چنان دہد

ان اشعار سے میرے خیال میں یہ مفہوم نکلتا ہے :

شاعر 'خون چکان' ہے ملک و ملت کے آب و نمک کے فریب میں آ کر خاک و خون میں ملنے پر - یہ تو وہ خوب سمجھتا ہے کہ پانی تو عرصہ ہوا سر سے گزر چکا ، مگر چاہتا ہے کہ فاتح قوم کی ملکہ کے نام قصیدے میں اس جاں فرسا حادثے پر اپنے دردِ دل کا دلیرانہ ذکر کر کے اپنی سخن وری کے جوہر دکھلائے - وہ لاکھ نحیف و نزار ہو ، مگر 'سازِ عجز' سے 'بانگِ الامان' نکالنا کسرِ شان سمجھتا ہے - وہ اس 'سر کش' چیونٹی کی طرح ہے جسے پامال ہو کر جان بچانے کی ذلت کسی صورت میں گوارا نہیں -

جس کی شان میں وہ آج قصیدہ کہنے پر مجبور ہے ، عالمِ تصور میں، کل اس کا کاخِ بلند پست دیکھتا ہے - آخر میں اپنے غلبے اور فرماں روای کی آرزو کا اظہار کیا ہے : یہ آرزو شخصی بھی ہے اور اجتماعی بھی -

دوسرے قصیدے کے کچھ شعر یہ ہیں :

بہرام دل بہ بستنِ تیغ و کمر نہاد
ناہید ذوقِ ورزشِ مضراب و تار یافت

('بہرام : شاہ صاحب ؛ 'ناہید' : غالب)

عاشق ز بس کہ شاہدِ بے داد پیشہ را
از بہرِ خویش غم گسل و غم گسار یافت

('شاہدِ بیداد پیشہ' : شاہ صاحب)

جمشید ، کش بہ شاہ سرِ ہم سری نہ بود
ساقی گری گزید ، و دران حلقہ بار یافت

'جمشید' بادہ آشام شاعر ہے ، جس نے سید صاحب کے حلقے میں ، زورِ بازو کی بجاے ، 'ساقی گری' یعنی ان کے خیالات کو گردش میں لانے کی بدولت اپنے لیے جگہ نکالی[1] -

---

[1] مرا است قبلہ' حاجات و کعبہ' آمال
یگانہ اے کہ بہ بزمش کشودہ ام جارا

ایک شعر میں ملکۂ معظمہ کے 'انتظامِ شاہی' پر 'انتشار' کے ذو معنی لفظ سے چوٹ کا پہلو نکلتا ہے :

از انتظامِ شاہی و آیینِ خسروی
سور و سرور و دانش و داد انتشار یافت

دوسرے شعر میں 'خطِ بندگی' چاک کرنے کو ایک مستحسن فعل قرار دیا گیا ہے :

ور بندہ خود ز خشم خطِ بندگی درید
توقیعِ خوش دلی ز خداوندگار یافت

تیسرے قصیدے کے کچھ شعر یہ ہیں :

نامہ ز وکٹوریا چو نام ور آمد
از افقِ نامہ 'آفتاب' بر آمد

آن کہ بہ بیدائے دل کشِ تقدس
راہ رو و راہ دان و راہ بر آمد

جادۂ رہ تارِ سبحۂ گوہر آمد

جز جگرِ لخت لخت و آبلۂ پا
ہیچ نہ آورد ، ہر کہ زین سفر آمد

ناگہ صداے شکستِ دل بود : آرے
بانگ دہد شیشہ کہ بر حجر آمد

چند فریبم بہ حرف و صوت خرد را ؟

آمدہ غالب بہ عرصہ ، گر دگران را
روز فرو رفت ، و سوز و ساز سر آمد

ان اشعار کی تشریح میری دانست میں یہ ہے :

نام وکٹوریا کا لیا تھا کہ نمودار اوپر سے 'آفتاب' ہوگیا ۔ یہ وہی آفتاب ہے جس کی شان میں غالب نے ایک غزل میں کہا ہے ۔

کہ در خرابۂ ما روے آفتابے ہست

اس کی تصدیق ان صفات سے ہوتی ہے :

'بہ بیداے دل کشِ تقدس'
'راہ رو و راہ دان و راہ بر'

جس کا

جادۂ رہ تارِ سبحۂ گوہر

تھا ۔ 'جگرلخت لخت' مجاہدوں کی مہمِ آزادی ناکام ہونے پر ہے ۔ اظہار کا یہ پیرایہ یوں اختیار کیا گیا کہ ما فی الضمیر 'خرد' پر آشکار نہ ہونے پائے ۔ یہ 'خرد' وہی 'شیخِ نہفتہ دان' ہے جس سے غالب کا رشتہ 'میرا دوست : میرا دشمن' کا تھا ۔ آخری شعر میں

فخر کیا ہے کہ سب شاعر تھک ہار کے بیٹھ رہے ، مگر اس عاجز کا دم خم ابھی باقی ہے -

اب ہم غالب کی دو مثنویوں ''چراغِ دیر'' اور ''رنگ و بو'' کے کچھ شعر درج کرتے ہیں - ان سے ضمیر کی وہ خلش[۱] ظاہر ہوتی ہے جو دعوتِ جہاد پر لبیک کہنے[۲] کے بعد 'فرمانِ دوست' سے رو گردانی پر ، غالب ساری عمر محسوس کرتے رہے :

من کافرِ زنہارے شاہم . . .

دادی صلائے جلوہ ، و غالب کنارہ کرد :
کو بخش آن گدا کہ ز غوغا نفور بود ؟

دارم بہ کنجِ غم کدہ رشکِ کسے ، کہ او
در جلوہ گاہِ دوست بہ غوغا شود ہلاک

نامرد را بہ لخلخہ آسایشِ مشام :
مرد از کفِ سموم بہ صحرا شود ہلاک

اس کوتاہی کی تلافی انھوں نے موقع بے موقع اس دعوت کی زبانی تکرار سے کی ہے جسے عملاً قبول کرنے کی توفیق اور سکت انھوں

---

[۱] بے سخن گرد ز دامانِ ضمیر افشاندہ

[۲] ذوقِ ایمان در نہادم بود ، تا گفتم : 'بلے !'
غالب

نے بھی، دوسرے 'ہم مشرب و ہم راز' شاعروں کی طرح ، اپنے میں نہ پای ۔ ان اشعار کا مثنویوں کے عنوان سے کوی علاقہ نہیں ۔ (جس جذبے نے یہ شعر کہلوائے ہیں ، وہ مومن نے یوں بیان کیا ہے :

ہو اور کو تو ہدایت ، جو خود ہوں آوارہ
یہ عمر کاشکے جوں نالۂ جرس گزرے ![۴])

الا ، اے غالبِ کار اوفتادہ
ز چشمِ یار و اغیار اوفتادہ !

چہ محشر سر زد از آب و گلِ تو ؟
دریغا از تو ، و آہ از دلِ تو !

راہ غلط کردہ ، بہ افسونِ دیو
می سپری مرحلۂ رنگ و ریو

چہ جوی جلوہ زین رنگین چمن ہا ؟
بہشتِ خویش شو از خون شدن ہا

جنونت گر بہ نفسِ خود تمام ست
ز کاشی تا بہ کاشان نیم گام ست

---

[۴] گرچہ در نظمِ جہان کارے نہ می آید ز ما
از حدیثِ راست ، سروِ این خیابانیم ما
صایب

فرو ماندن به کاشی نارسای است
خدا را این چه کافر ماجرای است ؟

چو بوے گل ، ز پیراہن برون آے
به آزادی ز بندِ تن برون آے

مده از کف طریقِ معرفت را
سرت گردم ، بگرد این شش جهت را

ہوس را سر به بالینِ فنا نه :
نفس را از دل آتش زیرِ پا نه

دل از تابِ بلا بگداز و خون کن
ز دانش کار نکشاید ، جنون کن

شرر آسا ، فنا آماده برخیز
بیفشان دامن و آزاده برخیز

ز الادم زن و تسلیمِ لا شو
بگو الله و برقِ ماسوا شو

''چراغِ دیر''

غالبِ افسرده دل و جان ، بیا
بے سرو پا در صفِ رندان بیا

بے خبران را خبرے باز دہ
زان مےِ دیرین قدرے باز دہ

آن اثرِ پردۂ سازت چہ شد؟
زمزمۂ خارا گدازت چہ شد؟

آن از جنون پردہ کشاییت کو؟
ولولۂ سلسلہ خاییت کو؟

تاے پِ نیرنگ و فن آفتادہ ای
از نظرِ خویشتن آفتادہ ای

در ہوسِ جاہ فرو رفتہ ای
حیف کہ در چاہ فرو رفتہ ای!

بندۂ زر بودن از اہرمنی ست
مردِ خدا، این چہ خدا دشمنی ست؟

آہ از دنیا طلبی ہاے تو!
وین ہمہ ابرام و تقاضاے تو!

ہرچہ کنون می رسدم در نظر
شاہد و شعر است، و شراب و شکر

آن ز جنون برق بہ خرمن زدن
وین بہ خمِ دامِ ہوس تن زدن!

پیرویِ وہم مکن زینہار
سر ز گریبانِ حقیقت برآر

خیز و چو منصور نوائے بزن
ہستیِ خود را سرِ پائے بزن

ساقیِ ہمت کہ صلا می دہد
بادہ ز خم خانۂ لا می دہد

ہمت اگر بال کشای کند
صعوہ تواند کہ ہمای کند

نیرِ توفیق اگر بر دمد
لالہ عجب نیست کز اخگر دمد

ہمتِ ما نیز شہودِ حق است
ہر چہ بسنجم ، وجودِ حق است

ہمتِ ما غیرتِ حق است و بس
کثرتِ ما وحدتِ حق است و بس
''رنگ و بو''

مثنوی ''بادِ مخالف'' سے، مہر صاحب کے بقول، میرزا صاحب کا مقصد یہ تھا کہ یہ ہنگامہ مخالفت ، جو بالکل بے بنیاد تھا ، ختم ہو جائے ۔ دوسرے ، فارسی میں جن اصولِ استناد پر میرزا کاربند

تھے ، وہ واضح ہو جائیں - تیسرے ، سب پر آشکار ہو جائے کہ میرزا مقدمے کی پیروی کے لیے کلکتے آئے تھے ، ان کا مقصد ہنگامہ آرای نہ تھا -'

یہ مقصد نہ مثنوی کے مطالب پر پوری طرح حاوی ہیں ، نہ میرزا صاحب کے مزاج سے پوری مطابقت رکھتے ہیں - جس کا ایک پہلو یہ بھی تھا :

ہر فتنہ در نشاط و سماع آورد مرا

مثنوی کے بعض اشعار میں ان کی 'شوخ چشمی' اور 'خیرہ سری' صاف جھلک رہی ہے - ہمارا موجودہ سروکار صرف ان چند اشعار سے ہے جن کا تعلق ان مقاصد کی بجاے ، جن کی صراحت مہر صاحب نے کی ہے ، ایک اور ہی معاملے سے معلوم ہوتا ہے - یہ معاملہ ہے تحریک جد و جہاد سے ان کی گریز پای اور اس لے دے کا جو اس سلسلے میں ان پر کی گیی، اور ملامت کا جو انھوں نے اپنے آپ پر کی - ان اشعار کے مخاطب کلکتے کے 'تماشایانِ بزمِ سخن' اور 'شکر فانِ عالمِ انصاف' ہی نہیں ، بلکہ کچھ اور لوگ بھی ہیں ، جن کی صفات یہ بیان کی گیی ہیں :

نغر دریا کشانِ عربدہ جو

دادِ غم خواریِ جہان دادہ

ہر یکے پیش تازِ قافلہ اے
ہر یکے ناخدائے مرحلہ اے

یہ وہ برگزیدہ 'گروہ' ہے جو ہاتھ دھوکے اُن کی جان کے پیچھے پڑا - یہی وہ 'مجمع' ہے جس سے ان کا نفس پوری طرح میل نہ کھاسکا، اور جو ان کی شاعرانہ ارادت مندی کو خاطر میں نہ لایا - اس ناموافقت کی چوٹ رہ رہ کر ان کے ضمیر کو چھیڑتی رہی:

از چہ بود آن بہ عرصہ دم نہ زدن؟
در رہِ آگہی قدم نہ زدن؟

خجلت آوردم و جنون کردم:
خویشتن آب و دیدہ خون کردم

آب گردیدم و چکیدم من[1]
قطرہ آسا، بہ سر دویدم من

---

1 ایک اور مثنوی، جسے مہر صاحب نے 'کلمات ِ طیبات' کے نام سے، دوسری مثنویوں کے ساتھ شامل کیا ہے، ان اشعار سے شروع ہوتی ہے:

ہلہ، ہاں، اے دقیقہ اندیشان!
حق پرستان و معدلت کیشان!

تر زبانانِ وصفِ جد و جہاد!
راز دانانِ دین و دانش و داد!

داغ گشتم ازان ملامت ہا
سوختم از تفِ ندامت ہا

از غمِ دل ستوہ گردیدم
چہرہ با یک گروہ گردیدم

نفسِ من بہ مجمع در نہ گرفت
کس نیازم بہ ہیچ بر نہ گرفت

ظہوری، حزیں، بیدل سے غالب کی ہم مزاجی اور استفادہ

ظہوری :

غالب نے اپنی نظم و نثر میں کسی 'سخن گسترِ پیشیں' کا ذکر اتنے تحسینی انداز میں نہیں کیا جتنا کہ ظہوری کا :

'میں جانتا ہوں مشتری اور عطارد نے مل کر ایک صورت پکڑی تھی - اس کا اسم نورالدین اور تخلص ظہوری تھا -'
'اللہ ! فرماتا ہے :

مروت کرد شب ہا برتو سیرِ بام و در لازم :
نہ می باشد چراغے خانہ ہاے بے نوایان را

. . . . مروت کا لفظ وجدانی ہے - سوائے اس لفظ کے کوی لفظ یہاں کام نہیں آتا - اگر فقط ناموسِ رعایا ہے تو مروت ہے ، اور اگر مفلسوں کی کاربرآری ہے تو مروت ہے - قالبِ معنی کی جان ہے ظہوری ، ناطقہ کی سرفرازی کا نشان ہے ظہوری -'

بہ نظم و نثرِ مولانا ظہوری زندہ ام ، غالب !
رگِ جان کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را

ما را مدد ز فیضِ ظہوری ست در سخن

بیاید ہم ز من انچہ از ظہوری یافتم ، غالب !

غالب ، از اوراقِ ما نقشِ ظہوری دمید

غالب از ما شیوۂ نطقِ ظہوری زندہ گشت

اس بظاہر پر غلو تاثر پر غالب کے مفسر اور ناقد حیرت کا اظہار کرتے رہے ہیں[۱] ، مگر اس کا سبب دریافت کرنے کی کوشش میرے علم میں آج تک نہیں کی گیی - اس کی ایک ہی صورت ہے ، اور وہ یہ کہ دونوں کے کلام کو ٹٹول کر اس میں سے ان کے مزاج کے مخصوص ترکیبی اجزا برآمد کیے جائیں ، اور پھر دیکھا جائے کہ وہ آپس میں کتنے ملتے جلتے ہیں - ظہوری کے کلام سے جو مخصوص نفسی اجزا اخذ ہوے ، ان میں سے کچھ یہ ہیں :

'عشقِ خود' : 'لذتِ درد' : 'ذوقِ بیداد'

'نہادِ عجمی' کی یہ خصوصیتیں دونوں شاعروں میں مشترک ہیں ، اور اپنے پیش رو سے غالب کی اثر پذیری میں ان کا بھی نمایاں دخل ہے -

---

۱ 'اکثر اس عشق پر حیرت ہوتی ہے جو غالب کو مولانا ظہوری اور مرزا بیدل سے تھا -'

ن - م - راشد

ظہوری نے ایسے 'کنایہ' عشق' چھوڑے ہیں[1] ، جن کی مدد سے غالب نے بھانپ لیا کہ

'ظہوری کا ممدوح و معشوق ایک ہے'

(مہر : ''خطوطِ غالب" ، ۵۰۲)

جن اشاروں سے یہ رازِ سربستہ کھلا ہوگا ، ان میں سے کچھ یہ معلوم ہوتے ہیں :

لذتِ مہر و محبت ز ظہوری پرسید :
پرتوِ مہر بہ آغوشِ سہا می آید

دلِ بے تاب آب و تاب گرفت :
ذرہ خود را در آفتاب گرفت

دلم بہ جوشِ ہوس ہاے خام می افتد :
فشاندہ دانہ ، کہ عنقا بہ دام می افتد

خوش فراخ است ، ظہوری ، بغلِ ہمتِ عشق!

امید وار چنانم ، کہ فرقِ عقل و جنون
بہ تاجِ شعلہ' داغِ تو سرفراز کنم

---

[1] از صریح کنایت رسا تر افتاد است
ظہوری

قادر انداز نیازم کردہ است
مغز دل با مغز پیکان اختلاط

رفتم کہ وا کنم گرہ تار و پود خویش
مہر ترا مگر بہ رگ و ریشہ در کشم

غالب کا ممدوح و محبوب بھی ایک ہی ہے :

مرا بس است ز خوبان روزگار یکے

ابراہیم عادل شاہ اور شاہ اسماعیل کی ذات و صفات میں تو زمین آسمان کا بل ہے ، مگر ان کے تصور سے بعض جذبات جو ان عاشقان مجازی نے اپنے میں برانگیختہ کیے ہیں ، ان میں چنداں تفاوت نہیں ۔

ظہوری نے ابراہیم عادل شاہ کے افتاد طبع اور معمولات زندگی کی عکاسی کی ہے :

نظر وقف است بر رویش : خوشا صاحب نظر گشتن !

ز دیدن ہائے پنہانی بہ اظہارم

آشکرا راز پنہان را نشان آوردہ ام

شدم غواصِ نیسانِ دلِ شب

یعنی ، عادل شاہ کے شبستانی اشغال کی پردہ دری کی گئی ہے ، اسی لیے دھڑکا ہے کہ کہیں کوی 'زبان دان' 'ترجمانِ فکر' ان کے 'زیرِ لب' ' طرزِ ایما و رمز' کی 'زیر خوانی' نہ کرلے :

از ہم نفسان بر نفسم لرزہ افتاد است

تا چند توان برد با عسسے چند ؟

اگرچہ

داستانِ حرف سازان مبہم است

اور

سدِ معنی بہ راہِ تو بستم

مگر

راز بر اہلِ راز مبہم نیست

چنانچہ

از اربابِ نظر می ترسم

اس کے ساتھ ہی ظہوری نے ، غالب کی طرح ، یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ :

نقاب از روے حالِ خود کشیدیم

لب و لہجے کا چٹخارا بھی کہتا ہے کہ ملا صاحب کی 'ترجمانی' میں خارجی مشاہدے اور داخلی روداد دونوں ہم آمیز ہیں :

ہرچہ می گویم ، ظہوری ، کردہ ام :
کردنِ من پیش کارِ گفتنم

در محبت انچہ می گوییم ، اول می کنیم :
پارۂ بیش است از گفتارِ ما کردارِ ما

غالب نے یہ آخری مصرع لیا تو اس میں ''اخلاقِ ظہوری'' کی ایک تلقین کا جو پہلو ہے ، اس کے علاوہ ، ان کے ذہن میں 'در محبت' والا مفہوم بھی ضرور ہوگا ۔

'عشقِ خود':

ابراہیم عادل شاہ کی سیرت کشی میں ظہوری کی توجہ اس کے 'گرم عشقِ خود' ہونے پر خصوصاً مرکوز رہی ہے :

خود برائے خود قرین گردید ابراہیم شاہ

بہ خود نازد : محبت دست گاہ است

خود بینی ، خود آرای اور خود نمای سے ظہوری کو خود

بھی ، غالب کی طرح[1] ، خاص تعلقِ خاطر معلوم ہوتا ہے ۔ اس کا وافر ثبوت ان ترکیبوں میں موجود ہے جو انھوں نے 'خود' 'خویش' کے ساتھ ترکیب دی ہیں :

سراپا جان شدم : جانانِ خویشم

تار و پودِ خویش را می خواہم بہ وصل

بہ عشقِ خود میان می بندم

لمعانِ وصالِ خویشتن : مےِ خم خانۂ محبتِ خود : ساقی و ساغرِ شرابِ خود : خم خانہ با پر از سبوے خویشتن : پروانۂ خود : دل ز رگ ہاے خویش زنجیر : بہ دردِ خویش ہم آغوش : در حقِ خود ادائے دارم : بوسہ کاریِ لب ہاے خود : خود بازی: گم شدن در خود : عکسِ خویش : نظارۂ خویش : منصبِ سر حلقگیِ خویش[2] :

---

[1] اس کے باوجود کہ :

'در مشربِ حریفان منع است خود نمای'
'طبایع بالذات مفتونِ خود نمای است'

غالب

[2] فکر و جذب کی ایک دوسری سطح پر ، ان میں کچھ ترکیبیں اقبال کے مسلکِ خودی کے بعض داخلی مضمرات پر بھی منطبق ہوتی ہیں ۔

ظہوری نے بھی اپنے معکوس مزاج محبوب کو وہی مشورہ دیا ہے جو شیکسپیر کے بعض ابتدای سونیٹ اس کے عالی نسب 'در خود گم'[۱] دوست کو دیتے ہیں :

انصاف نیست این ہمہ بودن براے خویش

شد رخصتِ اختلاط حاصل : از خویش ، ظہوری ، اجتناب!

ظہوری نے خود کو اپنی 'رسوای' اور 'خرابی' کے درپے ظاہر کیا ہے :

خواستم رند و ملامت کش و رسوا باشم[۲]

سعی ہا کردم کہ شد جانم خراب

خراب تانہ کنم خویش را ، قرار نہ دارم

آباد آن کہ ساختہ عشقت خرابِ خویش!

خویش را کردم خراب آخر ز بس ابرامِ خویش

---

[۱] خود گم ہے وہ بت عاشقِ خود گم سے زیادہ
آتش

[۲] غالب ، ز عزیزانِ وطن بودہ ام ، اما
آوارگی از فردِ حسابم بدر آورد

'ابرام' کا لفظ غمازی کرتا ہے کہ خرابی اور خواری کے اس تصور میں ظہوری نے خود کو اپنے محبوب ابراہیم کے ساتھ مخلوط کر لیا ہے ، اور اپنے 'چنگ ِ ملامت' کے 'پردہ ہائے ساز' میں دونوں کی 'پنہانی و واژونی' کا بھانڈا پھوڑا ہے :

چرا زین بیش تر رسوا نہ گردم ؟ ترجمان دارم
سر کرد رسوای مگر از پردہ ہائے راز ِ ما
چنگ ِ ملامت ساز شد از طالع ِ ناساز ِ ما

'لذت درد' :

تار ِ چنگ است رگم در بدن از زخمہ' درد
لبالب گشتہ بیرون و درون از راحت ِ درد
دوید لذت ِ دردم بہ ریشہ' دل و جان
دگر ، بہ نوش رود کام : رگ بہ نیش آمد
خوناب ِ درد موج بر آوردہ در جگر
بر زخم ِ دل نہ کردہ نمک مرہمی ہنوز
حبذا درد ، اگر بازی ِ درمان نہ خورد!

ـــ خوشا زخم ، اگر دست خوشِ مرہم نیست!

'راحت آزار' :

بہ ریشِ سینہ راحت می تراود

سینۂ ریشِ مرا آسایشِ آزار است

بہ صد بہانے برابر نہ می کنم دل را :
کبوترے ست کہ در چنگِ باز می بالد!

می برد ا نسیمِ راحت مایۂ آزارِ عشق

باز برخوردار دل از راحتِ آزارِ عشق

یہ راحت تابہ کے آسودگی در مغزِ دل باشد ؟
خراشِ سینہ ، و دردِ دلے ، و کاہشِ جانے!

از غمزۂ فصادِ تو ہر لحظہ بر رگ ہائے جان
آزار نیشے می زند : راحت رسانِ کیستی ؟

ظہوری را بروں آورد از آلایشِ مرہم
دل بیدن پسندِ من ، رگِ نشتر گزینِ من

از بلاے عافیت و رنجِ راحت فارغم

زخم از مرہم ہراسان ، درد بیزار از دواست

پہلوے دل ریش شد بر بسترِ آسودگی

'ذوق بیداد' :

بہ ذوقِ جور ہاے آشکارا من گرفتارم

از تو جز بیداد و کین مطلوب نیست
کہ مارا خاطرِ آزار چین است

بہ طوبی قامتے نازم ، کہ آبِ تیغِ بیدادش
دواند در رگ و پے ریشۂ نخلِ محبت را

فولادِ تیغِ عشق ز کانِ مروت است

دمِ تیغ ستمش مرہمِ زخمِ جگر است

آخر جگرِ فگارم آسود :
تیغِ ستمش بہ خونم آلود

'زخم پرستی' :

اے خوشا زخمے ، کہ جز زخمِ دگر مرہم نہ داشت!

در آرزوے زخمِ تو از بس کہ می طپم!

برتشنگانِ زخمِ خدنگِ جفا بیار :
تا چند آبِ حسرتِ پیکان فرو برم ؟

در رزم گہِ غمزہ ات آسودہ خاطرم
از فکرِ این کہ زخمِ دگر در سنان نہ ماند

میانِ زخم پرستان ز مہرِ خویش نہ لافم
اگر جگر نہ کند مرہمی ز خنجرِ کینش

'راحتِ داغ' :

زہے آسودگی : کردم بہ داغش سینہ آرای !

ریشہ داد است در رگ و پے راحتِ داغ

'جذبۂ لذتِ غم' :

گلِ غم در ریاضِ خاطرم صد رنگ می روید

مرہم ز داغِ تازہ بہ زخمِ جگر نہم

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
غالب

صافِ عشرت چون نہ باشد ناگوار ؟
دردے از خم خانۂ غم خوردہ ایم

در جذبۂ غم عیش ضرور است ، ظہوری !

در آغوشِ غمِ پنہانِ خویشم :
خوشا عشرت ! نگارستانِ خویشم

ز ہے لذت ! شدم از چاشنی گیرانِ شہدِ غم

'خشمِ ناز' :

زہرِ قہرِ نگاہ . . . . . آرزو **بخش**

دوش گفتی کہ 'ظہوری ، ز تو در قہرم' :
معنیِ لطف ازین لفظ برون می آید

بہ زہرِ چشم قہرش دادہ آبِ نوکِ مژدن را :
ظہوری چون نہ باشد محوِ لذت؟ نیش نوش آورد

مرہمِ لطف ، ظہوری ، ست ضرور :
زخم ز شمشیرِ **غضب** می طلب

خویش را بردمِ شمشیرِ غضب اندازد

ہوس دارم کہ دل نخچیرِ شیرِ خشم گین باشد

خوشا دلے کہ زند جوش ز آتشِ خویت !

ان نفسی اور جنسی خصوصیتوں سے قطع نظر ، ظہوری کے کلام میں کئی اور پہلو بھی ہیں جو غالب سے بہت ملتے جلتے ہیں - سبھی تو یہ دونوں کی اپنی اپنی واردات پر ہی ہیں ، مگر ان کے اظہار میں غالب نے ، واردات کی ہم رنگی کی رعایت سے ، اپنے پیش رو کے بنے بنائے سانچوں سے بھی کام لیا ہے - ظہوری نے اپنے بارے میں کہا ہے :

خوشہ چینم ، گرچہ صاحب خرمنم

ان کے اس پہلو سے تو ہمیں سروکار نہیں ، مگر غالب کے بارے میں یہ بات یقیناً کہی جا سکتی ہے - ظہوری سے ان کا معنوی رشتہ وہ تو نہیں جس کے باب میں ، خود ان کے الفاظ میں ، یہ کہا جا سکے کہ

شکوہِ صاحبِ خرمن ز خوشہ چین پیدا ست

البتہ انصاف چاہتا ہے کہ ان کی ظہوری سے فیض یابی پر پردہ

ڈالنے کی بجائے اس کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے - اس اثر پذیری کا باخبر اندازہ لگانے میں اس منتخب کلام سے مدد ملے گی جو ہم نے الگ الگ شقوں میں تقسیم کر دیا ہے - پہلی شق میں غالب کے کچھ اشعار ظہوری کے کم و بیش ہم لفظ و ہم معنی اشعار کے پہلو بہ پہلو رکھے گیے ہیں جو صریحاً خوشہ چینی کے زمرے میں آتے ہیں - دوسری شق میں چند مختلف عنوانوں کے تحت ظہوری کا کچھ ایسا کلام درج ہے جو غالب کے فکر یا جذبے سے مشابہت یا مناسبت رکھتا ہے -

غالب کے لیے ظہوری کی کشش میں ان کے کلام کا وہ عنصر بھی شامل ہے جس میں اپنے عہد کی کسی سرگرم عمل شخصیت سے، جو ابھی تحقیق طلب ہے، ملا صاحب کی تعلق اور بے تعلقی کی وہی ملی جلی روش ٹپکتی ہے جو غالب اپنے عہد کی تحریک جد و جہاد سے رکھتے تھے - اس موضوع پر ظہوری کا کچھ کلام ایک جگہ کر دیا گیا ہے تاکہ اس کا موازنہ غالب کے مماثل کلام سے کیا جا سکے - آخر میں ان مضامین پر دونوں شاعروں کی کچھ ہم آہنگ ترکیبیں دے دی ہیں -

ظہوری سے غالب کی خوشہ چینی

نہ داری ہمرا‌ہے از کفرِ عشق ، اے دل! مسلمان شو

ظہوری

کفر نہ توانی شد : ناچار مسلمان شو

غالب

پایۂ دیگر است وعظِ مرا :
منبر از چوبِ دارِ منصور است

ظہوری

آن راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است
بردار توان گفت : بہ منبر نہ توان گفت

غالب

کدام ذرہ کہ خورشید نیست در بر ؟
کدام قطرہ ، کہ در پوست مغزِ دریا نیست؟

ظہوری

ذرہ صحرا دست کہ و قطرہ دریا آشنا

غالب

بررہِ باد چراغم شود افروختہ تر :
می شود مشعل ، اگر بردمِ طوفان اُفتد
آتش بلند کردہ ظہوری بہ بادِ آہ :
روشن دلان چراغ بہ طوفان سپردہ اند

ظہوری

چراغِ روشن اپنا صرصرِ طوفاں کا مرجاں ہے

غالب

نازم بہ تازہ رویِ پژمردہ خاطران :
سرسبزیِ بہارِ جہان از خزانِ ما

ظہوری

شکستِ رنگِ تو از عشق : خوش تماشائے ست!

بہارِ دہرِ دہر بہ رنگینیِ خزانِ تو نیست

شادیم بہ گلخن، کہ خزان است، و خزان نیست

غالب

رو بہ پشتِ احترام آوردہ ام :
ثبوتِ عشق ، ظہوری ، بہ نقبِ آداب است

ظہوری

قوی فتادہ چو نسبت . ادب مجو ، غالب !
نہ دیدہای کہ سوئے قبلہ پشتِ محراب است ؟
پیٹھ محراب کی کعبے کی طرف رہتی ہے :
محوِ نسبت ہیں ، تکلف ہمیں منظور نہیں

غالب

خیرہ چشمان دیدہ ام: این تیزیِ مژگان کجاست؟
نیش در رگ می رود : اینک رگم در نیش رفت

ظہوری

بتاو ، اس مژہ کو دیکھ کر ، کہ دل کو قرار
وہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو، تو کیونکہ ہو ؟

غالب

ازان ترسم کہ طوقِ گردنم گردد رگِ گردن
بازوے تو طوقِ د گرم کرد بہ گردن

ظہوری

خمِ دستِ نوازش ہوگیا ہے طوق گردن میں

غالب

نہ پاے پیش رفتن دارد، ونے روے برگشتن

ظہوری

نہ بھاگا جاے ہے مجھ سے. نہ ٹھہرا جاے ہے مجھ سے

غالب

تیغ از ننگ راند است ، و بہان خونیِ ماست :
خونِ ناکشتہ اے در گردنِ قاتل ماند است
خوش آشکار تیغِ تغافل زدی ، و ماند
در گردنِ نگہِ تو صد خون بہاے ما

ظہوری

نہ مارا جان کر بے جرم : غافل، تیری گردن پر
رہا ، مانندِ خونِ بے گناہ ، حق آشنای کا

غالب

در آرزوے ز لالِ تیغ
دل کبنِ گل ہاے خود روست
گل ہاے زخم لالۂ صحراے زندگی ست

سرخ رویانِ ترا رعنائے در خاطر است
از دمِ تیغت گلِ زخمے مگر برسر زنند
ظہوری

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں، کہ ہے
پر گل ، خیالِ زخم سے ، دامن نگاہ کا
غالب

می شود تیز نظر مرد بہ نظارۂ تیغ
ظہوری

عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا
غالب

ہلاکِ بختِ آن فرخ شکارم ؛ کافرین خواہد
صدائے استخوانش بردمِ ساطورِ قصابش
ظہوری

بساطے نیست بزمِ عشرتِ قربانیِ مارا
مگر بافند از تارِ دمِ ساطورِ قصابش
غالب

ہلاکِ تلخیِ شیرینی ام ، زہے لذت !
کہ شہدِ خندہ بہ زہرِ نگہ برآمیزد
ظہوری

چشمۂ نوش است از زہرِ عتابت کامِ جان
غالب

ماہی طبیعتیم ، و سمندر مزاج ہم
ظہوری

ماہی ارجوی ، سمندر یابی از دریائے من
غالب

'فقر و فنا' :

از گدایانِ توام در کوچهٔ فقر و فنا

ز اهلِ جد و جهد می توانم خواند

این گرمیے کہ خضر بہ آن جوش می زند
از شعلهٔ فنا بہ زلالِ بقا رسید

فنا را در سرِ کوے فنا در تربیت دارم :
بہ یمنِ عشق نابودِ من آخر بود می گردد

خضرِ توفیق است رہ بر در بیابانِ سلوک
می زنم راہِ فنا : شاید بقاے برخورد

بے فنا ، نتوان ، ظہوری، بہرہ ور گشت از بقا :
کو چنان مرگے، کہ منت با نہد برجانِ ما ؟

فتادہ راہ ظہوری بہ تفتہ دشت طلب
خوش آن کہ جا بہ لبِ چشمهٔ فنا گیرم !

شدہ سوارانِ تفتہ دشتِ طلب
گرمیِ برق در عنان چیدند

سپرِ تیغِ کینِ محبتِ اوست

خونابِ کشتگانِ تو اکسیرِ زندگی ست

ز خاک و خونِ قربان‌گاہِ عشقت عید می جوشد

شہیدِ عشقِ تو برخود جہان جہان بالد

خدنگِ تو ہم رشتہ اے ، ہم سوزن است

خامی :

می خواست تفِ آتشے از شعلۂ خویت
ترسیم کہ خاکسترِ ما خام بر آید

ز خیلِ گرم روان نیست : جستجو خام است

جگر جوشے نہ زد : ناپختہ ماندیم

قوتِ عمل کا فقدان :

فصلِ بہار است ، و جنونِ خانگی :
سر نہ نہادیم بہ صحرا ، چہ حظ ؟

گل ز فرقِ تو ، ظهوری ، نه دمد
که ترا خارِ رهش در پا نیست

دلِ پیکان طلب رنجید از من :
تلاشے بر بر سرِ تیرے نه کردم

نه شد عکسِ فنا صورتِ کار

پرواز به بالِ مستعار :

ذره می پرد به بالِ آفتاب

بالِ خود را در قفس از رشتهٔ آواز بست

برقے ز شعله آرم ، و در بال و پر کشم
خوش شعله ہا به بالِ کبوتر فرو کنم !

مے و ساقی :

ز عکسِ خویش ساقی کرده خوش لبریز ساغر را :
بجائے قطره ہائے مے ، مه و خورشید می بارد

---

[1] برق از نوردِ بالِ کبوتر بر آورم
غالب

ساقیِ خونین دلان خوش بادہ اے در جام ریخت!

ساقی چہ گرم بادہ بہ گردش فگندہ است!

ساقی ، ز نگہ ہاے تو بر شعلہ نشستیم

'تہ جرعہ' :

بہ تہ جرعہ مست ازند دریا کشان :
چہ خم خانہ ہا در سبوے تو ہست!

مستِ تہ جرعۂ این طایفہ ہشیار انند

مستی از حسرتِ تہ جرعۂ او مخمور است

'شعلہ' :

این گرمیے کہ خضر بہ آن جوش می زند
از شعلۂ فنا بہ زلالِ بقا رسید

کہ صد خورشید ازان رخسارِ آتش رنگ می روید

رخسارِ شعلہ خیزِ تو میدانِ آتش است

آتشے پر شعلہ اے بر سینہ اے افسردہ ریخت

خوشا دلے کہ زند جوش ز آتشِ خویت !

محرومی :

دل نہ شد سیراب یک بار از ز لالِ شعلہ اے

از ہر چہ اثر وا کنی ، آن نہ دلیل است :
سرمایہ ٔ این قافلہ جز بانگِ درا نیست

وا ماندہ اے عجزیم ز افسونِ تعلق :
گر دل نہ کشد رشتہ ، نفس آبلہ پا نیست

جدوجہاد کے باب میں بحث :

ساقی چہ گرم بادہ بہ گردش فگندہ است
در بزمِ بحث شعلہ ٔ جوالہ می رود

کے تو اند کہ سرِ بحث کشاید باعشق؟
علم را پائے بہ گل و لائے دلایل ماند است

مقابلِ تو کند بحث ماہِ ماہ پرست
حیا کجاست ؟ چہ نادر مقابل افتاد ست!

مولوی فضل حق نے تحریکِ جدوجہاد کو ایک گمراہ کن سراب قرار دیا - اس کا جواب غالب نے بھی وہی دیا ہے جو سراب سے دھوکا کھانے کے حق میں ظہوری نے ان شعروں میں دیا ہے :

شوم ہلاک ، ظہوری ، فریبِ وعدۂ وصلے
کہ تشنہ را بہ نظر جلوۂ سراب دہد !

داد از تشنگی و سیرابی :
گشتہ ام غرق در محیط سراب !

ظہوری کے دو شعر ہیں :

آشنای ہا ترا افگند در بیگانگی :
چند بکشای بغل باآشتی؟ در جنگِ باش

مخور فریب ، کہ چرخ آشتی نہ می داند :
پر از ترانۂ جنگ است چنگِ ناہیدش

ایسا گمان ہوتا ہے نہ کسی ملتی جلتی صورتِ حال میں ، جس کا مجھے علم نہیں ، ظہوری نے بھی ان اشعار میں صلح کے فریب میں نہ آنے اور جنگ جاری رکھنے کا وہی مشورہ دیا ہے جو سید احمد شہید نے امیر خاں کو دیا تھا -

غالب اور ہم عصر شاعروں نے مولوی فضلِ حق کی جدوجہاد کی مخالفت کو ان کی مصلحت آمیز دوراندیشی پر محمول کیا ہے، اور اس پر نکتہ چینی بھی کی ہے، اور ایک حد تک اس کا جواز بھی تسلیم کیا ہے۔ ظہوری کا ایک شعر ایسا ہے جس میں ان کے مخالفانہ رویے کی 'تاویل' نکلتی ہے:

مصلحت گیہے بہ کارِ عشق می دارد سرے:
عقل گر بحثِ شکستن کرد، بے تاویل نیست

ظہوری کی کچھ ایسی ترکیبیں جن کا مبحث 'فقر و فنا' اور جد و جہد معلوم ہوتا ہے :

کوچۂ فقر و فنا : باطنِ فنا : شعلۂ فنا : بیابانِ فنا : پستیِ ہراسِ فنا : اوجِ بقا : زلالِ بقا : احیائے مردن : رزم گاہِ عشق : ابلِ جدوجہد : شہ سوارانِ تفتہ دشتِ طلب : خیلِ گرم رواں : اعجازِ شوق : تیز شوقان : تعدیِ شوق : میدانِ آتش : آتشِ امید : آتشِ حسرت

ایسی ترکیبیں جن کا مرجع سید احمد شہید یا شاہ اسماعیل شہید کی سی کوئی پر سحر فعال شخصیت ہو سکتی ہے :

طنطنۂ گدا : عقابِ عشق : شاہینِ نگاہ : شعلہ ہائے نگاہ : زنجیرِ نگاہ : مخزنِ بصارتِ دل

آتشِ حسن : حسنِ شعلہ خو : روئے آتشیں : رخسارِ آتش رنگ : مرحمتِ شعلہ خو : چشمۂ شعلہ : زلالِ شعلہ : شعلۂ شوق : نکہتِ شعلۂ عتاب : شعلۂ جوالہ : شعلۂ حسرت : شعلۂ داغِ جگر تاب :

لالۂ صحرا : لالۂ دشتِ غم

ایسی ترکیبیں جن میں اس قسم کی فکری آویزش کا پہلو نکلتا ہے جو شاہ اسماعیل اور مولوی فضلِ حق کے درمیان تحریکِ جدوجہاد کے ضمن میں پیدا ہوئی :

معرکۂ خیال ملتِ عشق : دینِ دل : حدیثِ دل کنجشکِ دل مذہبِ عقل : کیشِ عقل : زندانِ عقل : فتوائے عقل : خزانِ عقل : بلائے عافیتِ عقل :

سلامت طلبی : سلامتِ صبر و سکون :

نسبِ جنون : عافیتِ جنون

ظہوری کی ایک مخصوص ترکیب جو غالب نے بھی بار بار برتی ہے :

یک جہان سحر : یک جہان دلِ بے تاب :

یک جہان حسرت : یک جہان داغِ آرزو :

جہان جہان دل و جان نیشتر :

آفتِ یک شہرِ جان و دل :

صد بیابان تشنگی

ظہوری کی کچھ ترکیبیں جو غالب کے شعری مزاج اور نفسی افتاد سے مناسبت رکھتی ہیں :

نفس :

تشخیصِ نفس : مصافِ نفس : تہدیدِ نفس

خود :

تار و پودِ خویش : احتسابِ خود : عیارِ نفس و قلبِ خود : با خویش در جہاد

ذوق :

ذوقِ تخیل : ذوقِ نظر بازی : ذوقِ بیداد : ذوقِ داغ کاری : ذوقِ نامرادی

غم :

جانِ غم سرشت : جذبۂ لذتِ غم : نشاطِ غم کشاں : مستیِ جامِ غم : تازہ رویانِ غم

داغ :

شعلۂ داغِ جگر تاب : لذتِ داغ : راحتِ داغ : سینۂ داغ آلود : داغِ جگر سوز : شعلۂ داغِ ندامت

درد :

دردِ آرزو مندی : تشنۂ درد : کسبِ درد : دردِ بے دوا :

قانونِ درد : چنگِ درد : لذتِ درد : بہارِ درد : سودائے درد : خون نابِ درد : مایۂ درد : دردِ بے دردی

حسرت و آرزو :

رہینِ کاوشِ خواہش : زندانیانِ آرزو : برقِ حسرت : پامالِ آرزو

گل :

گل ہائے رسوای : گل ہائے پشیمانی : گلِ زخم : گلِ غم : گلِ حرماں : گلِ سوفار

کیش و مشرب :

برون ز مذہب و کیش است کیش و مذہبِ ما

ہزار دیر و حرم در خفائے مشربِ ما

جامِ عرفان ہر سے مشرب زدیم :

مست گشتیم ، و درِ مذہب زدیم

ز دین و کفر ظہوری فراغتے دارد

خارِ خارِ کعبہ و بت خانہ چند ؟
کاوِ کاوِ شیخ و رہبان کردہ ایم

برائے غیرتِ تقوی ، ظہوری ، مےنہان خوردم :
گوارا باد ، از رندانِ زاہد مشربے دارم

بہ بت خانہ خوانند ناموسِ کفرم :
چرا در حرم ننگِ اسلام گردم ؟

بہ مشربِ دگران گر تفاوتے باشد
میانِ صافی و دردی بہ مشربِ مانیست

صاف نہ شد مشربم ، تا نہ فتادم بہ درد

حریفِ جامِ حریفانِ نیم عیش نیم :
خرابِ لائے کشانم ، کہ مستِ سر جوش اند

باش از رندانِ عارف ، خدمتِ مے خانہ کن

قوتِ عشق :

خوش قوی پنجہ است بازوے عشق

عشق اگر دل دہد کبوتر را
جگر از سینۂ عقاب کشد

بسانِ چغد ، درین کہنہ جا چہ جا گیرم ؟
بہ بالِ عشق پرم : خویش را ہما گیرم

عشق کی عقل پر فوقیت :

کرد است عشق چارۂ عقل و علاجِ نفس

بر کیشِ عقل باش ، کہ صعب است دینِ دل

دارد بہ یمنِ عشق ظہوری متانتے :
خود را خلاص کردہ ز عقل و تزلزلش

عاقلان جزو کشِ مبحثِ جہل اند : بلے
عقل در مدرسۂ عشق کتابے نہ کشید

کے تواند کہ سرِ بحث کشاید با عشق ؟
علم را پاے بہ گل و لاے دلایل ماند است

'بلائے عقل' :

(تعریض ؟)

با عافیتِ جنون ظہوری
فارغ ز بلاے عقل و ہوش است

بلاے عافیتِ عقل دور از ہمہ کس !

مشرب عشق کی کشادگی :

معماریِ عشق این چنین است :
گہ صومعہ و گہے کنشتم

در عشق لازم است مراعاتِ کفر و دین :
گہ دل بہ کعبہ ، گہ بہ صنم خانہ بردہ ایم

بہ فیضِ عشق نازم ، کہ می آید درین مذہب
ہم از زنار تسبیحے ، ہم از تسبیح زنارے

دارم از یمنِ عشقِ پر نیرنگ
دلِ یک رنگ و دردِ رنگا رنگ

اجتہاد :

جہدِ دیگر عاشقان در اجتہاد آوردہ اند

تقلید و تحقیق :

بردہ تحقیق ے پے بہ مذہبِ ما

جہل بہ ماتم نشست : شکر کہ تقلید مرد !

فرسودہ و نو :

فرسودگی ز جیبِ حیاتم کشید دست

کردہ جانِ کہنہ را تعمیر جانانِ نوی
بود خوش : فرسود شد : خواہم کنون جانِ نوی

سالکانِ راہ در فرسودگی افتادہ اند :
ہست راہِ کعبۂ ما را بیابانِ نوی

اعتقادِ کہنہ را ننہند قدرے آن قدر
در نثارِ عشقِ بت می باید ایمانِ نوی

از کہن آسودگان دیدم پریشانِ نوی

گشتہ داغم خون چکان : داغ است لعلِ آتشین:
در زمینِ سینہ پیدا شد بدخشانِ* نوی

رسم و رواج :

میزانِ راه و رسم نهادیم بر کران

آه ازین رسمے، کہ آن را رسم و قانون بستہ اند

رسم و قانون جماعتے دانند
کہ نہ دانند رسم و قانون را

بر کشم خنجر بہ دستِ عشق در کوے جنون
رسم را سر می برم : در دامنِ عادت نہم

'طنطنۂ گدا' :

از ظہوری شد بلند آوازۂ افتادگی :
در گدای حشمتم بین : شوکتِ سلطان کجاست ؟

'رتبۂ افتادگی' :

بہ تعریفِ بلندی ہاے پستان خطبۂ خوانم

سپہر در پے زانوے رشک بنشینند
فتادگان چو بہ تعظیمِ خویش بر خیزند

حضیضِ فرش و اوجِ عرش بر یک پایه می باشد

'طاقتِ بے طاقتان' :

می توان سر پنجهٔ قدرت به زورِ عجز تافت

کو غمے تا پاے منت برسرِ عشرت نهیم ؟
قوتے از ضعف در سر پنجهٔ قدرت نهیم

بهان غم دست می گیرد ، اگر روزے ز پا افتی:
تمناے غمِ مرد آزماے می توان کردن

مورم ، و مالیده ام در پنجه گیری شیر را

ز ذره دانه فشانند : آفتاب بر آید

کدام ذره که در جیب آفتاب نه دارد ؟

عام و خاص :

می زن به دلِ جمع ، ظهوری ، درِ نسبت

ز خاصانِ عالم ، اگر عام گردم

خرابی و تعمیر :

کشورِ ما روے معموری نہ داشت

خراب گشتہ ام از آرزوے تعمیرے

باز می رقصد جنون در حلقۂ زنجیرِ ما :
باز در کوے خرابی می کند تعمیرِ ما

'سکون و افلاس' :

می توان گفت کہ می آید از افلاک سکون
نہ توان گفت : ز افلاس سکون می آید

'محنت و راحت' :

یکے شد محنت و راحت : چنانِ من ، چنینِ من
در آمد غارتے از در : نہ آنِ من ، نہ اینِ من

'آہ'

رخشِ آہ و نالہ را اندازِ جولان گم شد است
درد و غم خواہند مرد ، و مردِ میدان گم شد است

صرصرِ آہ از دلِ شبِ غم
پردہ از چہرۂ سحر برداشت

'تبرو تیشہ'

زمینِ منفعت خیزِ جہانِ عشق را نازم
کہ نخلِ گلشنِ امید از آبِ تبر روید!

کوہ کن بود است از بس گرمِ کارِ خود : ہنوز
از شرارِ تیشہ اش در مغزِ خارا آتش است

'تغیر و انقلاب'

بہ مسلکِ عشق تغیرِ ہوائے می توان کردن

انگیخت شوق لشکر : از تست فتح ، اے دل!
در کوزۂ تخیل افتادہ انقلابے

غالب اپنے بعض خیالات اور جذبات تضاد نما پیرائے میں ادا کرتے ہیں :

عبادت برق کی کرتا ہوں، اور افسوس حاصل کا

شیرازۂ دو عالم سر رشتۂ فنا ہے

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

جوشِ بے کیفیتی ہے اضطراب آرا، اسد!

جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے!

ہم نہیں جلتے، نفس ہر چند شعلہ بار ہے

سرمہ گویا دودِ موجِ شعلۂ آواز ہے

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز ہے

جادۂ راہِ فنا . . . شیرازۂ اجزائے پریشاں

نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی

سرابِ آتش از افسردگی، چوں شمعِ تصویر، ام

چراغِ خانۂ دل سوزشِ داغِ تمنا ہے

دلِ پروانہ و تمکینِ سمندر دارم

کتانِ خویش می شویم بہ مہ تاب[1]

---

[1] یہ کیفیت بیدل پر بھی گزری ہے:

جوشِ خرامِ آینہ دارِ بہارِ اوست:
نظارہ کن ز چاکِ کتان ماہ تاب را

بیدل

جلوهٔ برقے در ابرِ دامنِ تر داشتم

صرفِ ز قومِ دوزخ است نامیہ در بہشتِ ما

چون آب ایستادہ ، و موجِ دمادمش :
وا ماندنم ز پویہ بہ جولان برابر است

دم دل آشوب ، وقدم آبلہ فرسا ماند

سوزم از حرمانِ مے ، با آن کہ آبم در سبوست

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اسلوب انھوں نے ظہوری ہی سے سیکھا ہے ، مگر اس میں شک نہیں کہ ظہوری نے بھی اپنے بعض مخلوط جذبات اسی پیرائے میں ادا کیے ہیں :

غصۂ فقر نہ خوردیم ، کہ افتادہ پسند
عیشِ شاہانہ : زہے طبعِ گدایانۂ ما !

در ہم شگفتہ غنچۂ دل از بہارِ غم

نازم بہ تازہ روی ِ افسردہ خاطران :
سرسبزی ِ بہارِ جہان از خزانِ ما

به موجِ شعله از دل جوش هاے خام می شویم

رامِ ساقی ، و وحشیِ خویشم
در کتانِ شکیب می جوشم

فزونیِ کمیِ کوه و کاه از من پرس
که طاقتِ سبک، و حسرتِ گران دارم

چه سنگین اضطرابے لنگر افگنداست در خاطر
شکیب و طاقتم کوه است ، اما کوهِ سیماب

به آبم برده عشقم کشتی ، و در خشک می رانم

کشتیے می کشیم در خشکی
دلِ دریا اگرچه ساحلِ ماست

هم نسخهٔ خرد شد ، وهم دفترِ جنون
چون ریخت از قلم رقمِ گفت وگوے دل

از مقیمانِ کعبهٔ وصلیم
گرچه زنارِ آرزو بستیم

گردِ شوقِ حرم سبک گامم :
نیست بردوش بارِ احرامم !

برسرِ کوچهٔ بے چارگی ، از قوتِ ضعف
مزدِ لب بائے خموشم ، کہ چہ غوغا کردم !

ز کوتہ دستیم ہمت بلند است

از بلائے عافیت در رنجِ راحت فارغم:
زخم از مرہم ہراسان: دردِ بیزار دواست

از ظہوری ست تشنگی سیراب :
کہ ، چومن ، آب از سراب خورد ؟

داد از تشنگی و سیرابی :
گشتہ ام غرق در محیطِ سراب !

ظہوری ، از زلالِ شعلہ حلقِ تشنہ تر گردد

ظہوری شدہ معمور ز ویرانیِ خویش

پر بردہ ایم دامنِ صبح از شبِ سیاہ

جز شکستن نہ بود رابطۂ پیوستن

ذوق در بالیدنِ کاہیدن است[1]

باز دردے ، کہ روح بخشِ دواست

صیقلِ صبح بہ آہنگیِ شامِ من است

سینہ ے پر توے داغے بہ صفاے نہ رسد

آویزشِ درون

ہر حلقۂ 'غازیان' ظہوری

ہمہ با خویش در جہاد است

ز خود می رنج ، و با خود صلح می کن

---

[1] شمع را بالیدن از کاہیدن است این جا :
گداز جوہرِ ہستی ست ، غالب ، آبیارِ ما

'احتسابِ خود' :

غالب اور دوسرے خود آگاہ شاعروں کی طرح'، ظہوری نے

' ان میں امیر خسرو بھی شامل ہیں ، جنھوں نے اپنے نفس کا مواخذہ یوں کیا ہے :

اندرین نامہ کہ گفتم کم و بیش
عذر خواہم ز فزون و کمِ خویش

نامہ ام بین سیہ از دودِ گنہ
روے ہم ، صفتِ نامہ ، سیہ

ہمہ عمر بہ زیان کاری رفت
دل نہ یک دم سوے بیداری رفت

روز تا شب نفسِ ہرزہ دراے
نہ ز خود شرم ، و نہ ترسم ز خداے

دمِ درویشی ، و آن دم ہمہ یاد :
ہیچ دل را دمِ این گونہ مباد !

نے از طاعتِ دین بیگانہ :
کعبہ بیرون ، و درون بت خانہ

خود گرفتم کہ سخن جادو ایست
ہر چہ حق نیست در آن ، جادو ایست

من بدین شیوۂ ہر ذوق و فن
دوزخ آرایم ، و فردوس شکن

من ہمانم کہ ز نفسِ منحوس
گشتہ ام زاغ ، کہ بودم طاوس

منقول از ''امیر خسرو'' دہلوی ، مؤلفہ' پروفیسر ممتاز حسین

بھی اپنے پیچیدہ نفس کا بہ غور معاینہ اور محاسبہ کیا ہے :

برخیز بہ سیرِ خود ، ظہوری!

سیرِ خود می کنم بہرِ تماشاے جہان

دامنے بر عیب ہا گسترده ایم
باوجودِ آن کہ عریانیم ، ما

آینہ بہ تشخیصِ نفس می آرم

وا کنم گرہِ تار و پودِ خویش

وام کرده سعی ہا در جستجوے خویشتن

روز و شب گرمِ احتسابِ خودیم

ہرگز ریا نہ کرده ام از احتسابِ خویش

ما لیدۂ بے ہوشی ، و کاہیدۂ جوشیم

بر نہ آید دل از ہوس پختن :
جوش از آہِ خامِ ما نہ خورد

چند در کوزهٔ ہوس بجوشم ؟
می شود خام تر : چہ علاج ؟

ظہوری ، در مصافِ نفس ناسے برنیا وردی :
غزل خوانی خوش است : از مطربانِ تازہ الحان شو

صرف کرد است ظہوری ہمہ آگہیِ دل
باسیدے کہ شود یک نفسے غافلِ خویش !

آسمان برگرفتہ اوج و حضیض
از فراز و نشیبِ احوالم

غواصیِ اُمید ہاے خامِ من انصاف نیست'

' آینہ مدارید بہ پیشِ نفسِ ما

غالب

حزیں

غالب نے حزیں کو 'انتہاے آرزوے متقدمین و ابتداے آرزوے متاخرین ، کہا ہے - شیخ کا پایہ٭ شاعری تو یقیناً وہ نہیں جو میرزا کا ہے ، پھر بھی میرزا نے اپنے اس پیش رو سے نہ صرف فارسی بلکہ اردو کلام میں بھی خوشہ چینی کی ہے ، چونکہ دونوں میں ، شخصی و شعری مزاج کے علاوہ ، کچھ معنوی مناسبت بھی ہے - مزاج کے مختلف پہلوؤں کی ہم رنگی حزیں کے یہ شعر ظاہر کریں گے :

'باخود عشق' :

ہم عاشق است و معشوق ، ہم شاہد است و مشہود

دلم ، چون شعلہ٭ جوالہ، باخود عشق می بازد :
چراغِ خلوتِ خاصِ خود، و پروانہ٭ خویشم

'لذتِ غلطانیِ تپش' :

چہ لذت بود ار قاتل حزینِ نیم بسمل را
کہ در خون می طپید ، و آفرین می گفت بردستش !

٭ یہ ترکیب غالب کی ہے -

لذتے نیست بہ از رقص بہ خون غلطیدن :
ہم چنان بسملِ ما بال فشان ہست کہ بود

در دیدہ می تپید ، چو بسمل ، بہ خونِ دل
کز تیغِ دوریِ تو نگاہم شہید بود

بہ خونِ خود ، چو گل، آغشتہ دامن تا گریبانم

'لذتِ ستم' :

پیوند بود ہا رگِ جان خارِ ستم را

'ذوقِ زخم' :

گلِ زخمم ، کہ از سیرابیِ تیغِ تو خندانم

مرا آبِ حیات از جدولِ شمشیر می آید[1]

لب تشنۂ تیغم : ز کوثر چہ کشاید ؟
دریا کشِ زخمیم : ز ساغر چہ کشاید ؟

مروت نیست ، گر زخمِ دلم پہلو کند خالی :
چہ منت ہا کہ از تیغِ تو ننہادم بہ جان خود !

---

[1] بہ جگر تشنگیِ خضر دلم می سوزد
کہ ز سرچشمۂ تیغےدمِ آبے نہ کشید

ظہوری

داخلیت :

بہ ہر طرف گزر کردیم ، بہ خود سفر کردیم

برون از من نہ باشد جلوہ گاہے حق و باطل را:
خراباتِ دلم : ہم کعبہ ، ہم بت خانۂ خویشم

دو جہان است در کنارِ خودم :
خود خزانِ خود ، و بہارِ خودم

منم آن سالکِ سرگرم ، کہ در خلوتِ فکر
بہ دو عالم ز رہِ چاکِ گریبان گرفتم

چشم در راہِ انتظارِ خودم !

کشادہ مشربی :

زد جاذبۂ عشق رہِ ملت و کیشم

از مے کدہ تا کعبہ : از کعبہ بہ مے خانہ
آسان نہ توان رفتن : دشوار نہ باید بود

ہر پارۂ سنگے بہ نظر طورِ تجلی ست :
اے بے بصراں ، کعبہ و بت خانہ کدام است؟

---

[1] نشستہ ام اندوہ گین در انتظارِ خویشتن
نظیری

دلا، آسان نہ می آید بہ کف سامانِ آزادی :
اگر از عقل رستی ، عشق دامن گیر می آید

بہ تنگ نائے خرد پائے بست نہ توان بود :
چو عشق ، خانہ بر اندازِ کفر و ایمان باش

مخلوط عقاید :

بنازم نالۂ ناقوسیِ لبیک خوانِ خود

اگر از دیر وا گشتیم ، شوقِ کعبہ پیش آمد :
تگا پوے نفس ، یا رب، کجا ہا می برد ما را!

سبحہ در گردنِ من مصلحتِ وقت فگند
ورنہ زنارِ من آن موے میان است کہ بود

پیدا ست ، حزین ، مارا از دلقِ مے آلودش
کاین رندِ خراباتی تقواے دگر دارد

عقل پر عشق کی برتری :

مردِ میدانِ عشق عقل نہ شد :
صعوہ از صولتِ عقاب گریخت

بہ عشق آمیز ، تا بنایمت جامِ جہان بین را
بہ شرطِ آنکہ ننہاہی بہ عقلِ مصلحت بینش

اب کچھ ایسے شعر پیش کیے جاتے ہیں جن میں اس نوع اور روش کے جذبات ملتے ہیں جو غالب تحریکِ جد و جہاد اور اس کے داعیوں ، اور خصوصاً شاہ اسماعیل کے باب میں ، رکھتے تھے - ان میں سے بعض اشعار کی زمینیں غالب نے بھی استعمال کی ہیں :

حسن آن روز کہ آینہ مصفا می کرد
عشق در پردۂ زنگار تماشا می کرد

عشقِ تو زند راہِ خواباتی و زاہد :
این شعلہ چہ شوخ است، کہ در خشک و تر افتاد[1] !

از پےِ دل زدگان جلوۂ طنازے ہست :
با خرابی زدگان خانہ بر اندازے ہست

گرچہ ما سبزۂ خوابیدۂ این گلزاریم
سرِ ما در قدمِ سروِ سر افرازے ہست

---

[1] خشک و تر سوزیِ این شعلہ تماشا دارد !
عشقِ یک رنگ کنِ بندہ و آزاد آمد

غالب

قفس پرورده ام ، اما به بختِ سبز می نازم :
دلم از یادِ او باغ و بهارے در نظر دارد

اے خاکِ بے نوا ، چه قدر رنگ داشتی !
اے لعبتِ فنا ، چه بلا جلوه کاشتی !

بحرِ خون : شوقِ قیامت : نفسِ شعله فشان
در کدامین دل ازان لعلِ شکر خاست، که نیست؟

اے دل ، سپندِ آتشِ سیمائے کیستی ؟
جز من به باد دادهٔ سودائے کیستی ؟

در محفلے که موجِ پری زاد می زند
آینه دارِ حسنِ دل آرائے کیستی ؟

زاہد ز دین برآمد ، و عاشق ز دل گذشت :
خوش فرصتِ تو باد ، به یغمائے کیستی ؟

مردان نظر از نرگسِ فتانِ تو پابند
فیضِ سحر از چاکِ گریبانِ تو پا بند

یوسف صفتان ، باہمه بے باکی و شوخی
آسودگی از گوشهٔ زندانِ تو پا بند

عشاقِ جگر سوختہ جمعیتِ دل را
در سلسلۂ زلفِ پریشانِ تو یا بند

ہر غنچہ ، کہ در پیرہنِ باغ و بہار است
خمیازہ کشِ چاکِ گریبان تو یا بند

بخشید حیاتِ تن اگر آبِ سکندر
دل زندگی از چشمۂ حیوانِ تو یا بند

مدِ نگہِ حسرت و آہِ دلِ گرم است
شمعے ، کہ سرِ خاکِ شہیدانِ تو یا بند

شمع ہا بردہ ام از صدق بہ خاکِ شہدا
تا دل و دیدۂ خونتابہ فشانم دادند

خرامِ نازِ تو ، اے شاخِ گل ، قیامت را
بہ خاکِ عاشقِ خونین کفن فرو ریزد

بہ سجدہ گاہِ تو سر بر زمین چنان کوبم
کہ لرزہ در جگرِ اہرمن فرو ریزد

ز چینِ طرۂ آن نازنین غزال ، حزین !
چہ نافہا کہ بہ جیبِ ختن فرو ریزد !

آشوبِ دل از سلسلۂ زلفِ تو افزود
دیوانۂ بے پا و سرے را چہ کند کس ؟

گر شوخیِ حسنت نہ کند انجمن آرا
چون شمع ، فروغِ نظرے را چہ کند کس ؟

در آتشِ محرومیِ رخسارِ تو دل سوخت :
پروانۂ بے بال و پرے را چہ کند کس ؟

حزیں کے ایک شعر میں غمازی کا مضمون بندھا ہے ، جو شاہ اسماعیل کے مواعظ کی مخبری پر بھی چسپاں ہوتا ہے :

در و دیوارِ جہان گوش بر آوازِ دل اند
بکشا پردۂ این راز ، کہ غمازے ہست !

تشنگی ، نارسی اور ناتمامی کی کیفیت :

نارس نگہی دیدم ، و آشفتہ ترم ساخت

ساقی بے کم داد ، و فزون گشت خمارم

شرابِ خم نہ دارد جلوۂ در تنگ نائے دل
خمار آلودم از کم ظرفیِ رطلِ گرانِ خود

بہ من ز بادۂ عشقِ تو رنگ و بو کافی ست
ہمین قدر ، کہ نمی ہست در سبو ، کافی ست

چہ باک ، ساقی ، اگر دورِ مے بہ ما نہ رسید ؟
ز جرعۂ تو لبم مستِ آرزو کافی ست

شراب اگر نہ بود ، آتشم بہ ساغر کن :
گدائے مے کدہ را شعلہ در سبو کافی ست

ہوائے سنبل و ریحان بس است بلبل را :
مرا شمیمے ازان جعدِ مشک بو کافی ست

اگر جواب نیامد ، غمین مباش ، حزین !
بہ طورِ عشق ترا ذوقِ ہائے و ہو کافی ست

با آن کہ دلم نظر فتادۂ یار است
پیمانہ ازین مے کدہ بسیار کشید است

ازان تر جرعۂ، کز ناز بر خاکِ رہ افشاندی
ہنوزم آرزو خونابِ حسرت در گلو دارد

نہ دارد طاقتے ہر شیشۂ دل تابِ فروغِ او
شرابِ خام سوزے عشق در جام و سبو دارد

سیلِ عنان گسسته به دنبال می طپد
در وادیِ که شوق بود ره نمایِ ما

از غمزهٔ تو رفت ز خونم فسردگی :
جوشِ نشاط زد میِ مرد آزمایِ ما[1]

ذوقِ طلب :

تا هست مے به شیشه ، غم از عمرِ رفته نیست :
آن آبِ رفته باز به این جو یبار بخش

آرام سوز حوصلهٔ کن نصیبِ ما
با بحر ، بے قراریِ ما را کنار بخش

مپسند خالی از مے گل رنگ ساغرم
ته جرعهٔ ، چو لاله به این داغ دار بخش

چون موجِ سرابیم درین وادیِ خون خوار
ہر چند طپیدیم ، به دریا نه رسیدیم

---

[1] خونم ستاده بود ز دردِ فسردگی
دل داد پایِ مردیِ تیغت گزاره را

غالب

سیلِ عنان گسستہ بہ دنبال می طپد
در وادیِ کہ شوق بود رہنماے ما

از غمزۂ تو رفت ز خونم فسردگی
جوشِ نشاط زد مےِ مرد آزماے ما

چون موجِ بے گسستہ، زند موجِ اضطراب
خاک از طپیدنِ دلِ بے دست و پاۓ ما

پاے بستند ، و رہِ سعی نشانم دادند
دست و بازو بشکستند ، و کہام دادند

جانِ سختم حذر از دوزخِ جاوید نہ داشت :
خانہ در کوچہ' آسودہ دلانم دادند

عارے بود از نقشِ خودی آینہ را :
آتش بہ دل و جان زدۂ غیرتِ عشقم

ظاہری جمود : باطنی سرگرمی
ز خود رفتن سفر باشد خراباتی نژادان را :
بہ کوے مے پرستان نقشِ پا ہرگز نہ می باشد

' آسودگیم دست ز کردار کشید

حزیں

نظر پوشیدن از آفاق باشم عینِ بینای :
اگر انصاف داری ، چشمِ دنیا دیدهٔ دارم

منم آن سالکِ سرگرم ، که در خلوتِ فکر
به دو عالم ز رهِ چاکِ گریبان رفتم

گریز :

می گریزم ز جهان : بار چرا بردارم ؟
سر دربن معرکه اندازم ، و پا بردارم !

از خود جدا نشسته ، و آسوده خاطرم
کارے مرا به شور و شرِ روزگار نیست

حزین ، آشوب گاهِ زهد و رندی را وداعے کن :
همین دارالامانِ بے خودی امنیتے دارد

حزین ، کنجِ قفس بیهوده می باشد پر افشانی :
به گیتی مایهٔ آسایشم کوتاه پای شد

بهار و خزاں ہمے یکساں اثر اندوزی :
ورق گردانیِ باغِ بهاران فیض با دارد

ز ہم چون بگسلد شیرازۂ دفتر بہاران را
ورق گردانیِ برگِ خزان ہم دیدنی دارد

دل بیہدہ بستیم بہ نیرنگِ بہاران :
آن رنگ کدام است کہ در برگِ خزان نیست؟

کچھ مثالیں جن میں غالب کا اردو کلام حزیں کا مرہونِ منت ہے :

افسردہ شد جہان ، چو حزیں از میانہ رفت :
مجنون گزشت ، و شورِ بیابان فرو نشست

مجنوں جو مر گیا ہے ، تو جنگل اداس ہے

مدتے شد کہ ز آبلہ پاے نہ گزشت
جگر از تشنگیِ خارِ بیابانم سوخت

خواستم خارِ بنے تشنہ لب نہ گزارم
ہمہ تن آبلہ از خارِ بیابان رفتم

کانٹوں کی زباں سوکھ گیی پیاس سے ، یا رب !
اک آبلہ پا وادیِ پر خار میں آوے

چہ لذت بود از قاتل حزینِ نیم بسمل را
کہ در خون می تپید ، و آفرین می گفت بر دستش

اسد بسمل ہے کس انداز کا! قاتل سے کہتا ہے :
تو مشقِ ناز کر ، خونِ دو عالم میری گردن پر!

نشۂ صہبا نہ می ارزد بہ تشویشِ خمار
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

بیدل

غالب نے بیدل کے فکر سے بھی اثر لیا ہے ، اور ان کے کلام کے اس پہلو سے بھی جس میں خود ان کے بعض تجربات کی جھلک ملتی ہے :

شوق کی ہمہ جہت ولولہ آفرینی :

چہ نقش ہا کہ نہ شد جلوہ گر ز پردۂ شوق !
چہ رنگ ہا کہ نہ دارد طلسمِ غنچۂ شوق !

سوادِ جوشِ تمنا : چہ آسمان ، چہ زمین !
نوائے زیر و بمِ آرزو : چہ تحت ، چہ فوق !

وجود کے متنوع مظاہر :

عارف نہ کشد زحمتِ تفتیشِ قیود
کاین نقش چہ جلوہ داد ، یا آن چہ نمود

ہر نخل برے دارد ، و ہر گل رنگے :
غافل مشو از خواصِ آثارِ وجود¹

'عشقِ خود' :

از دیر و حرم مقصدِ دل عشقِ خود است

داخلیت :

چہ دام است دنیا ! چہ دام است عقبی!
تو معماری این خانہ ہاے گماں را

کو خلوت و کو انجمن ، در فکرِ خود دارم وطن:
چوں صبح ، سر تا پاے من دارد گریباں در بغل

کیست خاکِ تیرہ تا باشد تماشا گاہِ ما ؟
سیر ہا در خویشتن ، چو آسماں ، دارم ما

¹ ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا :
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

سر از حجابِ تعین اگر بروں آرد
چہ جلوہ ہا کہ بہ ہر کیش می تواں کردن !

غالب

نہ با صحرا سرے دارم ، نہ با گلزار سودائے :
بہ ہر جا می روم ، از خویش می جوشد تماشائے

کلام میں اپنی اور اپنے عہد کی شکستہ رنگی :

بہ سینہ داغ ہائے تمنا نوشتہ ایم
یک لالہ زارِ نسخۂ سودا نوشتہ ایم

بر نسخۂ بہار خطِ نسخ می کشد
رنگِ شکستۂ کہ بہ سیما نوشتہ ایم

از نقشِ ما حقیقتِ آفاق خواندنی ست

دیگر ز نقشِ نامۂ اعمالِ ما مپرس :
نظارۂ بہ لوحِ تماشا نوشتہ ایم

گم گشتگانِ وادیِ نیرنگِ حیرتیم :
درگردِ رنگِ باختہ کن جست و جوے ما

آزادہ روی کی آرزو :

بے کشمکشے نیست ، چہ دنیا و چہ عقبی!
آہ از دلِ آزاد ، کہ خود را بہ چہ ہا بست!

ہیچ کس از بے تکلف زیستن آگاہ نیست :[1]
آدمی بودن خلل در عیشِ مردم می کند !

بیدل کے بعض اشعار میں (کسی واردات کے ضمن میں ، جس کا مجھے علم نہیں) ایسے جذبات کا اظہار ہوا ہے جو ان جذبات سے ملتے جلتے ہیں جو غالب نے تحریک و محرکینِ جد و جہاد کے بارے میں ظاہر کیے ہیں :

گر نہ شاگردِ جنون است دلِ بیدلِ ما
ابجدِ چاکِ گریبان ز کہ آموختہ است[2] ؟

چون آن شبنم، کہ گیرد جذبۂ خورشید دامانش
سبکروحانہ ، بے امدادِ بال و پر برون رفتم

دامِ تپش ہائے دل حسرتِ سیرِ فناست :
شعلۂ بے تابِ ما بسملِ خاکستر است

---

1 شیوۂ رندانِ بے پروا خرام از من مپرس :
این قدر دانم کہ دشوار است آسان زیستن

غالب

2 چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریبان سمجھا

غالب

بیدل ازین انجمن سرخوشِ درد است ، و بس
بزم چون باشد سراب ، آبلہ اش ساغر است

من کہ از خود رفتنم دشوار می آید بہ چشم
محرمِ طرزِ خرامِ او چسان خواہد شدن ؟

می کشم عمرے ست ، بیدل، خجلتِ نشوونما :
در عرق ، مانندِ شمع ، آخر نہان خواہد شدن

رسواے آفاقم ، چو صبح ، از شوخیِ داغِ جنون

گر بہ این ساز است دور از وصلِ جانان زیستن
زندہ ام من ہم ، بہ آن ننگے ، کہ نتوان زیستن

موجِ گوہر نیستم : زندانِ خویشم من چرا ؟
سر بہ جیبم کرد این پا بہ دامن زیستن[1]

بیدل کے بعض اشعار میں اس نقطہ نظر نے بھی اظہار پایا ہے جن میں ، حرکی مسلک کی بجاے ، مسلکِ تسلیم کی تلقین کی

---

[1] پا بہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد

گیی ہے - یہ اسی قبیل کا مسلک ہے جو تحریکِ جد و جہاد کے بارے میں مولوی فضلِ حق کا تھا ، اور جس کی ترجمانی غالب کے کلام میں بھی ملتی ہے :

فالِ تسلیم زن ، و شوکتِ شاہے دریاب :
گردنے خم کن ، و معراجِ کلاہے دریاب

تا کے ، اے پاے طلب ، زحمتِ جولان دادن؟
طوفِ آسودگیِ آبلہ گاہے دریاب[1]

ہش دار ، کہ در سایۂ دیوارِ قناعت
خوابے ست کہ در خوابِ پر و بالِ ہما نیست

آبرو تا بہ کجا خاکِ مذلت نہ شود ؟
حرص در سعیِ طلب انچہ نہ دارد ، عار است

غافلان ، چند ہوا تازِ جنون باید بود ؟
کسوتِ سر کشیِ شمع گریبان وار است

رہ روِ تسلیم را راحلہ افتادگی :
قافلۂ عجز را خاک شدن رہ بر است

---

[1] حزین از پاے رہ پیما بسے سر گشتگی دیدم
سرِ شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید این جا

بیدل کی جن زمینوں سے غالب نے بھی کام لیا ہے ، ان میں کچھ ایسے شعر بھی ہیں جن سے تحریکِ جد و جہاد کے ضمن میں خود غالب کے کسی نہ کسی تاثر کی ترجمانی ہوتی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اسی رعایت سے اختیار کیا گیا ہے - اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

وقت است کنون ، کز اثرِ خونِ شہیدان
شمشیرِ تو یا قوت کند سنگِ فسان را

باشد کہ سر از منزلِ مقصود بر آریم
چون جادہ ، درین دشت سر افگندیم عنان را

بے تابِ جنون در غمِ اسباب نہ باشد :
دل زادِ رہِ شوق بود ریگِ روان را

آسودہ روان جادۂ تشویش نہ دارد :
منزل طلبی ترک مکن ضبطِ عنان را

بیداریِ من ، شمع صفت ، لافِ زبانی ست :
دارم ز خموشی بہ کمین خوابِ گران را

داو سحر از یک جگرِ چاک دمیدیم :
آہے نہ کشیدیم ، کہ نگرفت جہان را

بیدل ، نفست خون مکن از ہرزہ در ای :
تحریکِ زبان نیشتر است این رگِ جان را

اے از خرامت نقشِ پا خورشیدِ تابان در بغل!

محوِ جنونِ ساکنم ، شورِ بیابان در بغل
چون چشمِ خوبان، خفتہ ام، نازِ غزالان در بغل

از بس کہ با خاکِ درت می جوشد آبِ زندگی :
دارد نسیم از طوفِ او ، ہمچو نفس، جان در بغل

از چشمِ خویش ایمن نیم ، کاین قطرۂ دریا نسب
دارد ، بہ وضعِ شبنمے ، صد رنگ طوفان در بغل

می آید از دشتِ جنون گردم ، بیابان در بغل
طوفانِ وحشت در قدم ، فوجِ غزالان در بغل

مشتِ غبارم می رسد ، وضعِ پریشان در بغل

تنہا نہ من از حیرتش دارم نفس در دل گرہ
آینہ ہم دزدیدہ است آشوبِ طوفان در بغل

در وادیِ کز شوقِ او ، بیدل، من از خود رفته ام
خوابیده ہر نقشِ قدم بگزشت ، جولان در بغل

چون شمع ، دارم در وطن شامِ غریبان در بغل

بیدل کے ایسے دو شعر بھی نظر سے گزرے ، جن سے اتفاقیہ امیر خاں کی کم حوصلگی اور تخریب اور سید احمد شہید کی تعمیری مساعی کی بڑی خوبی سے ترجمانی ہو جاتی ہے :

نہ می دانی کہ رخشِ عزمِ ہمت می کند جولان؟
حیا از ہر دو عالم می کشد دستِ عنان دارش

بہ تعمیرِ دلِ تنگم کسے دیگر چہ پر دازد ؟
طنابِ وسعِ ہمت ہر گرہ بستہ ست معمارش

بیدل کی بعض ترکیبیں جن سے تحریکِ جدوجہاد کے بارے میں غالب کے بعض تأثرات کی بھی ترجمانی ہوتی ہے :

دو عالم : دو عالم آرزو : دامِ تسخیرِ دو عالم

دہر : آشوبِ دہر : کشاکشِ دہر : دردِ ہستی

دل : مطالعۂ دل : نغمۂ دلِ تنگ : سازِ شکستِ دل

افسون : افسونِ تعلق : افسونِ جنوں

جنوں : صحرائے جنوں : ہوا تازِ جنوں : بےِ تاب جنوں :

محوِ جنونِ ساکن

طوفان : طوفانِ وحشت : آشوبِ طوفان

پرواز : پرِ پرواز : دعویِ پرواز : شعلۂ بے بال و پر :

وہمِ پرواز

حسرت : حسرتِ سیرِ فنا : طوفان طرازِ حسرت :
دلِ حسرت‌گدا حسرتِ چاکِ جگر : زخمِ حسرت

درد : دردِ ہستی : دردِ محرومی : سرخوشِ درد

آہ : آہِ قیامت قامت : خم و پیچِ آہ : آہِ بے بال و پر

عجز : عجزِ رسا : واماندۂ عجز

احتیاج : شورِ ہنگامۂ محتاج : عرضِ دست گاہِ ضعیفی

۵

جدوجہاد کے محرکات اور مجاہدین کے جذبات داعیوں کی زبانی

انگریزوں کا غلبہ :

بیگانگانِ بعید الوطن ملوکِ زمین و زمن گردیدہ ، و تاجرانِ متاع فروش بہ پایۂ سلطنت رسیدہ ، امارتِ امراے کبار و ریاستِ رؤساے عالی مقدار برباد نمودہ اند ، و عزت و اعتبارِ ایشان بالکل ربودہ ۔ چون اہلِ ریاست و سیاست در زاویۂ خمول نشستہ اند ، نأچار چندے از اہلِ فقر و مسکنت کمرِ ہمت بستہ ، این جماعتِ ضعفا محض بنا بر خدمتِ دینِ رب العالمین برجستند ۔

(بہ راجا ہندو راو)

... اکثر بلادِ ہندوستان بدستِ بیگانگان افتادہ ، و ایشان ہر جا بنیادِ آیینِ جور و ظلم نہادہ ۔ ریاستِ رؤساے ہندوستان برباد رفتہ ۔ کسے تابِ مقاومتِ ایشان نہ می دارد ، بلکہ ہر کس ایشان را آقاے خود می‌شمارد، و چون رؤساے کبار از مقابلۂ ایشان نشستند، لاچار چند کس از ضعفاے بے مقدار کمر بستند ۔

(بہ غلام حیدر خاں)

انگریزوں اور سکھوں کا تسلط :

قضا را از مدت ِ چند سال حکومت و سلطنت ِ این ملک بر این منوال گردیده که نصارائے نکوہیده خصال و مشرکین ِ بدمآل بر اکثر بلادِ ہند استیلا یافتند، و آن دیار را به ظلمات ِ ظلم و بے داد مشحون ساختند ، و دران بلاد و امصار رسوم ِ کفر و شرک اشتهار یافته ، و شعایر ِ اسلام رو به استتار آورده ۔ ناگزیر ، سینۂ بے کینه به معاینۂ این حال پر از رنج و ملال بود و به شوق ِ ہجرت مالا مال ، غیرت ِ ایمانی به دل در جوش بود و اقامت ِ جہاد به سر در خروش ۔

(به والی ِ چترال)

قیام ِ دین به ملک است ، و احکام ِ دینیه که تعلق به حکومت دارند، به وقت ِ نه بودن مملکت، صاف از دست می روند ، و خرابی ِ امور ِ مسلمین و ذلت و نکبت ِ ایشان از دست ِ کفار متمردین و اہانت ِ شعایر ِ شرع ِ مقدس و تخریب ِ معابد و مساجد ِ مسلمین که می شود ، ہویداست ۔

بالجمله ، عمرے گزشت که این رنج و تکالیف می کشیم و انتظار ِ ہمین معنی می نماییم که تا کدام وقت ِ محمود ، کدام ساعت در رسد که آفتابے بر فلک ِ سلطنت طلوع نماید*و تا ستارهٔ از افق ِ حکومت در خشد، که از اشراقات ِ اشعهٔ انوار ِ آن مثیر ظلمات ِ شرک

و طغیان مضمحل و مفقود گردد؛ لیکن مدتِ مدیده و عرصهٔ بعیده منقضی گردید، که ... بالجمله کسی از سردارانِ زمان و سلاطینِ دوران به آه و فغانِ مظلومان گوش نه نهاد ، و به دست‌گیریِ افتادگان دست نه کشاد ـ آخرالامر ، نورِ محمدی علمِ حمایت به افراخت و جمالِ احمدی نقاب از چهره برانداخت، یعنی، ...امیرالمجاہدین السید احمد ... اظهارِ دعوتِ عام به سوے قتلِ کفارِ لیام به جدوجهدِ تمام وسعیِ مالا کلام محض لله و فی الله ، بی شائبهٔ طلبِ مال و عزت و جاه و حکومت کرده ـ (به سردارانِ پشاور)

یک رنگی و یک جہتی کا مطالبہ :

... من همان ام که در بابِ سینه صاف ام ، خاصه در معاملاتِ صلح و جنگ یک رو و یک رنگ ـ از دو روی بیزارم ، و از پاس داریِ غیرِ حق دست بردار ؛ عاجز و خاک سارم و بندهٔ عبودیت شعار ؛ از اعانتِ ماسوی الله عار و ننگ می دارم ، و گل برگِ غیرِ حق را بسانِ خار و سنگ می شمارم ـ کسے که بامن راهِ اتحاد می پوید و رابطهٔ اخلاص بامن می جوید ، لازم که به رنگِ عبودیتِ خالصه رنگین شود و به متانتِ استقامت سنگین ، و بامن خواجه تاشی اختیار کند ، و از او باشی اجتناب ورزد ـ هر که خواهد که از حق علاقهٔ تعلق بگسلد و بامن رابطهٔ تملق پیوندد و با مولاے من بنیادِ مخالفت نهد ، و کفارِ نابه کار و بندهٔ عبودیت شعار را در

یک سلکِ موافقت کشد ، پس ہرگز ہرگز این امر کہ شدنی نیست، کہ من محض بندۂ پروردگارام ، نہ بندۂ کسے از صغار و کبار . . .

مجاہدانہ حرارت :

حالِ عجز مآلِ ما فقرا کہ ، باوجودِ این بے سروسامانی و ضعف و ناتوانی ، بر مقابلۂ اربابِ حشمت و ثروت چالاکیم ، و در مخالفتِ اصحابِ عزت و مکنت بے باک ، پس باید دانست کہ ہرچند ما فقرا بہ ہیئت بے سروسامانیم ، بر وعدۂ او فرحان و شادانیم ، و در اطاعتِ او کام یاب و کام رانیم . . . قوتِ معاندین را ، گرچہ بہ مدارجِ بے شمار کشد ، در جنبِ عظمتِ مولاے خود ، ہم سنگِ خس و خاشاک نہ می شمارم ، و ہم رنگِ مگسِ ناپاک ہم بہ خیال نہ می آرم - بالجملہ ، بندۂ انقیاد شعار ام ، و با فتح و شکست کار نہ دارم - خیالِ اعانتِ دین در سر دارم ، و عزیمتِ اہانتِ متمردین پیشِ نظر - ہر فرد تیرے کہ در ترکش دارم ، در این معرکہ خواہم انداخت ، و ہر مہرہ تدبیرے کہ از تہِ دل بر آرم ، بر این بساط خواہم باخت ، انواع منفعت و مضرت بامن رسد ، یا با کسے دیگر ، خواہ تاجِ شہامت بہ سریابم ، خواہ خلعتِ شہادت در بر -
(بہ وزیرِ والیِ پشاور)

در نصرتِ دینِ محمدی بر سعی ، بہ ہر وجہ کہ ممکن باشد ، بجا می آرم و ہر تدبیرے کہ دران مفید می نماید ، بہ روے کار

می آرم ، و انشاءالله تعالیٰ تا دمِ مرگ در ہمین سعی مشغول خواہم ماند ، و تمام عمر درین تدبیرات مبذول خواہد گرد ۔ تازندہ ام ، ہمین راہ می پویم ، و تا موجودم ، ہمین مقصد می جویم ۔ تا سروپا است ، ہمین راہ است و ہمین سودا ، خواہ مفلس شوم ، خواہ غنی ، خواہ منصبِ سلطنت یابم ، خواہ رعیت گری ، خواہ متہم بہ جبن شوم، خواہ متسم بہ شجاعت ، خواہ بہ مرتبۂ غزا فایز شوم ، خواہ بہ منزلۂ شہادت ۔ آرے ، اگر بینم کہ رضاۓ مولاے من در ہمین منحصر است ، کہ در معرکۂ جنگ تنہا بہ جانِ خود بیایم ، پس باللہ و تاللہ ، کہ بہ صد جان سینہ سپر نمایم ، و در مجامعِ عساکرے دغدغہ وسواس در آیم ۔ (بہ سردارِ افواجِ رنجیت سنگھ)

دعوتِ جدوجہاد :

تکمیلِ ایمان بجز از مقاتلۂ اہلِ کفر و طغیان صورت نہ می بندد . . . پس لابدی دعویِ ایمان را بہ شہادتِ اقامتِ جہاد مبرہن باید کرد ، و الا مجرد ایمان ، بدونِ اقامتِ جہاد ، از پایۂ اعتبار ساقط است ۔ الحق ، کہ بندۂ کہ در مقابلۂ اعداے خود غیرت و حمیت نہ می دارد ، فی الحقیقت بندہ نیست ، و محبے کہ جان و مال و عزت و آبروے خود را در تحصیلِ رضاے محبوب نگہ دارد ، فی‌الحقیقت محب نے ، و مخلصے کہ پاس داریِ وجاہتِ غیرِ معبودِ خود را ملحوظ دارد ، در دعویِ اخلاص کاذب و دروغ زن است ۔ مقتضاے علاقۂ عبودیت ہمان است کہ محبتِ اہل و عیال و طلب

مال و منال و مراعات ِ عزت و وجاہت و امارت و الفت ِ اخوان و اقران و پاس داری ِ روسا و دوستان پس ِ پشت اندازد ، و فقط رضاے رب ِ ذوالجلال و مجرد انقیاد ِ ایزد ِ متعال قبلۂ ہمت سازد :

مصلحت دید ِ من آن ست کہ یاران ہمہ کار
بگزارند ، و خم ِ طرۂ یاری گیرند

معرکۂ جہاد بر اہل ِ کفر و فساد بہ اظہار ِ جلادت و شجاعت بیارانید ، و دست ِ ہمت بہ اطراف و جوانب دراز کنند، و بلاد ِ کفر را موکب ِ مجاہدین و مشرف بہ کوکب ِ دین ِ متین گردانند ، و تا ہر جا کہ ممکن باشد. . . اقامت ِ جہاد و غلغلۂ استیصال ِ کفر و فساد رسانند ، بالجملہ ، چپ و راست در میدان ِ شہامت بہ بازند ، بیوت ِ کفار را بہ خون ریزی ِ اشرار بسون ِ لالہ زار فرمایند، حتٰی کہ ظلمت ِ شرک بہ شوارق سیلروف رنگ و بوارق ِ تیر و تفنگ مفقود گردد ، و تماسی ِ این حدود ممتلی بہ توحید ِ رب ِ معبود شود ، و شب ِ کفر بہ زاویۂ عدم رود ، و آفتاب ِ عالم تاب ِ ہدایت و متانت از آفق ِ شجاعت و شہامت طلوع کند ۔

(بہ شاہ صبغة الله سندھی)

چہ مقصود ِ صرف ِ عمر ِ خود است در اطاعت ِ رب‌العالمین و اتباع ِ سید المرسلین، فاما انقلاب ِ ادوار و اطوار، تقلب ِ اقبال و ادبار، و برہم زدن ِ ملل و دول؟ پس تعلق بہ قدرت ِ کاملۂ ربانی می دارد،

نه به استطاعتِ ناقصهٔ انسانی ، و مسلمانِ مهدی را همین لازم است که مال و جان و عزت و آبروے خود را در همین راه در بازد ، و آن را عینِ سعادتِ خود شمارد ، و ترقی و تنزل ، موافق و مخالف ، به قدرتِ کاملہ سپارد ، به موجبِ بیت :

بخت اگر مدد کند ، دامنش آورم به کف :
گر بکشم زہے طرب ، و ربکشد زہے شرف !

و صرفِ اوقات را در همین مساعیِ معظمه عبادات انگارد و قربِ حق را در همین راه منحصر پندارد ، و دیگر مشاغلِ دینیه و دنیویه را معطل کرده ، مردانه وار در همین میدان در آید ـ فرد :

مصلحت دید من آن ست که یاران همه کار
بگزارند ، و خمِ طرهٔ یارے گیرند

(شاه اسماعیل به وزیرالدوله)

بر ذمهٔ هر خاص و عام که مدعیِ دینِ اسلام باشد ، این قدر لابدی است که ، در وقتِ معارضهٔ نور و ظلام و مقابلهٔ کفر و اسلام ، غیرتِ ایمانی را کار فرمایند و بر مقتضاے حمیتِ اسلامی عمل نمایند، که هر که در امثالِ این احوال هم جانِ خود را در سلکِ انصارِ حق منسلک نه گرداند ، بے شک مراتبِ نفاق و شقاقِ خود را به درجهٔ قصویٰ رساند ، و هر که در این صورت نیز از تائیدِ دین پهلو تهی کرد ، لاریب داغِ مخالفتِ رب‌العالمین بر جبینِ فساد

آگینِ خود زد ، و ہر کہ بر این تقدیر ہم ازین معرکہ روپوش گردید ، یقیناً خود را از دایرۂ ایمان بیرون کشید . . .

ہر کہ درین مقدمۂ دینِ ملک علامِ انتظارِ غلبۂ جنودِ اسلام کشید ، بالتحقیق در درجاتِ مترصدینِ ایام و متربصینِ بدانجام رسید . . .

آن چہ در دلِ خداع منزلِ اہلِ شک و ریب ، اربابِ مکر و فریب خطور می کند کہ بہم رسیدنِ اسبابِ حرب و جنگ از جنسِ توپ و تفنگ و اجماع بے عدد و شمار از شروطِ اقامتِ جہاد است ، و فقدانِ آن باعثِ عذرِ عباد ، پس این خیالے است پر اختلال و وہمے است سراسر باطل و محال . . .

ہم چنین بعضے . . . بہ پاسِ خاطرِ امرا و سلاطین . . . می (گویند) کہ جہادِ لسانی افضل از جہادِ سنانی ، و جہادِ نفسانی اکمل از جہادِ جسمانی ، و تادیبِ عباد اولی از تخریبِ بلاد ، و ترغیبِ موافقین اعلی از ترہیبِ مخالفین ، و تعمیرِ مساجد بہتر از تنفیرِ مفاسد ، مواصلۂ حبیب خوش تر از مجادلۂ رقیب ، مکالمۂ جان و دل الذ از مکالمۂ سیف و سنان ، مجالستِ محبوب اعز از مخالفتِ مغضوب ، منادمتِ احبا انفس از ملازمۂ اعدا ، مسامرۂ محابتہ ارفع از محاصرۂ مسائتہ ، مواساتِ مصایبِ جموعِ مساکین

انفع از مقامات متاعب جنود شیاطین ، و امثال آن ، از مکاید تضلیل است و دعاوی بے دلیل . . .

پس کسے کہ مساعی جہاد را بہ قبیح کند یا مشاغل دیگر ترجیح دہد ، و در خدمت گزاری حق سست باشد و در پاس داری غیر حق چست ، و بر تحقیر اقران غیور باشد ، و در غیر ادیان صبور ، بر اہانت معاندین نفسانی مسابقہ کند ،'و در اعانت مجاہدین مساہلہ ، پس ہمون است آثم و گنہ گار و ستم گار و از بارگاہ حق مطرود و مردود . . .

جذبہ مجاہدین :

افواج مجاہدین ابرار، بسان امواج بحر زخار، در جمیع بلاد و امصار این اقطار در جوش است ، و غلغلہ اقامت جہاد و استیصال ارباب بغی و فساد و اصحاب کبر و عناد درین اطراف و اکناف در خروش - اطباق کون و مکان و بساط زمین و زمان از انوار اہل اخلاص و ایمان معمور گردیدہ ، و محور گردون دوار از صیت مردان جنگ و پیکار و غازیان شہامت پر شور . . .

ما ایم دست بہ کار و دل بہ یار ، بسان سرو آزاد ، سبز در خزان و بہار، بہر زمان و مکان آئینہ دار جہال لایزال ، و تختہ مشق واردات فراق و وصال - ادعاے مراتب جان فشانی و اظہار مصایب و پریشانی ما ، کہ در وادی دور دست سرگردانیم و در

تمامی کوه و دشت بے سروسامان ، نہ جان در بدن داریم و نہ سر بر تن ، جگر پاش پاش و دل قاش قاش ، سینہ چاک و دستان غم ناک ، یک دست بہ دامانِ حبیب و دستِ دیگر بہ گریبانِ رقیب۔ امثالِ آن از حکایاتِ جور و لطف و شکایاتِ عشق و شور ، آن ہم در گوشۂ عافیت ، مجرد وہم و خیال ، فقط شعبدۂ قیل و قال ، و در میدانِ مردِ آزما سراسر ثبوتِ صد مقال و ظہورِ حقیقتِ حال۔ آن ہمہ چرب زبانی است ، و این ہمہ جان فشانی۔ آن ہمہ حکایات است و اخبار ، و این سراسر صداقت و اظہار ؛ آن ہمہ تکلف و تملق ، و این سراسر تحقیق و تخلق . . .

بالجملہ ، ما مردم تا جان در بدن داریم ، محض طالبِ رضاے حق ہستیم ، و از غیرِ او چشم وگوش بر بستیم ، و از دنیا و مافیہا دست برداشتیم ، و محض لوجہ اللہ علمِ جہاد افراشتیم . . . ما ایم برچند عاجز و خاکسار و ذرۂ بے مقدار ، بلاشک بہ محبتِ حضرتِ حق سرشار ، و از محبتِ غیرِ حق بالکل دست بردار۔

جہاد کے معنی :

جہاد کے معنی ہیں کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہای کوشش صرف کر دینا۔ یہ محض جنگ کا ہم معنی نہیں ہے۔ جنگ کے لیے تو 'قتال' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں ہر قسم کی جد و جہد شامل ہے۔ مجاہد وہ شخص ہے جو ہر وقت اپنے مقصد کی دھن

میں لگا ہو ؛ دماغ سے اس کے لیے تدبیریں کرے؛ زبان و قلم سے اس کی تبلیغ کرے ، ہاتھ پاؤں سے اس کے لیے دوڑ دھوپ اور محنت کرے؛ اپنے تمام امکانی وسایل اس کو فروغ دینے میں صرف کر دے؛ اور ہر اس مزاحمت کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آے ، حتلی کہ ، جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس سے بھی دریغ نہ کرے . . . .

جہادِ کبیر کے تین معنی ہیں : ایک، انتہائی کوشش ، جس میں آدمی سعی و جاں فشانی کا کوی دقیقہ اٹھانہ رکھے؛ دوسرے، بڑے پیمانے پر جد و جہد، جس میں آدمی اپنے تمام ذریعے لا کر ڈال دے؛ تیسرے جامع جد و جہد ، جس میں آدمی کوشش کا کوی پہلو اور مقابلے کا کوی محاذ نہ چھوڑے - جس جس محاذ پر غنیم کی طاقتیں کام کر رہی ہوں ، اس پر اپنی طاقت بھی لگا دے ، اور جس پہلو سے بھی حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہو کرے - اس میں زبان و قلم کا جہاد بھی شامل ہے ، اور مال کا بھی ، اور توپ و تفنگ کا بھی -

سید ابولاعلیٰ مودودی

اہلِ قلم سے جہادِ لسانی کا تقاضا اور اس کا اثر

غالب :

غالب کو درس دینے یا سننے سے طبعاً کوی مناسبت نہ تھی، مگر سید احمد شہید کی جس تحریکِ فکر و عمل سے انھوں نے خود کو ، شاہ اسماعیل کی خاطر ، جذباتی رشتے میں پرو لیا تھا ، وہ شعر و ادب کا مصرف ہی تحریک کے اغراض و مقاصد کی تبلیغ و اشاعت سمجھتی تھی - جو شاعر قلبی عقیدت و ارادت کا اظہار ، اور عملی شرکت سے معذوری ، ظاہر کرتا تھا ، اسے تاکید کی جاتی تھی کہ زبان و قلم سے تیغ وسپر کا کام لے ، جیسا کہ شاہ صاحب کے اس موکد ہدایت نامے سے ظاہر ہے :

'ازان جا کہ جنابِ ہدایت مآب در جہادِ لسانی و حمیتِ ایمانی . . . . مشغول اند . . . . بہ ہمین طریقِ مرضیہ و دعوتِ خفیہ و جلیہ ہموارہ ثابت القدم باشند ، و این کلامِ ہدایت التیہام بہ گوشِ ہوشِ (جاہیرِ اہلِ اسلام) رسانند . . .

---

[1] ہمی کنم بہ قلم کارِ تیغ ، و این کارے ست
شگرف ، و نغز ، و پسندیدۂ اولوالالباب

'ورود این زمان محمود و آوان مسعود را در حق ظہور اخلاص مخلصین و بہ روز ایقان موقنین بہ مشابہہ ورود موسم بہار در حق گل و بلبل و ایام برشگال در بارۂ اشجار و سایر نباتات تصور فرمانید۔ گلے کہ در موسم بہار نہ خندید، اورا بہ مشابہہ خار باید فہمید و دانہ' کہ در ایام برشگال نہ چمید، از درو آن الی ابد الا باد طمع باید برید؛ و درختے کہ آوان ربیع سرسبز نہ گردید، بسان ہیزم خشک او را از بیخ باید کند۔

خصوصاً صحایف افکار دانشوران عبودیت کیش و زبان آوران اخلاص اندیش این مضامین ہدایت آگین بہ نوک زبان برنگارند، و بہ چشم دوربین ایشان این عروس حجلہ نشین خمول را بہ زیور خوش بیانی بیا رایند۔ برذمہ' ایشان واجب، موکد و لازم متحتم است، کہ زبان عذب البیان را در باب ترغیب و ترہیب بکشانید، وسحی بلیغ در مقدمہ' وعظ و تذکیر بہ جان و دل بنمایند . . . . اگر حدت اذہان و قوت بیان امروز بہ کار نہ آید، ہیچ کار آمدنی نیست۔ سنان لسان در معرکہ' تقریر باید جنبانید، و کمیت قلم در میدان تحریر باید جنبانید۔'

' خامے سے کام لیجیے ہنگام فکر، شعر:

میدان کار زار میں گھوڑا اٹھایے
آتش، جہاد عشق پہ بیڑا اٹھایے

جن لوگوں کو اس جہادِ لسانی پہ ماسور و مکلف کیا گیا ، ان میں اس زمانے کے سارے قابلِ ذکر اہلِ قلم شامل تھے - بعض اللہ کے بندوں نے ، ادبی پہلو کو نظر انداز کرکے ، محض حصولِ ثواب کی نیت سے بھی یہ خدمت انجام دی - موضوعِ کلام جو تجویز کیا گیا ، اس کا تعلق امیر خان کی غداری پر غم و غصہ اور کھوی ہوی قوت و شوکت دوبارہ حاصل کرنے کی ولولہ انگیزی تھی ، جیسا کہ ان اشعار سے واضح ہو جاے گا :

بہزاد ، یک دلِ صد چاک عرض کر

چاکِ دل شانہ کشِ طرۂ تحریر آوے

آینے پہ آینِ گلستانِ ارم باندھ :
خوں کر دلِ اندیشہ ، و مضمونِ ستم باندھ

نالاں ہو ، اسد ، تو بھی سرِ راہ گزر :
کہتے ہیں کہ تاثیر ہے فریادِ جرس کو

اشک چناں بے اثر : نالہ چنیں نارسا :
دیدہ و دل را سزد ماتمِ ہم داشتن

افسانۂ شادی را یکسر خطِ بطلان کش
غم نامۂ ماتم را آرایشِ عنوان شو

سوخت آتش کده ، ز آتش نفسم بخشیدند :
ریخت بت خانہ ، ز ناقوس فغانم دادند

ہرچہ از دست گہِ پارس بہ یغما بردند
تا بنالم ہم از ان جملہ ، زبانم دادند

چون جرس ، کان را بہ تارے بستہ آویزان کنند
نالہ می خیزد ، چو می جنبد دلِ درد آ مے من

جان بر نمی تابد ، اے دل ، ہنگامۂ ستم را :
از سینۂ ریز بیرون ، مانندِ تیغ ، دم را

بہ فغان آے ، و شورِ محشر باش
سینہ را تیغ و تیر و خنجر باش

اندازِ بیان کے بارے میں حکم ملا :

موقوف کیجیے یہ تکلف نگاریاں[1]

---

[1] بس عبارت ہو چکی ، مطلب پہ آیا چاہیے
آتش

سید صاحب کے ایک مکتوب میں 'عبارت آرای' کی مذمت کی گئی ہے:

'مرا خود می دانند، کہ از جنس شعرائے خیال بند و فصحائے بلاغت پیوند کہ، بنا بر مجرد عبارت آرای و الفاظ پیرای، چندے از کلمات لطیفہ جمع کنند، و خیالات نازک در آن ودیعت می نہند، و لذت خیالیہ ازان برمی گیرند، نیستم۔'

یہی خیال ایک اور خط میں ملتا ہے:

'(مرا) از قبیل مخیلات شعرا و نکت بلغا دہ۔ محض بنا بر زبان آرای و عبارت پیرای، در سلک تحریر می کشند، نہ شمارند۔'

شاہ اسماعیل نے ''منصب امامت'' میں 'اقرار لسانی' اور 'تصدیق قلبی' میں اور 'اقوال اہل تکلف و تصنع' اور 'افعال اہل صدق و اخلاص' میں امتیاز کیا ہے۔ وہ خود 'تملق سخن آرای' اور 'تکلف انجمن پیرای' سے 'بیزار' اور 'در پردۂ حیلہ بازی و سخن سازی'، 'کنایات چرب زبانان تکلف کیش' سے 'دست بردار' ہیں۔ شاید ہی کوی شاعر ہو جو کم و بیش اس تادیب کی زد میں نہ آتا ہو۔ شاہ صاحب کی اپنی فارسی نثر عموماً مکلف اور، بعض اوقات، مرصع ہے۔ البتہ اردو نثر میں، جس کے مخاطب عوام تھے،

روزمرہ کا چٹخارا بھی ہے ، اور مطالب بڑے دل نشین انداز میں ادا ہوئے ہیں - شاہ صاحب کے بعض مصلحانہ عقاید کے علاوہ ، سید احمد خاں پر اس اسلوب کا بھی اثر پڑا ہے - اُن کے دل و دماغ میں شاہ صاحب کی کتنی قدر و منزلت تھی ، اس کا اندازہ ان متعدد عقیدت مندانہ القابوں سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ''آثار الصنادید'' کے اولین نقش میں اُن کی نسبت استعمال کیے ہیں - ان میں سے کچھ یہ ہیں :

'جامع کمالاتِ صوری و معنوی' : 'موسسِ اساسِ کمال' : 'مہذبِ اوضاعِ حال و قال' : 'سالکِ مسالکِ ہدایت و ارشاد' : 'مجلیِ آینہ' صافی اعتقاد' : 'مرکز دایرۂ علوم' : 'غوامضِ معقول و منقول' : 'مثبتِ دلایلِ دین : 'جابدِ حق و یقین : کام رو اے طبایعِ افاضل' : 'پیشواے ادانی و اعالی'

سید احمد خاں کی نظر میں :

'خلق ہونا ایسے فردِ کامل کا نمونہ قدرتِ ربِ ذوالجلال کا سمجھا جاوے -'

سید صاحب اور شاہ صاحب کی ہدایات کی تعمیل ان کے ارادت مند شاعر اپنی بساط کے مطابق کرتے رہے - غالب نے یہ فرض مختلف شعری سطح کا کلام موزوں کر کے ادا کیا ، جس

کے کچھ نمونے یہ ہیں :

زود آ، کہ فیضِ مقدمِ ہم نامِ مصطفے
آفاق را طراوتِ باغِ جنان دہد

در شحنگی گزاف نوایانِ کفر را
پاسخ ز تر زبانیِ نوکِ سنان دہد

در رہ روی چراغِ شبانانِ راغ را
روغن ز پیہ گردۂ شیرِ ژیان دہد

ماہ و خورشید[1] دریں دایرہ بے کار نہ اند :
تو کہ باشی، کہ بہ خود زحمت کارے نہ دہی؟

---

[1] شاہ صاحب اور سید صاحب ،
جو غالب کے شعری شعور میں اتنے سمائے ہوئے ہیں :
پر تو مہر و مہ است نور بہ چشم اندرون
از تابِ مہر و پر تو ماہ است پود و تار
آتش بھی ان کے لیے یہی نشان کام میں لائے ہیں :
یہ جلوۂ مہ و خورشید سے کھلا، آتش!
ہنوز باقی ہے دورِ فلک میں جامِ قدح
روز و شب جامِ مہ و خورشید یاں گردش میں ہے
ہم اس مے خانے کے ہیں مست، آتش!
کہ جس کے ہیں دو ساغر : چاند، سورج
کچھ تو ہمیں حقیقتِ شمس و قمر کھلے:
کس کج کلہ کے عشق میں پھرتے ہیں سر کھلے؟

تن بہ بندِ خمِ فتراکِ سوارے نہ دہی ؟

آخر کار نہ پیداست کہ در تن فسرد
کفِ خونے کہ بدان زنیتِ دارے نہ دہی ؟

رہ زنانِ اجل از دستِ تو گیرند ناگاہ
نقدِ ہوشے کہ بہ سودائے بہارے نہ دہی

وائے گر جان بہ سرِ راہ گزارے نہ دہی !

بہانہ جوے مباش ، و ستیزہ کاربیا

ہمت ز دمِ تیشۂ فرہاد طلب کن[1] :
مجنون مشو ، و مردنِ دشوار میاموز

اس قسم کی تلقین تو غالب کے مزاج کے موروثی عنصر پر چنداں گراں نہ تھی ، مگر پیر و مرشد کے کچھ مطالبے ایسے بھی تھے ، جو ان کے دیرینہ معمولات کے سراسر منافی تھے :

ادب ورز ، دین جوے ، و آیین گزین :
بہ فنِ سخن شیوۂ دین گزین

---

[1] شوریدہ ادائے بہ دمِ تیشہ روان داد
(یہ 'شوریدہ ادا' شاہ اسمٰعیل شہیدہیں)

بدان ترانہ کہ ممنوع نیست ؛ مستی کن

در حلقۂ ما رقصِ دف و عود نہ یابی

مے خانۂ توفیقِ خم و جام نہ دارد

در بزمِ ما ز تنگی پیمانہ جا نہ دارد

او باش را بہ بزمِ شہنشاہ بار نیست

روے سخن بظاہر بہادر شاہ کی بزم سے ، مگر[1] در حقیقت سید صاحب کی بارگاہ سے ہے ، جس سے اپنے اخراج کا تاثر انھوں نے دو مختلف لہجوں میں ظاہر کیا ہے :

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے ، غالب !
ہم بھی گیے واں ، اور تری تقدیر کو رو آے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آے ہیں ، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

---

[1] غالب کو اپنی بعض نازیبا خلافِ وضع حرکتوں پر جو برا بھلا سننا اور سہنا پڑتا تھا ، اسے وہ کبھی کبھی ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کرتے تھے ۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اصلاحِ نفس اور شعری مافیہ کی مجوزہ پابندیوں سے غالب پر جو کیفیت گزری ، وہ انھوں نے کھل کر بیان کر دی ہے :

اس قدر تنگ ہوا دل ، کہ میں زنداں سمجھا

دلم در کعبہ از تنگی گرفت : آوارہ اے خواہم
کہ با من وسعتِ بت خانہ ہاے ہند و چین گوید

کلام سے پتا چلتا ہے کہ جو 'پیمانِ وفا' وہ نادانی سے باندھ بیٹھے ، اس کے شکنجے سے چند ہی روز میں عاجز آ گیے :

بستنِ عہدِ وفا ہمہ نادانی تھا :
چشمِ نکشودہ رہا عقدۂ پیماں مجھ سے

مجبوری ، و دعواے گرفتاریِ الفت :
دستِ تہِ سنگ آمدہ احرامِ وفا ہے

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

مگر اس زہر خند کے نفسی مصرف کو وہ خوب سمجھتے تھے :

تا گشتہ خود نفرین شنو، تلخ است برلب خندہ اش:
زہرے کہ پنہاں می خورد ، پیدا نہ تریا کش بہ بین

ہے اسیرِ ستم کشِ مکشِ عہدِ وفا
دلِ وا رفتہ ، کہ بیگانۂ ہر مذہب تھا

ان سے شراب چھوڑنے کا عہد بھی لیا گیا ، جو انھوں نے

من کہ مستم، چہ شناسم کہ چہ بستم پیماں؟

پیماں سے ہم گزر گیے ، پیمانہ چاہیے !

کے مستانہ نعرے لگا کر چکنا چور کر دیا :

تونے قسم مے کشی کی کھای ہے ، غالب !
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

اسی طرح اپنی بعض اور عادتوں سے بھی ، جو ان کے متقی اور پرہیزگار ممدوح و محبوب کے حلقے میں 'اوباشی' شمار ہوتی تھیں ، وہ دست کش نہ ہو سکے - الغرض ،

تو پارسا طلبی عاشق ، و من آن رندم
کہ مے بہ حلقۂ اوباش آشکار کشد

' دل گرفتار ، بہ این وسعتِ مشرب، شدہ است
ظہوری

اپنی خلافِ وعدہ 'بے اعتدالیوں' پر وہ برابر تاسف بھی کرتے رہے :

کرد یادش در صفِ اوباش دوشم شرمسار

انھوں نے اپنے اسلوبِ زندگی کا بے دھڑک اعتراف بھی کیا ہے، اور اس کا جواز بھی پیش کیا ہے :

'مرا می رسد مے کشیدن ، و غزل سرودن ، و آزادہ زیستن ، و حلقہ بر در زدن ، نہ خون خوردن ، و دبستان کشودن ،[1] و دل تنگ بودن' :

ہموارہ ذوقِ مستی و لہو و سرور و سور
پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار

بہ مستیِ شبینہ و خوابِ سحر گہی :
رنگینیِ سفینہ و اشعارِ آب دار

بہ بزمے کہ در وے بود اجتناب
ز رود و سرود و شراب و کباب

سخنور چہ گفتار پیش آورد
کہ زان رنگ بر روے خویش آورد ؟

---

[1] یہ ان کے روحانی اتالیقوں کی اس معلمانہ تاکید کا جواب ہے :
آوازۂ معنی را برسازِ دبستان زن

بڑی معصوم معقولیت سے پوچھتے ہیں کہ جو شاعری ان لوازم سے محروم ہو کر کی جائے ، اس میں آب و رنگ کہاں سے آئے ؟

شیفتہ :

شیفتہ/حسرتی کے وظیفۂ شعر کے تصور میں بھی سید صاحب اور شاہ صاحب کی کارفرمای صاف جھلکتی ہے :

ساقی ، پلا وہ بادہ کہ غفلت ہو آگہی :
مطرب ، سنا وہ نغمہ کہ ہو جس سے حال قال

آ ، نغمہ گر ہو ، چرخ میں لا آفتاب کو :
آ رقص کر ، زمین کو ڈال اضطراب میں

ہرگز نہ چہچہائے چمن زارِ شوق میں
جو مرغ آتشیں نفس و شعلہ دم نہیں

ساقی بہ بادہ جادۂ ما را نشان دہد :
مطرب بہ نغمہ باز نماید مقام را

ساقی ز تصرف بہ قدح ریخت شرر را :
مطرب بہ فسون خواند ز ہر گوشہ اثر را

گفتند کہ جانان خوش و جان خوش تر ازین ہم
حرفے ست خوش ، اے ہم نفسان ، خوش تر ازین ہم!

احیاے دلِ مردہ نماید نفسِ تو
ہاں ، حسرتیِ سحر بیان ، خوش تر ازین ہم

مطرب ، بہ رخِ نواے بسمل
جلبابِ نے و رباب تا کے ؟

بے پردہ حدیثِ عشق سر کن :
از شعر و غزل نقاب تا کے ؟

بیا ، اے خوش نوا مطرب ، کہ ما را ہم بجنبانی
کہ یاران در ہواے کعبہ بر بستند محمل ہا

تحریک سے وابستگی کی حقیقی حدود :

دل دیں گے ، مال دیں گے ، مگر جانِ سو بخیر!
بیہودہ ہے وہ شخص جو سرگرمِ لاف ہو

آتش :

خالِ مشکیں سے شکار اہلِ قلم کو کیجیے

فقیر بن کے قدم مار اس میں ، اے آتش !
طریق احمدِ مرسل سی شاہ راہ نہیں

خامے سے کام لیجیے ہنگامِ فکرِ شعر
میدان کارزار میں گھوڑا اڑھایے

آتش جہادِ عشق پہ بیڑا اٹھایے

منزلِ مقصود کی ہر سطرِ دیواں جادہ ہو

حیف ہے راہِ خدا میں نہ ہو ان سے کوشش !
دستِ قدرت نے بنائے ہیں بے کار قدم

جادۂ راہِ محبت کو خطِ مسطر جان :
سر کے بل، مثلِ قلم چل ، جو ہوں بے کار قدم

شیر کی آواز پیدا ہووے نے کے نالے میں

دکھلای دے جو آنکھوں کو یوسف کا کارواں
چلایے ، جرس کی طرح سے پکارے !

بے خبر سوتے جو ہوں ، ان کو جگایا چاہیے

سینہ مرا مقام ہے مردِ شہید کا

نعرہ زن گنجِ شہیداں میں ہوں ، بلبل کی طرح
آبِ آہن نے کیا ہے یہ گلستاں پیدا

مل آنکھ کو ، خواب سے بیدار ہو ، غافل !
حاضر لیے آیینۂ خورشید سحر ہے

تیری خوش قسمتی کا افسانہ سناتا ہوں میں :
خوابِ خرگوش سے آہو کو جگاتا ہوں میں

ساقیِ مے کدہ نے مجھ کو یہ خدمت دی ہے :
نشے میں مست جو گرتا ہے ، اٹھاتا ہوں میں

برگشتہ طالعی کا تماشا دکھاوں میں :
گھر میں لگے جو آگ تو پانی بجھاوں میں

مردے کی طرح ، سوتے ہیں کیسے مرے نصیب !
ٹھوکر سے پائے یار کی ان کو جگاوں میں

تحریک سے تعلق کی اصلی نوعیت :

ظاہر میں گرچہ کاہ ہوں ، باطن میں کوہ ہوں

تُرکِ خوں خوار ہے یار ، اور میں مسکیں شاعر
تیغ مقصود اسے ، جوہر سے مجھے مطلب ہے

دل سے دشمن سے رہی جنگ ہمیشہ درپیش :
نہ زرہ پہنی کبھی میں نے ، نہ باندھا تعویذ

اڑ کے پہنچا ، مددِ جوشِ جنوں سے واں تک
پاوں پر اپنے میں دیوانہ بیاباں نہ گیا

اپنے زمانے کے شاعروں اور شاعری پر
شاہ صاحب کا محاکمہ

'تحصیلِ مہارت در فنِ شعر مثلاً بہ چند وجہ می باشد : بعضے اشخاص بنا بر نیتِ نیک مہارتِ آن فن حاصل می کنند ... و بعضے بنا بر تحصیلِ تعلی و ترفع و استکبار و تحقیرِ سادہ لوحان بہ این اشتغال می کنند ، و بہ این وجہ بہ نسبتِ ایشان از اقبح معاصی شمردہ می شود ؛ و بعضے بنا بر قضاے شہوتِ لسانی بہ ذکرِ محاسنِ نساء و امارد و بیانِ خط و خال و غنج و دلال و ناز و انداز و شراب و کباب و چنگ و رباب و بیانِ اوضاعِ اغلام و جماع و رقص و سماع و امثالِ آن از امورِ مہیجۂ شہوت بہ آن اشتغال می نمایند ، و بہ این وجہ بہ نسبتِ ایشان از قبیلِ زناے لسانی شمردہ می شود ؛ و بعضے بنا بر التذاذ بہ نفس ادراکِ مضامینِ نفسیۂ مخیلہ و معانیِ عمیقۂ مولفہ و اشاراتِ دقیقہ و کنایاتِ خفیہ و متانتِ عبارات و سلاستِ محاورات و جزالتِ تراکیب و لطافتِ تشبیہات و رشاقتِ استعارات و عذوبتِ الفاظ و خوبیِ استخوان بندی و رعایتِ صنایعِ لفظیہ و معنویہ و امثالِ آن از امورے کہ تعلق بہ بلاغت و فصاحت دارد ، بہ آن اشتغال

می نمایند ، و رازِ التذاذِ ایشان ہمین امورِ مذکورہ است ، نہ مضمونِ خاص از مضامین ، بلکہ ہر مضمون کہ لیاقتِ جریانِ امورِ مذکورہ داشتہ باشد ، ہمان مضمون جولان گاہِ افکارِ پریشان است ، خواہ از بابِ مناجات و نعت و منقبت باشد ، خواہ از بابِ ہجو و مدح ، و خواہ از بابِ مضامینِ شوقیہ باشد ، خواہ بہاریہ و خواہ سیرِ انبیا باشد ، خواہ قصصِ اولیاء ، خواہ حکایتِ صالحین باشد ، خواہ افسانہاے سلاطین ، الغرض ایشان را از تلفیقِ کلامِ خود غیر از لذتِ خیالیہ چیزے دگر غرض نہ می باشد ۔ حالِ ایشان در حرکتِ خیالیہ مثالِ سفرجانِ بستانین است کہ ایشان را بہ جاے رسیدن منظور نہ می باشد ، بلکہ مقصودِ اصلی نفسِ حرکت می باشد در ضمنِ ملاحظۂ الوانِ مختلفہ و اشکالِ رنگا رنگ بہ ہر سمتے کہ متحقق شود ، و بہ ہر بوستانے کہ گزر افتد ۔

بایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح ، ۱۰۹-۱۱

(کتب خانۂ اشرفیہ ، دہلی)

شاہ اسماعیل شہید کی "منصبِ امامت" کی بعض ترکیبیں

شعلۂ ایمان : برقِ یقین : نورِ ایقان و حکمت : صاحبِ ملکۂ اجتہاد : اہلِ تحقیق : اہلِ تدقیق : طریقِ تحقیق : طریقِ انفراد : طریقِ اجتماع : فکرِ دقیق و نظرِ عمیق : قوتِ نظر : دقتِ نظر : تحقیقِ مفہومات : طریقِ رمز و اشارہ : دلایلِ عقیلہ : طریقۂ استدلال : اہلِ وجدانِ سلیم : بنا بر آیینِ اسلاف ، محض بر سبیلِ رسم و عادت : علمِ تقلیدی : درنفس الامر متحقق : اقرارِ لسانی : تصدیقِ قلبی : مومنِ حقیقی : مومنِ حکمی : راہِ قیل و قال و بحث و جدال : تحقیقِ بے حاصل و تدقیقِ لاطایل : چراغِ امامت در شیشہ خلافت : امام المجادلین : امام الداعین : جوش زدنِ غیرتِ ایمانی و حمیتِ اسلامی و میلِ نہب و کار زار : آرزوے حصولِ سلطنت و توقعِ اجتماعِ عساکرِ مسلمین : تقلبِ احوال و ادوار ، و تحولِ اقبال و ادبارِ سلاطین ، و انقلابِ حالاتِ اغنیا و مساکین : اصلاحِ عالم و انتظامِ بنی آدم : حکومتِ جابرہ: اربابِ تعدی و جور : مسکینِ ذوی الاضطرار : سلطنتِ عادلہ : وفورِ رحمت و شفقت : اصلاحِ حالِ معاشیہ : رفعِ مفاسدِ ظالمِ متعدی : پاداشِ تعدی : ہلاکِ کسریٰ و قیصر و تملکِ خرامنِ ایشان ۔

غالب کی بعض ترکیبیں

(تحریکِ جدوجہاد کے سیاق و سباق میں)

موضوع کے اشارے :

'ساز' : سازِ دو عالم : سازِ بینش : سازِ درویشی : سازِ ایمائے فنا : سازِ جاں ستانی : سازِ ہنگامہ

'نقش' : نقشِ بوریا : نقشِ مریدی : نقشِ داد و دانش و دین : نقش بندی ہائے دہر

'معنی' : معنی نمائے جدوجہاد : معنیِ آزادی

'نغمہ' : نغمہ' چنگِ خمیدہ : نغمہ' وجود و عدم

امیر خاں کی سراگی :

واماندگیِ وحشت : خمارِ صحرا : خانہ خرابِ صحرا : عجزِ تنک حوصلہ : حوصلہ' نارسا : وداعِ حوصلہ : ننگِ ہمتِ باطل : زبونیِ ہمت : عجزِ ہمت : عقدۂ پہلوئے عجز : شکستنِ طرفِ کلاہ : ہنگامہ' عرضِ سپاہ

تحریک کے کارفرما محرکات :

احیائے رسمِ جدوجہاد : شوقِ سبک تازِ شہادت : سعیِ آزادی : رہ و رسمِ کشور کشای : کارسازیِ او رنگ: فروغِ دینِ اسلام : رونقِ دینِ محمدی : ناموسِ شریعت : غیرتِ دین : سرگرمیِ دین : اقبالِ ایماں و نیروے دین : فروغِ دانش و داد : درخشندگیِ جوہرِ عقلِ فعال : دعویِ وجود : دعویِ طاقت : دعویِ گرم خونی : دعویِ آرایشِ سر و دستار : حوصلۂ نشو و نما : فرمانِ فزونی ہاے زور : فرمانِ سرفرازیِ مشتِ غبارِ خویش : جوشِ طوفانِ آرزو : جوشِ خونِ آرزو : جوشِ ویرانی : جوشِ پریشانی : اضطرابِ سرکش : جوشِ خیرہ سری : دردِ طلب : حسرتِ تعمیر : تعمیرِ جہاں -

سید صاحب کا 'جلوہ' :

جلوۂ برقِ فنا : برق زارِ جلوہ : صلاے جلوہ : جلوۂ ریگِ رواں

'نظر' : درسِ نظر : کیمیاے نظر : شعبدۂ جذبِ نظر

'نگاہ' : شورش افزا نگہِ حوصلہ کاہ

'عشق' : عشقِ نبردپیشہ : عشقِ خوننابہ مشرب : عشقِ یک رنگ کنِ بندہ و آزاد : شررِ رخشندۂ عشق

شاہ صاحب کا 'حسن' :

جلوۂ حسنِ غیور : جلوۂ بے باکِ حسن : جلوۂ حسنِ برشتہ

غالب پر تحریک کا اثر :

ذوقِ تمنائے شہادت : دعویِ ذوقِ شہادت : مذاقِ فقر مشربِ مہدی : مذاقِ دردِ اسیری : ذوقِ اندازِ پر افشانی : بیداریِ دل : زندگیِ دل : روشنیِ دل : نشاطِ دیدۂ بینا : نشاطِ مستیِ حق: نشاطِ گرمیِ تصور : نیروئے دل : خون گرمیِ دل : شعلہ خیزیِ دل : جوشِ نفس و ولولۂ شوق : سعیِ جلوہ اندوزی : سعیِ نظر : سعیِ خرام : سعیِ خیال : سعیِ قلم

غالب کا احساسِ ناتمامی و نارسی :

نو آموزِ فنا : دور گردِ ذوقِ فنا : ناتمامیِ ذوقِ فنا : گردِ کاروانِ فنا : کوتاہیِ نشو و نما : پست حوصلگیِ طمع ہائے خام : صعوۂ بے بال و پر : دلِ بے دست و پا افتادہ : وحشت پرستِ گوشۂ تنہایِ دل : عجزِ تن آسانی : شرمِ نا رسای : خجلت گداریِ نفسِ نا رسا : نا تمامیِ نفسِ شعلہ بار : دلِ ناسوختہ : داغِ ناتمامی : سرخوشِ غفلت : غفلتِ افسردگی

'کشمکش' : اسیرِ کش مکشِ دامِ وفا : کش مکشِ رد و قبول : غمِ کارزارِ نفس

'پیچ و تاب' : صیدِ دامِ پیچ و تابِ شوق : پیچ و تابِ عجز : پیچ و تابِ ہوس : پیچ و تابِ آز

تحریک اور محرک کے بارے میں مولوی فضلِ حق کا نقطۂ نظر :

وہمِ ضعیف و غمِ دو عالم : وہمِ توانای : جنوں جولاں ، گدائے بے سر و پا : سعیِ بے سر و پای : سعیِ ہرزہ : شرِ و شورِ آرزو : آلایشِ غوغا : وہمِ وجود : آلایشِ پندارِ وجود : بیابان نوردِ وہمِ وجود

٦

غالب کے مزاج اور فن کے بعض متعلقہ پہلو

غالب کی خود شناسی :

اپنے مزاج اور کلام کا کوئی متنوع، غیر ہم آہنگ پہلو نہیں جس میں غالب کو پوری بصیرت نہ ہو، اور جس کی نشان دہی انھوں نے نہ کی ہو۔[1]

'غالبِ حق پرست' :

'من، کہ جز راستی بہ دلم نہ نشیند، و جز راست بہ زبانم نہ گزرد۔'

'جز راستی نہ جویم، و جز راست نہ گویم'

[1] اس نے ایک منتشر زاویۂ نگاہ کے سائے میں منتشر زندگی بسر کی، اور ہمارے لیے ایسی شاعری چھوڑی جو خود ہم آہنگی سے معرا ہے، (ڈاکٹر سید عبداللطیف : 'غالب کی شاعری') 'غالب نے خارجی حالات سے زیادہ داخلی طور پر ستیزہ کاری کی اور اپنی ذات سے نبرد آزما رہے۔ ان کا سوانح نگار آج ان کی زندگی کا کوئی ایسا ناقص پہلو بیان نہیں کر سکتا ہے جسے خود انھوں نے ہدفِ ملامت نہ بنایا ہو۔ (ڈاکٹر وارث کرمانی : 'غالب کی شخصیت اور فن')

'اسد اللہ آسیمہ سر' آشفتہ رائے' :

'ناساز گاری منش ، و آشفتگیِ رائے ، و تنگیِ دل ، و پراگندگی اندیشہ ، و تیرگی ہوش ۔'

'ہاں ، اسد اللہ ! . . . . اے بہ کیش تیرہ و بہ دانش تباہ ، دلت ، از تابِ ناروا اندیشہ ، خون ، و زبانت ، بہ کیفرِ بے مزہ گفتارہا ، از قفا بیرون باد !'

کجی وراستی کی یک جای :

'شرمندۂ وہمِ غلط کارِ خویشم . . . . للہ الحمد ، کہ ہنوز سررشتۂ فیضانِ رحمانی از مشتِ خاکِ تیرۂ من منقطع نہ گردیدہ ۔'

'ہر آینہ اہرمن پرست و کافرستم ، سرچشمۂ نورِ درخشندہ ہور بہ نزدیک و دور بخشندۂ سور است ۔'

کلام :

'بستنِ این گل ہائے خرزہرہ آہنگِ خود آرای و اندازِ انگشت نمای دارد' ۔ 'نامۂ اعمالِ نکو کارانِ خدا پرست ۔ ۔ ۔ ۔کار گاہِ خیالِ ہوس ناکانِ شاہد باز ۔'

ظاہر و باطن میں تفاوت کا اقرار اور زبانی جمع خرچ پر گرفت :

'رہ روِ بے توشۂ وادیِ گفتار ، غالبِ نیمہ دیوانہ ، نیمہ ہشیار !'

'اے مسلمان زادۂ کافر ماجرا ، وائے شایستۂ نفت و بوریا !
اے بر زبان جہان جہان شورِ غریو ، وائے بہ دل اہرمنستانِ رنگ و بو !'

غالب نے اپنی 'دردنی آویزش ، کا بھی بار بار ذکر کیا ہے :

'فرو ماندۂ کشاکشِ خیالم' :

'مرا ، کہ پیکِ خیال در بدر است ، و سر رشتۂ گفتار گرہ در گرہ : دریں کش مکش ، کہ درون و برونِ مرا درہم دارد : ہمہ درہم سرشتم : ہیہات ! دل از غصہ صد جا در گرو است ، و خاطر باہزار اندیشہ در جنگ : دلے بہ ہزار غصہ در ستیز ۔ ۔ ۔ ۔ ہر قدر می جوشم، کہ دامنِ جہدِ آوارگی بہ کمر زنم ، دستِ قدرت زیرِ سنگ آمدہ است : دلم از تفرقۂ امید و بیم ریش ۔

ان اقتباسات کے بعد کیا اس میں ذرا بھی گفتگو کی گنجایش رہ جاتی ہے ، کہ غالب کو اپنی ہر نفسی اور ذہنی روداد اور کیفیت

کا پورا شعور تھا ، وہ اس کی معروضی چھان بین پر قادر تھے اور ، اس بصیرت کی رو سے ، خود کو شکنجے میں کسنے سے دریغ نہیں کرتے تھے ؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر محمد اجمل نے ، جو علم النفس کے نظری اور عملی پہلوؤں میں دخل کے علاوہ ، شعر و ادب سے بھی سروکار رکھتے ہیں ، یہ حکم کس بنا پر لگایا :

'اب کوئی بیس برس سے غالب کا جادو ٹوٹتا جاتا ہے ۔ اب اس کی انانیت میں خود فریبی اور خود ناشناسی کا پہلو زیادہ معلوم ہوتا ہے ۔'

یک رنگی و رنگا رنگی میں آویزش

غالب کے بعض افکار اور جذبات اور ان کی زندگی کے معمولات میں جو وسیع و عریض خلیج حایل تھی ، اسے پاٹنا ان کے بس سے باہر تھا ۔ عملی 'یک دلی' اور 'یک رنگی' کے تقاضے ان کی 'خاطرِ منت پذیر' ، 'خوے نازک'، اور 'نہادِ نرم' سے بھلا کیسے پورے ہوسکتے تھے ؟

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گران نہ بود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نہ خواست

یہ جان لیوا 'صنم' شاہ اسماعیل میں جو ، سید صاحب کے فرمان کے بموجب ، ان سے اس قسم کے سنگین مطالبے کرتے رہتے تھے :

'از دوروی بیزارم'[1] و از پاس داریِ غیر حق دست بردار . . کسے کہ بامن راہِ اتحاد می پوید و رابطۂ اخلاص با من جوید . لازم کہ بہ رنگِ عبودیتِ خالصہ رنگین شود ، و بہ متانتِ استقامتِ سنگین بامن خواجہ تاشی کند ، و از اوباشی اجتناب ورزد - ہر کہ خواہد کہ از حق علاقۂ تعلق

---

[1] بس کہ در عہدِ تو فرجام دو بینی برخاست
فرمانِ او از بس کہ نہد رسم یک دلی

بگسلد ، و بامن رابطۂ تعلق پیوندد ، و بہ باموﻻے من بنیادِ مخالفت نہد ، و کفار نابکار و بندۂ عبودیت شعار را در سلکِ یک موافقت کشد ، پس ہرگز این امر گذشتنی شدنی نیست ۔'

دوست کے اس فرمان سے سرتابی پر شرمساری کا اظہار غالب ساری عمر کرتے رہے :

فریاد زان شرمندگی ! کارند چون در محشرم
گویند : اینک خیرہ سر، کز دوست فرمان خوش نہ کرد

گویند : صنعان توبہ کرد از کفر : نادان بندہ اے
کز خود فروشی ہاے دین بخشش زیزدان خوش نہ کرد

اپنی اس محرومی کا قلق تو انھیں ہمیشہ رہا ، مگر قایم وہ بڑی استواری سے اسی 'شیوۂ رندانِ بے پروا خرام' پر رہے جو انھوں نے اختیار کر لیا تھا ۔ ان کا یہ دعویٰ کہ وہ 'دنیا داری کے لباس میں فقیری' کرتے ہیں ، ایک اعتبار سے بالکل ساقط تو نہ تھا ، مگر ان کی 'دنیا داری' میں 'فقیری' تبرکاً ، یا چاشنی کی خاطر ، آٹے میں نمک کے برابر تھی ۔ 'فقیری کا بھیس بنانے ، سے ان کی ایک غرض ، بقولِ خود ، 'اہلِ کرم' کا 'تماشا' دیکھنا بھی تھی ۔

غالب قایل تو دل سے اس گفتار کے تھے کہ 'با کردار پیوندش

بود ، اور ایک جگہ ، ظہوری کا سہارا لے کر ، غالباً عالمِ سرخوشی میں ، ایک بڑا بول بول گیے ، جو ان کے اعمال سے مطابقت نہیں رکھتا :

غالب از صہبائے 'اخلاقِ ظہوری' سرخوشیم :
'پارۂ بیش است از گفتارِ ما کردارِ ما'

اس کڑے معیار پر شاعر تو الگ رہے ، اس وصف کے بڑے بڑے دعوی دار بھی کم ہی پورے اترتے ہیں -

غالب خوب سمجھتے تھے کہ 'فقر و فنا ، کا محض دم بھرنا کافی نہیں :

می زند دم ز فنا غالب ، و تسکینش نیست :
بو کہ توفیق ز گفتار بہ کردار برد !

اس توفیق سے بہرہ مند نہ ہونے کی ایک وجہ انھوں نے یہ بھی بتای ہے :

ذوقِ مےِ مغانہ ز کردار باز داشت

مگر اصل وجہ یہ تھی کہ وہ 'رسم و رہِ فنا' کے تصور سے ، بقولِ خود ، 'مدہوش' تھے ، اس پر عمل پیرا نہ تھے - قدر تو ان کے دل میں 'زبانِ کوتاہ و دستِ دراز' کی تھی ، مگر اپنی کوتاہ دستی کی تلافی وہ بھی ، اور سب شاعروں کی طرح ، اپنی قوی

زبان سے کرتے رہے :

چون مرا نیست دست گاہِ ستیز
چون مرا نیست رسم و راہِ مصاف

می کشایم لب بہایا ہائے :
می کشم خنجرِ زبان ز غلاف

مسلکِ جد و جہد سے ہم نوای کا دعویٰ تو وہ بڑے زور شور سے کرتے تھے ، مگر اس دعویٰ کی حقیقی نوعیت آن سے چھپی ہوی نہ تھی :

آشیان ساختہ کنجشک سرِ پنجۂ باز
چشمِ شاہین شدہ در پاے کبوتر خلخال !

خود ان کی نظر میں یہ عمل گویا 'بالِ کبوتر' پھڑ پھڑا کے بجلی پیدا کرنے کی کوشش تھا :

برق از نوردِ بالِ کبوتر برآورم

آتش بہ ژندو مو بد و برسم در افگنم :
گرد از بت و برہمن و بت‌گر برآورم !

بت شکنی کا یہ جارحانہ رنگ ان کے رنگا رنگ مزاج کا ایک چلتا پھرتا ، آتا جاتا رنگ تھا ۔ یہ دوسرا رنگ بھی ان ہی کا ہے:

خوش بود فارغ زبند کفر و ایمان زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلمان زیستن !

شادم ، کہ برانکار من شیخ و برہمن گشتہ جمع
کز اختلاف کفر و دین خود خاطر من گشتہ جمع

جز سخن ، کفرے و ایمانے کجا ست ؟
خود سخن در کفر و ایمان می رود

سر از حجاب تعین اگر برون آرد
چہ جلوہا کہ بہ ہر کیش می توان کردن !

جب تک غالب کے جسم و جان اور زبان میں دم رہا ، وہ 'دیوانگی و خیرگی و شوخی و آز ، سے باز نہیں آے ؛ مگر اس میں بھی کوی کلام نہیں کہ شروع سے آخر تک ان کی شاعری میں وہ جذبہ بھی برابر ابھرتا رہا جس کا سرچشمہ داعیان جد و جہد ، بالخصوص ان کے 'نگار سادہ ، شاہ اسماعیل تھے ۔!

'جو لوگ عمیق ترین جہنم میں بستے ہیں ، ان سے زیادہ پاکیزہ آہنگ سے کوی نغمہ سرا نہیں ہوتا' کافکا

'تم نے وہ ہسپانوی مثل سنی ہے ؟ 'خدا ٹیڑھی ترچھی لکیروں سے سیدھا لکھتا ہے ۔ جہاں تک آرٹ کا تعلق ہے، اس کے سوا چارہ بھی نہیں ، چونکہ سیدھی لکیریں ورق پر کوی نشان نہیں چھوڑتیں'
اوڈن

خویش را سرمست و رسوا خواستیم

ہم بہ خواہش قطعِ خواہش خواستند
عذرِ خواہش ہائے بے جا خواستیم

قطعِ خواہش ہا زما صورت نہ داشت
ہمت از 'غالب' ہمانا خواستیم

غالب نے اپنے ایک فارسی خط میں لکھا ہے :

'گویند در عرب دلاورے بود طاہر نام ، کہ درکار زار بہ ہر دو دست یکسان تیغ می‌زد ۔ آن را 'ذوالیمینین' می‌خواندند ۔'

غالب نے اپنے مکتوب الیہ کو ، از راہِ تکلف ، 'ذوالیمینینِ قلم' کہا ہے ، مگر اس لقب کے حقیقی مستحق وہ خود ہیں[1] ، فہ

---

[1] اسی طرح واجد علی شاہ کی ایک تصنیف پر ان کی یہ تقریظ خود ان کے اپنے کلام کے لیے بدرجہا زیادہ برمحل و موزوں ہے :

بیاضے ، کاندران بین السطور است
تو گو موجے از دریائے نور است

بہ لہو ار سلکے از گوہر گسستہ
ز دانش نیز نقشِ چند بستہ

اگر یابی ز بازی ہا نشان ہا
زدین و داد ہم بینی نشان ہا

صرف اس اعتبار سے کہ دو زبانوں پر یکساں تصرف رکھتے ہیں ، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ دائیں اور بائیں ایک سی قوت سے تلوار چلاتے ہیں ۔ ان کی اس استعداد کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہر مسئلے اور معاملے کے کبھی ایک پہلو کو اپنے شعور کی شعاعیں ڈال کر ٹٹولتے ہیں ، کبھی دوسرے پہلو کو ، اور دونوں گوشوں میں جو کچھ پاتے ہیں ، اس کے اظہار پر یکساں قدرت رکھتے ہیں ۔ حال کے ایک برطانوی شاعر سے بھی یہی خصوصیت منسوب کی گئی ہے :

'اس کا ضمیر بڑا پیچیدہ ہے ۔ وہ اپنی ذات سے دست وگریبان ہے ، اور اپنے اندر اپنی اصلاح کا اصول بھی رکھتا ہے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود اس ضمیر سے زیادہ کشادہ اور دانش مند ہے ، چونکہ کسی ایک وقت میں اس کا جو جزو وہ کام میں لاتا ہے ، وہ اس کے نصف سے زیادہ نہیں ہوتا ۔'

ییٹس کی نسبت کہا گیا ہے کہ اس کے خیالات کو کریدیں تو پتا چلتا ہے کہ ان سب کی اصلاح یا تکملہ خود اس کی تحریروں میں موجود ہے ۔ یہی صورت غالب اور اقبال کے بعض شدید یا یک طرفہ بیانات کی ہے ۔

'اہلِ کرم' سے غالب کی یاد اللہ

سید علی نام ، غمگین تخلص ، ۱۱۶۷ مطابق ۱۷۵۳ دہلی میں پیدا ہوئے - سالِ وفات ۱۲۶۸ مطابق ۱۸۵۱ ہے - سعادت یار خاں رنگین دہلوی کے شاگرد تھے- ۱۸۱۵ میں ترکِ وطن کر کے گوالیار میں جا بسے - وہاں مہاراجا دولت راو سیندھیا نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا ، آنکھوں پر بٹھایا اور دل میں جگہ دی ، اور 'خدا نما حضرت جی' کے لقب سے نوازا ، اور یہ حضرت جی سید علی غمگین شاہ کہلائے -

غمگین کا پہلا دیوان ۱۷۹۵ مطابق ۱۲۱۵ میں مرتب ہوا تھا - یہ رنگین کے رنگ میں ہے - دوسرا دیوان 'مخزن الاسرار' ۱۸۳۷ میں تکمیل کو پہنچا ، اور ۱۹۶۶ء میں گوالیار سے شایع ہو چکا ہے - ایک غیر مطبوعہ مجموعہ رباعیات ''مکاشفات الاسرار'' کا قلمی نسخہ انڈیا آفس لایبریری لندن میں ہے - اس کے دیباچے میں میرزا غالب کا ذکر اس طرح آتا ہے :

'چون دیوان (''مخزن الاسرار'') باتمام رسید' و واردات و غلبات و کیفیات بر دلم استیلا داشت ، خواستم کہ برائے برادرِ دینی ، عزیز از جان اسداللہ خان ، عرف میرزا نوشہ ، تخلص

به غالب و اسد ، که درین زمانه در نظم و نثر نظیرِ خود نه دارد . . . از ابتدائے سلوکِ حضرت قادریه نقشبندیه تا انتہا ، در پیرایهٔ رباعیات ، که بطور رسالهٔ تصوف باشد ، ترتیب دہم ـ'

غالب به غمگین :

'قبله و کعبه' راستی آیینِ من است' و محبت دینِ من ـ راستی را ایمان و دروغ را گناه پندارم ـ بدین گفته یزدان را گواه می آرم ، که ارادت و محبتِ من به حضرت ازان افزون تر است که آن را شرح توان کرد ـ'

(منقول از نقوش ، غالب نمبر ۳ و 'اورینٹل کالج میگزین ، فروری ۱۹۶۴ ء)

مسلکِ فنا سے جو جذباتی وابستگی اور اپنی 'نیم سوز' کیفیت پر جو حسرت و تاسف غالب ساری عمر اپنے کلام میں ظاہر کرتے رہے ، اس کی تکرار غمگین سے ان کی ۱۸۴۱/۱۲۵۵ کی خط و کتابت میں بھی ملتی ہے :

'خدا را بر این نیم سوخته نظرے ، تا پاک بسوزد ، و درد و شرار و خاکستر همه از نظر بر خیزد !'

'امیدواری دارم که به من نگاهِ عنایت که پیر و مرشد را برمن است ، از وسوسه پاک گردم ، و در راهِ فنا خاک گردم ـ'

'خدارا توجہ دران مبذول فرمایند ، و آن چنان صرفِ ہمت بہ کار برند ، کہ آویزشِ اندیشہ' این مرید بہ بے رنگی افزون تر شود ، تا رفتہ رفتہ مستہلک و مستغرق گردم ، و رو از رنگ بہ بے رنگی و استہلاک و استغراق دارم ، و عدمِ محض شدہ باشم ۔'

غمگین کے نام ایک خط میں غالب نے 'نمکِ گفتگوے درویشانہ ، کی معنی خیز ترکیب استعمال کی ہے ۔ غمگین کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس تعلقِ خاطر کی حدود سے خوب واقف تھے جو 'مرشد' اور 'مرید' ایک دوسرے سے رکھتے تھے :

'فقیر را با شما محبت و نسبتے است ، کہ خودبخود دلم بہ طرفِ شما می کشد . . . مشفق را با ما غرضِ دینی نہ دنیوی ، صرف از عنایتِ خود للہ محبت دارند ۔'

بحوالہ محمد مسعود احمد : 'غمگین اور غالب'

اپنے 'برادرِ دینی ، کے نام ایک خط میں غالب نے اپنا ایک عقیدہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

'دانم کہ وجود یکے ہست ، و ہرگز انقسام نہ پذیرد ۔ ہر آینہ اگر دینے یا دنیاے تراشیدہ باشم ، گرفتارِ شرکِ فی‌الوجود ، کہ اقبحِ اجزاء مشرک است ، شدہ باشم ۔ بہ دانستِ نامہ نگار دین نیز ، ہمچو دنیا ، موہوم است ، و بہ وہم دل نہ توان بست ۔'

نوجوانی میں غالب نے بڑے حسرت ناک لہجے میں کہا تھا :

بے کسی ہائے تمنا ، کہ نہ دنیا ہے، نہ دیں !

اور اپنی سرشارِ غفلت کیفیت پہ نظر ڈال کر تاسف کا اظہار کیا تھا کہ

دردِ یک ساغرِ غفلت ہے ، چہ دنیا و چہ دیں !

یہاں خطاب 'پیر و مرشد' سے ہے ، پھر بھی 'چہ دنیا و چہ دیں' دونوں کو موہوم ٹھہرا کے 'مرید' نے دونوں ہی سے منہ موڑ لیا ہے -

حضرت سید غوث علی شاہ قلندر (ولادت ۱۲۱۹ ، وفات در پانی پت ۱۲۹۷) سلسلۂ قادریہ کے مشہور بزرگ گزرے ہیں - ان کے ملفوظات میں ان لوگوں کے نام ملتے ہیں جن سے انھیں ملنے کے مواقع حاصل ہوئے تھے - مولانا فضلِ حق ، مفتی صدرالدین اور میرزا غالب سے بھی ان کی ملاقاتیں ہوئی تھیں - چھ ماہ تک میرزا سے ملاقات جاری رہی -

''تذکرۂ غوثیہ'' میں لکھا ہے :

'ایک روز ہم میرزا نوشہ کے مکان پر گئے - نہایت حسنِ اخلاق سے ملے - اس دن سے انھوں نے دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے - ہرچند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجیے ،

مگر وہ کب مانتے تھے؟ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ 'میں اس قابل نہیں ہوں : بے خوار ، روسیاہ ، گنہ گار ، مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے ، البتہ اولش کا مضایقہ نہیں ۔' ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ تشتری میں لے کر کھایا ۔ ان کے مزاج میں کمال کی کسر نفسی اور فروتنی تھی . . . رند مشرب ، بے شر ، رحم دل تھے ۔

ایک روز راقم خدمت میں حاضر تھا کہ کسی شخص نے میرزا نوشہ صاحب کے انتقال کی خبر سنائی ۔ آپ نے فرمایا : انا للہ و انا علیہ راجعون ۔ نہایت خوب آدمی تھے ۔ عجز و انکسار بہت تھا ۔ فقیر دوست بدرجہ' غایت اور خلیق ازحد تھے ۔ ایک روز ہم ان کے پاس گیے تو انھوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے :

فرصت اگرت دست دہد ، مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے

زنہار ازان قوم نہ باشی کہ فریبند
حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے!

بہ روز حشر ، الٰہی' چو نامہ' عملم
کنند باز ، کہ آن روز بازخواہ من است

بکن مقابلہ آن را ز سر نوشتِ ازل
اگر زیادہ و کم باشد ، آن گناہِ من است

منقول از ''احوالِ غالب'' مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین آرزو

پہلا قطعہ اپنی زبان سے شاہ صاحب کے سمعِ مبارک تک پہنچا کر غالب نے ، اپنی 'کسر نفسی و فروتنی' اور 'عجز و انکسار' کے باوجود ، گویا یہ دعویٰ کیا کہ وہ خود کو ، بطورِ شاعر ، 'اہلِ کرم' کی طرح ، منصبِ رشد و ہدایت پر فایز سمجھتے ہیں ! یہی حیثیت اختیار کر کے انھوں نے ایسے عقاید کی بھی اپنے تضاد نما انداز میں تلقین کی ہے :

گر مسلمانی ، یکے بین : ز ردہشت آن ، کہ او
اختلافے درمیانِ ظلمت و نور افگند !

کفر و دین چیست ، جز آلایشِ پندارِ وجود ؟
پاک شو ، پاک ، کہ کفرِ تو دینِ تو شود

دولت بہ غلط نبود : از سعی پشیمان شو :
کافر نہ توانی شد ، نا چار مسلمان شو

اردو اور فارسی میں تکرارِ مضمون :

غالب نے اپنے جذب و فکر کو کبھی ایک سے ، اور کبھی ملتے جلتے رنگ ڈھنگ سے ، اردو اور فارسی دونوں کے قالب میں ڈھالا ہے - دونوں زبانوں کے کچھ ایسے ہم رنگ اور ہم معنی شعر پیش کیے جاتے ہیں جن میں ، تحریکِ جدوجہاد کے تناظر میں ، انھوں نے اپنا کوی شخصی یا اجتماعی تاثر ادا کیا ہے :

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز :
ذرہ صحرا دست گاہ ، و قطرہ دریا آشنا

ودیعت بودہ است اندر نہادِ عجزِ ما نازے :
جدا از قطرہ نتوان کرد طوفان دست گاہی را

خوشا بے رنگیِ دل : دست گہِ شوق را نازم
کہ می بالد بہ خویش این قطرہ از طوفان مشرب پا

توفیق بہ اندازۂ ہمت ھے ازل سے :
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ ، کہ گوہر نہ ہوا تھا

بس کہ نیامد فرو سر بہ گہر گشتنش :
قطرہ زبالادوی ہمتِ اختر گرفت

نہ پوچھ بے خودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہی پڑے سر بہ سر در و دیوار

تباہی خانہ ام ذوقِ خرابی داشت ، پنداری
کز آمد آمدِ سیلاب در رقص است دیوارش

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے :
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

بیادر گلشنِ بختم ، کہ در ہر گوشہ بنہایم
ز جوشِ لالہ و گل در حنا پائے خزانے را

خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

رفتم از کار ، و ہمان در فکرِ صحرا گردی ام :
جوہرِ آئینۂ زانوستِ خارِ پاے من

دل سے نکلا ، پہ نہ نکلا دل سے :
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

گزشت از دل ، ولے نگزشت از دل :
خدنگِ غمزۂ زورین کمانان

کشادِ شستِ اداے تو دل نشینِ منؓ است :
اگر خدنگِ تو در دل نشست ، جا دارد

نہ گلِ نغمہ ہوں ، نہ پردۂ ساز:
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

دیگر ز سازِ بے خودیِ ما صدا مجوے :
آوازے از گسستنِ تارِ خودیم ما

'سگالیدنِ اندیشه ہائے رنگا رنگ'

غالب کے عہد کے بعض تشکیلی عوامل کے سیاق و سباق میں، جن کا علاقہ زندگی کے خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں سے تھا، ان کے کلام کی ایک معنوی تحلیل اور نفسی تجزیہ پیش کیے جا چکے ہیں۔ اب ان کے شخصی اور شعری مزاج اور مافیہ کے بارے میں ان کے بعض اگلے پچھلے پڑھنے والوں کے کچھ ایسے تاثرات جوں کے توں دیے جاتے ہیں جن کی ہماری دانست میں اس مواد سے توثیق ہوتی ہے جو اس تالیف میں مہیا کیا گیا ہے۔

جناب مرزا اسداللہ خاں غالب مد ظلہ العالی:

راقمِ آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے، اس کا بیان نہ قدرتِ تقریر میں ہے، اور نہ احاطۂ تحریر میں آ سکتا ہے ۔۔۔ چراغِ انوری ان ہی کے شعلۂ فکر سے روشن، اور سینۂ آزری ان ہی کی آتشِ حسرت سے دیخن ۔۔۔ قلم ان کا معنیِ روشن کی تراوش سے فوارۂ نور، اور عبارتِ پاکیزہ ان کی لطفِ کیفیت سے شرابِ انگور ہے۔

سید احمد خاں: ضمیمہ 'آثارالصنادید' ۱۸۴۷

تو اے کہ رونق پیشینان بہ ہم بہ شکست
ر نظم و نثرِ تو، کاندر زمانِ ما گفتی

چہ نغمہ ہا ، کہ بہ قانونِ ذوق سنجیدی !
چہ بذلہ ہا ، کہ بہ اندازِ دل ربا گفتی !

رسید نشہ عرفان ، چو ذکرِ مے راندی :
شگفت خاطرِ یاران ، گر از صبا گفتی

دوید ریشہ بہ دل ہا ، چو حرفِ مہر زدی :
دمید نخلِ تمنا ، چو از وفا گفتی

ہزار عقدۂ سر بستہ باز بکشودی
ہزار نکتۂ پوشیدہ برملا گفتی

ز سرِ تفرقۂ جمع قصہ ہا راندی
سیرِ نفس و آفاق راز ہا گفتی

برآمد از دلِ بیگانگان ترانۂ ذوق
بہ محفلے کہ سخن ہائے آشنا گفتی

لطیفہ ہا ، کہ بہ لفظ و بیان نہ می گنجید
تو ، چون فرشتہ ، ز غیب آمدی ، و وا گفتی

حالی : ''یادگارِ غالب''

'غالب نے بلا کی رنگا رنگ اور تہ دار شخصیت پائی تھی !'

آفتاب احمد

'غالب کے ذہنی سفر میں ہمیں ایک صراطِ مستقیم نہیں ملتی، بلکہ بہت سے پیچ و خم ملتے ہیں' پروفیسر آلِ احمد سرور : 'غالب کا ذہنی ارتقا'

'غالب کی شاعری کی بنیاد ایک خطِ مستقیم کی بجائے خطوطِ منحنی پر ہے، اور اس کے پیچ در پیچ دایرے اور سمتیں ہیں' خلیل الرحمان اعظمی : 'غالب اور عصرِ جدید'

'چونکہ غالب کی نفسی حالت میں تضاد اور تصادم پایا جاتا ہے، لہذا اس کے طرزِ بیان میں بھی تضاد اور اختلاف ہے' ڈاکٹر اختر اورینوی : 'غالب اور اس کا نفسیاتی پس منظر'

'غالب کا ذہن مختلف النوع، بلکہ بعض اوقات تو متضاد اور متناقض عوامل کے عمل اور ردِ عمل کا آماج گاہ بنا رہا، جس کا اظہار اس کے کلام میں بھی ہوا ہے' سلیم اختر : 'غالب، آتش، زیرِ پا'

'غالب تمام عمر اپنی داخلی کشمکش دور نہ کر سکے۔ اس کے اثر سے ان کے ذہنی ردِ عمل کی کئی سطحیں نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے عہد کی سماجی پیچیدگیوں اور خود اپنی ذات کی کشمکش پر عارفانہ نظر رکھتے تھے، جو ان کے بڑے ادیب ہونے کی علامت تھی۔ اسی لیے شعر و ادب کے تخلیقی لمحات میں وہ نہ صرف اپنی ذات سے بلند ہو کر اس کی خامیوں

کو دیکھ سکتے تھے، بلکہ اپنے زمانے کے مزاج داں اور معالج بھی بن سکے' ڈاکٹر وارث کرمانی : 'غالب کی شخصیت اور فن'

'غالب طبعی طور پر ایک متجسس شخصیت رکھتا تھا : وہ ہر رنگ اور ہر روپ اپنا کر اس کی ماہیت سے متعارف ہونا چاہتا تھا ،' صلاح الدین ندیم : 'ادبی دنیا'

'کفر و ایمان کی کوی وادی نہیں جس میں غالب کا گزر نہ ہوا ہو . . . . اس کا دل و دماغ انسانی نفسیات کا محشرستان ہے - یہ مصرع اس کی اپنی طبیعت کا آینہ ہے :

قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انسان شد

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم : 'افکار غالب'

'کہا جاتا ہے کہ انانیت کا تصور شیطنت سے جا ملتا ہے ، اور ہر بڑے شاعر میں، بہ قدرِ ذوق یا ظرف، یہ 'عظیم انحراف' یا شیطنت ملتی ہے - اس عنصر کے بغیر ایک شخص اچھا شاعر تو بن سکتا ہے ، لیکن عظیم شاعری کی حدیں اکثر و بیشتر کافری کی وسعتوں میں پھیلی ہوی ملیں گی - غالب کی عظمت میں اس کافری کا اچھا خاصا دخل ملتا ہے -'

'غالب طبعاً عجمی تھے ، مسلمان ، موحد ، صوفی ، سب بعد میں . . . . وہ شاعر اور شخص دونوں اعتبار سے عجمی ہیں ،'

پروفیسر رشید احمد صدیقی : 'غالب کی شخصیت '

'غالب کا ذہن اپنے زمانے کے تہذیبی اثرات سے باخبر ہے؛ فلسفے اور تصوف کے مسایل کو جانتا ہے؛ مذہبی اور اخلاقی قدروں سے آشنا ہے؛ مگر ان میں سے کسی کا پوری طرح پابند نہیں ہے' پروفیسر آلِ احمد سرور : 'غالب کی عظمت'

'غالب کی زندگی عبارت ہے 'عبادتِ برق' اور 'افسوسِ حاصل' سے۔ اس امتزاج سے ہستی کی جو صورت انھوں نے تیار کی ہے، اسے ہم ہنگامہ آفرینی سے موسوم کر سکتے ہیں،

ڈاکٹر شوکت سبزواری : 'فلسفہ' کلامِ غالب'

'غالب کے یہاں جو تند و تیز لہجہ پایا جاتا ہے، وہ جوشِ زندگی اور نشاطِ آرزو کی پیدایش ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کے سرچشمہ' باطن سے نمودار ہوا ہے، جس کے نزدیک زندگی کی تڑپ اور زندگی کی آگ ہی وہ متاعِ گراں مایہ ہے جو لذتِ درد اور لذتِ ادراک دونوں کی بہ یک وقت امین اور سرمایہ دار ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ : 'غالب' پیش روِ اقبال'

'غالب کی شاعری اس کی 'واماندگیِ شوق' اور 'کشاکشِ غمِ پنہاں' کی داستان ہے' آفتاب احمد : 'غالب کا غم'

'شاعری تاریخ نہیں ہوتی، لیکن غالب کا کلام اسلامی ہندوستان کی سماجی اور روحانی تاریخ کا خلاصہ ہے،

پروفیسر حمید احمد خان : 'غالب کی شاعری میں حسن و عشق'

'غالب کا دیوانِ غزلیات ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے

سارے خارجی اور داخلی تجربوں کا عطر ہے، پروفیسر سید وقارعظیم : 'غالب ذاتی تاثر کے آئینے میں'

'دراصل غالب کی فن کارانہ بصیرت کا پس منظر اس کے اپنے زمانے ہی میں تلاش کیا جا سکتا ہے،

صلاح الدین ندیم : 'اوراق' اپریل ۱۹۶۹

'زندگی پر غالب کی گرفت بڑی کڑی تھی ۔ غالب کے ہاں سیاسی شعور کے علاوہ سماجی شعور بھی بہت تیز و توانا ہے،

ڈاکٹر وزیر آغا : 'غالب' ایک جدید شاعر'

'غالب کو اپنے مافی الضمیر کی پوری طرح خبر تھی ۔ انھیں اپنے مافی الضمیر کو پوشیدہ رکھنے، یعنی کیمو فلاج (Camouflage) کرنے کا فن بھی خوب آتا تھا'

ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی : 'غالب کی مشکل پسندی'

'غالب کی شاعری میں غم و نشاط کو الگ الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے ۔ اس لیے اس کو صرف غم یا صرف نشاط کا شاعر سمجھنا غلطی ہے ۔ وہ دراصل نشاطِ غم کا شاعر ہے ۔ یعنی وہ بلاؤں سے دست و گریباں ہو کر سامانِ طرب حاصل کرتا ہے،

علی سردار جعفری : "پیغمبرانِ سخن"

'غالب کا محبوب اس کے جذبات و ہیجانات کا عکس ہے ۔ اس عکس میں وہ اپنا چہرا دیکھتے رہتے ہیں ۔ ایسے میں وہ صرف

وہی نقش ابھارتے ہیں جو ان کے ذاتی میلانات سے مطابقت رکھتے ہیں' ڈاکٹر وحید قریشی : 'غالب اور اس کا ماحول'

اب ہم بعض معتبر ناقدوں کے کچھ ایسے تاثرات پیش کرتے ہیں جن کی ، ہماری دانست میں ، اس مسالے کی رو سے جو ہم نے فراہم کیا ہے ، یا توثیق نہیں ہوتی یا وہ ہمیں بحث یا اصلاح طلب نظر آتے ہیں :

'اب رہے عالمی سطح کے حقایق بدوش و کاینات در آغوش ادب کی پہنای کا مسئلہ ، سو میرزا صاحب کی پراگندہ حالی اور ان کے دور کی غنودگی پر نگاہ کرکے ، ان سے اس ادب کا تقاضلی کرنا بڑی بے دردانہ سرد مہری اور بڑی بران قسم کی بے مروتی کی بات ہے: اس لیے بھل منسی اسی میں ہے کہ ان سے اس ادب کا مطالبہ نہ کیا جائے ۔'

جوش ملیح آبادی : 'نقوش' غالب نمبر ۳

'غالب کا کلام ایک موہوم ہمہ گیر اداسی کا آینہ ہے '

فیض احمد فیض : 'غالب کے تخیل کے بنیادی عناصر'

'یہ خیال کہ غالب 'احساسِ کم تری' خود بینی ، خودنمای یا دوسری نفسیاتی ژولیدگیوں کے شکار ہوگیے ، درست نہیں معلوم ہوتا'

پروفیسر رشید احمد صدیقی : 'غالب کی شخصیت'

غالب کی شخصیت میں تضاد یا تصنع کا شایبہ بھی نہیں ، اور نہ اس کی شخصیت مجروح و منقسم ہے ۔'

ڈاکٹر وزیر آغا

'غالب کے ہاں محبوب کا وہ احترام نہیں ملتا جو ہمارے ادب کی روایت رہی ہے ۔'

پروفیسر رشید احمد صدیقی : 'غالب کی شخصیت'

'غالب کا فن رومانی شعرا سے ان ہی معنوں میں مختلف ہے : اس کا فن غیر شخصی ہے ۔'

پروفیسر ممتاز حسین : 'غالب : ایک مطالعہ'

'غالب نے سیاسی شاعری نہیں کی ۔'

علی سردار جعفری : ''پیغمبرانِ سخن''

'غالب کے فن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اجتماعی وجدان سے بالکل الگ اور اس سے جدا ہے ۔'

ڈاکٹر شوکت سبزواری : 'فلسفۂ کلامِ غالب'

'غالب نے اپنے دور کے مخصوص رجحانات کی عکاسی کو بطورِ خاص اپنا موضوع نہیں بنایا ۔'

عرش صدیقی : 'اوراق' اپریل ١٩٦٩

'کوی چیز ایسی نہیں جس کی فنا کے پردے میں بقا کے نقوش پنہاں نہ ہوں ۔ غالب کا ذہن کہیں بقا اور فنا

کی ان پرچھائیوں کو پکڑنے کی کوشش ضرور کرتا ہے، مگر وہ کوئی شعوری بات نہیں ہوتی۔ عام طور پر وہ اس راز کو سمجھ نہیں پاتا... میر و غالب دونوں ہی بقا کے راز کو فراموش کرکے فنا کو مقدم کر دیتے ہیں۔'

ڈاکٹر سید عبداللطیف : 'غالب کی شاعری'

'غالب کی اس فارسی غزل میں کس قدر ادعا ہے' (صرف مطلع درج ہے):

بیا، کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

اس غزل میں بڑی للکار اور پکار ہے، مگر اس کی گھن گرج کے اندر دعوتِ انقلاب کی غایت کچھ بھی نہیں نکلتی، خصوصاً جب کوئی سوچتا ہے کہ یہ سارا ہنگامہ صرف ایک 'زنِ عشوہ گر' کی ملاقاتِ خلوت کے لیے تھا۔'

ڈاکٹر سید عبداللہ : 'غالب ذاتی تاثر کے آئینے میں'

۷

غالب سے متعلق بعض غور طلب سوال

بیاضِ غالب کی تاریخِ کتابت :

غالب کی نو دریافت بیاض کی تاریخِ کتابت کے بارے میں مختلف خیال ظاہر کیے گیے ہیں - عرشی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے :

'ہم بہ اطمینان کہ سکتے ہیں کہ نسخہ' مذکور میرزا صاحب نے منگل ۱۴ رجب ۱۲۳۱ کو تمام کیا ، جو ۱۱ جون ۱۸۱۶ کے مطابق ہے ... میرزا صاحب رجب ۱۲۱۲ میں پیدا ہوے تھے ، اور اس دیوان کے اتمام کے وقت ان کی عمر قمری حساب سے انیس برس کی ہوگی -'

نثار احمد فاروقی صاحب نے ، اس یادداشت کی بنا پر جو بیاض کے ایک حاشیے پر درج ہے :

'لعل خاں بتاریخ اول صفر ۱۲۳۵ در ماہہ ، ڈھالی روپے' طے کیا ہے کہ

'یہ نسخہ یکم صفر ۱۲۳۵ ، مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۱۹ سے پہلے وجود میں آ چکا تھا ۔'

مہر صاحب تاریخ کی چھان بین کے بعد اس نتیجے پر پہنچے :

'یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ زیرِ غور نسخہ' نادرہ کی تکمیل ۱۴ رجب ۱۲۳۶ ; بروزسہ شنبہ ہوی ، یعنی ۱۷ اپریل ۱۸۲۱ کو . . . رجب ۱۲۳۶ (یہ سال ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۰ سے شروع ہوا) ، جب میرزا زندگی کے چوبیس مرحلے طے کرچکے تھے ۔'

اس نسخے میں جو کلام شامل ہے ، اس کے بعض مضامین امیر خان کے انگریزوں سے صلح کرنے اور اس کے فوراً بعد سید صاحب کے اس سے قطع تعلق کرکے دہلی پہنچنے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ صلح نامے پر امیر خاں کے وکیل نے ۹ نومبر ۱۸۱۷ کو دستخط کیے اور ۹ دسمبر کو امیر خاں نے اس کی تصدیق کر دی ۔ اس کی اطلاع سید صاحب نے شاہ عبدالعزیز کو ان الفاظ میں دی :

'یہ خاکسارِ سراپا انکسار حضرت کی قدم بوسی میں عنقریب حاضر ہوتا ہے ۔ یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہوگیا ۔ نواب صاحب فرنگی سے مل گیے ۔ اب یہاں رہنے کی کوی صورت نہیں رہی ۔'

مہر : ''سیرت'' ۱۰۹

گویا وہ ۱۸۱۷ کے اختتام سے کچھ پہلے دہلی پہنچ گیے - ملی جلی داخلی اور خارجی شہادت کی بنا پر اتنا تو پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ نسخے کی کتابت کسی صورت میں ۱۸۱۸ سے پہلے مکمل نہ ہو سکتی تھی -

غالب نوجوانی میں جس رفتار سے سرگرمِ سخن گوی تھے ، اس سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ اِن واقعات میں جو بیاض کے کچھ کلام کا موضوع ہیں ، اور ان کے موزوں کیے جانے میں ، زیادہ وقت نہ گزرا ہو - اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس میں کچھ کلام ان واقعات سے پہلے کا بھی ہو - اس کا امکان بھی خارج نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی کتابت یاد داشت کی تاریخ' ۱۹ نومبر ۱۸۱۹ ، اور مہر صاحب کی مجوزہ تاریخ' ۱۴ رجب ۱۲۳۶ مطابق ۱۷ اپریل ۱۸۲۱ ، کے درمیان کسی تاریخ کو تکمیل کو پہنچی ہو -

---

غالب کی ایک ابتدای مثنوی

ایک دن، مثلِ پتنگِ کاغذی
لے کے دل سررشتۂ آزادگی

خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا
اس قدر بگڑا، کہ سر کھانے لگا

میں کہا: 'اے دل' ہوائے دل بران
بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں

پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار
یہ نہیں ہیں گے کسی کے یارِ غار

گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر

اب تو مل جائے گی ان سے تیری سانٹھ
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ

سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے
قہر ہے دل ان سے الجھانا تجھے

یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے
بھول مت اس پر : آڑاتے ہیں تجھے

ایک دن تجھ کو آڑا دیں گے کہیں
مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

دل نے سن کر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب
غوطے میں جا کر ، دیا کٹ کر جواب:

'رشتہ' در گردنم افگندہ دوست
می برد ہرجا کہ خاطر خواہِ اوست'

پتنگ بازی پر یہ مثنوی خواجہ حالی نے غالب کے ایک بچپن کے دوست لالہ کنھیا لال کے حوالے سے نقل کی ہے - لالہ صاحب کے بقول ، یہ آٹھ نو سال کی عمر میں لکھی گئی - اگر یہ مثنوی واقعی میرزا صاحب ہی کی ہے ، تو اس کے لفظ ، معنی اور موزوں کیے جانے کی تاریخ کے بارے میں کئی سوال ذہن میں پیدا ہوتے ہیں - اس کی زبان وہ نہیں جو غالب کے اس سب سے ابتدائی کلام کی ہے جس تک ہماری رسائی اب تک ہوئی ہے - اس کے مفہوم پر غور کرنے سے گمان ہوتا ہے کہ پتنگ بازی کے پردے میں کچھ اور ہی امور بیان کیے گئے ہیں - ان میں سے ایک کا تعلق میری دانست میں ، جو صرف نظم کے لفظوں پر مبنی ہے ، سید صاحب کے امیر خاں کو اس مشورے سے معلوم ہوتا ہے کہ

وہ انگریزوں کے چکمے میں نہ آئے اور ان کے پھندے میں نہ پھنسے - مثنوی میں کچھ شعر ایسے بھی ہیں جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور معاملے سے تعلق رکھتے ہیں - اس کی طرف ذہن 'سررشتہ' اور 'ناحق' کے لفظوں سے منتقل ہوا - میرا اشارہ اس کشاکش کی طرف ہے جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرزا کو اپنی طرف کھینچنے کی غرض سے فضلِ حق اور شاہ اسماعیل میں شروع ہوچکی ہے - ان اشعار میں اپنے نوجوان دوست کو فضلِ حق سمجھا رہے ہیں کہ اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو اس کوے ہلاکت کی طرف رخ نہ کرو ، ورنہ

ایک دن تجھ کو اڑا دیں گے کہیں
مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں[1]

'دل' کے جواب سے ٹپکتا ہے کہ یہ مشورہ اسے ناگوار ہے :

دل نے سن کر کانپ کر ، کھا پیچ و تاب
غوطے میں جاکر ، دیا کٹ کر جواب

'رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہرجا کہ خاطر خواہِ اوست'

---

[1] یہی مشورہ ، مفرس پیرائے میں ، نسخہ بھوپال میں ملتا ہے :
ہے خطِ عجزِ ما و تو اولِ درسِ آرزو :
ہے یہ سیاقِ گفتگو : کچھ نہ سمجھ ، فنا سمجھ

حاصلِ دل بستگی ہے عمرِ کوتاہ اور بس

مگر دل کا ردِ عمل سیدھا سادا یک طرفہ نہیں ، بلکہ مخلوط ہے : اس میں کشش کا عنصر بھی ہے ، اور خطرات کا احساس بھی -

اگر مثنوی کی یہ تشریح ٹھیک ہے ، تو اسے لکھنے کی تاریخ آخر ۱۸۱۷ میں امیر خاں کی سپرافگنی کے بعد ہی ٹھہرتی ہے - اس وقت میرزا کی عمر آٹھ نو سال نہیں ، بیس اکیس سال بنتی ہے -

غالب کی مہریں

غالب نے ۱۲۳۱ میں دو مہریں یکے بعد دیگرے نقش کرائیں
پہلی پر

'اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ'

اور دوسری پر

'اسد اللہ الغالب ۱۲۳۱ھ'

کندہ ہوا - سوال یہ ہے کہ ایک ہی سنہ میں دو مہریں نقش کرانے کی وجہ کیا تھی - غالب کو پہلی مہر کے ساتھ ایک نئی مہر کی ضرورت اس لیے پیش آی کہ وہ پہلی عبارت میں ترمیم چاہتے تھے - اس ترمیم کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ۱۲۳۱ کی کسی تاریخ میں غالب تخلص اختیار کیا تو باتخاص مہر نقش کرانے کا خیال آیا -

اکبر علی خاں : 'نقوش' غالب نمبر ۳ ، ۱۶م

'غالب تخلص کی پہلی حد کو سو فی صدی قطعیت سے ۱۲۳۱ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا ، پھر بھی 'اسد اللہ الغالب ، کی مہر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - اگر مہر کی تیاری

تخلص کی تبدیلی کا اعلان نہیں تو اس کے بعد جلد ، سال چھ مہینے میں، یہ تخلص اختیار کرلیا ہوگا ۔' ڈاکٹر گیان چند: 'نقوش' غالب نمبر ۳ ، ۵۹۴

۔مالک رام صاحب نے غالب کی ایک نئی مہر ۱۲۳۸/۱۸۲۲ میں بنوانے کا ذکر کیا ہے ، جس پر کندہ ہے :

'محمد اسد اللہ خاں'

اس سے پہلے ان کی مہر پر کندہ تھا :

'اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ'

اس سے پر ان کا حاشیہ یہ ہے :

'یہ دونوں مہریں جس عظیم الشان ذہنی انقلاب کی شاہد ہیں، اس کی تشریح الفاظ میں نہیں کی جاسکتی ۔' 'ذکرِ غالب'

نواب حسام الدین حیدر کے نام ایک خط کے آخر میں غالب نے 'راقم محمد اسد اللہ' اور دوسرے میں 'فقیر محمد اسد اللہ' لکھا ہے ۔ ('پنج آہنگ' تدوین عابدی ، ۴۵۳ ، ۴۵۵)

غالب کی جن غزلوں کے اشعار پہلے خط میں درج ہیں ، وہ مدون کے بقول ، ۱۸۳۸ کے کتابت شدہ دیوانِ فارسی کی غزلیات میں سے ہیں اور یہ خط 'پنج آہنگ' کے ۱۸۳۵ کے قلمی نسخے میں شامل ہے ۔

تبدیلیِ تخلص کے مجوز

ایک متعلقہ حل طلب سوال یہ ہے کہ میرزا صاحب نے اپنا تخلص خود بدلا یا کسی اور نے تجویز کیا۔ ایک قصیدے میں انھوں نے یہ انکشاف کیا ہے :

خرد بہ عالمِ نظمم نہادہ 'غالب' نام
نشانِ غلبہ پدیدار ازین خجستہ خطاب

ہمی کنم بہ قلم کارِ تیغ ، واین کارے ست
شگرف و نغز و پسندیدہ اولوالالباب

اس انکشاف میں کلیدی لفظ 'خرد' ہے، 'حکیم' کی طرح ، غالب کا روئے سخن کی جگہ مولوی فضلِ حق سے بھی ہے ، مگر بالعموم تعریض یا تضحیک کے لہجے میں :

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں ؟
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

غالب ، کسان ز جہل حکیمش گرفتہ اند
بے دانشے کہ طعنہ بر اہلِ کتاب زد

جس 'خرد' نے ان کا تخلص 'غالب' رکھوایا ، اس 'خجستہ خطاب ، سے اس کی غرض 'نشانِ غلبہ' کو اُبھارنا تھا ۔ یہ پر معنی تخلص کوی ایسا شخص ہی تجویز کر سکتا تھا جس کا اپنا مزاج اور مسلک اس کا متقاضی ہو ، اور جس کی نظر میں یہ تخلص محض رسمی نہ ہو ، بلکہ اس غرض و غایت سے ہم آہنگ ہو جو اس کے نزدیک شعر و ادب کی تھی ۔ اس غرض کی تعمیل کا دعویٰ صاحبِ تخلص نے فخریہ لہجے میں کیا ہے :

ہمی کنم بہ قلم کارِ تیغ

ایک قصیدے میں 'بہادر شاہ' کو ان صفات سے متصف کیا گیا ہے :

گرہ کشاے رموزِ خرد ، بہادر شاہ

دمِ مراقبہ ، صورت نماے جوہرِ عقل
گہِ مشاہدہ ، نیرو فزاے نورِ نگاہ

بہ فیضِ آگہی ، آئین شناسِ سیر و سلوک
دلیلِ راہ روان ، مرشدِ خدا آگاہ

'بہادر شاہ' ہی کے نام ایک قصیدے میں یہ شعر ملتا ہے :

با کوس و علم ، علم و ہنر چون نہ کند جمع
شاہے کہ بہ فرہنگِ خرد نامور آمد ؟

اس 'شاہ' کی 'دیدِ گراں مایہ' 'چشمِ حقیقت نگر' طلب کرتی ہے - غالب کے زمانے میں ان صفات اور نشانات پر سوائے سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل اور کون پورا اتر سکتا تھا ؟ چنانچہ گمانِ غالب ہے کہ جس 'خرد' نے 'غالب' تخلص تجویز کیا ، وہ ان ہی دونوں بزرگوں میں سے کوئی ہو - مہر کا سجع 'اسداللہ خاں عرف میرزا نوشہ' کی بجائے 'اسداللہ الغالب' ۱۲۳۱ (۱۸۱۶ میں کندہ ہوا[1] - سید صاحب امیر خاں کی سپرافگنی کے بعد آخر ۱۸۱۷ یا شروع ۱۸۱۸ میں دہلی پہنچے - اس لیے یہ تجویز ان سے تو منسوب نہیں کی جا سکتی - اب رہے شاہ صاحب ، تو تمام قراین اس کے حق میں نظر آتے ہیں کہ یہ عطیہ ان ہی کا ہو - شاہ صاحب شعر و سخن کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے ، اور شاعروں کے لیے ان کی ایک بڑی کشش یہ بھی تھی - 'اولوالالباب' سے ، جو قلم سے تیغ کا کام لینے کو 'شگرف و نغز' سمجھتے تھے ، غالب کا اشارہ اور کس طرف ہو سکتا ہے ؟

اے کہ در بزم دل افروز نگاہش دیدی
بین کہ در رزم جگر دوز سنانے دارد

شہ بہ بالغ نظری سیرت و شانے دارد

---

[1] آزاد نے نہ جانے کس بنا پر یہ لکھا کہ ۱۸۲۸ میں 'اسداللہ الغالب' کی رعایت سے 'غالب' تخلص اختیار کیا -

اگر اس بحث میں کوئی مغالطہ نہ ہوا ہو ، تو اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ۱۸۱۶ تک ، جب میرزا کی عمر انیس سال تھی ، وہ شاہ اسماعیل کی دل پذیر شخصیت کے زیرِ اثر ، ان ولی اللہی تصورات سے آشنا ہو چکے تھے جنھوں نے تحریکِ جدوجہاد کی فکری و عملی صورت اختیار کی ۔[1]

---

[1] انگریز ناول نگار گریہم گرین کا ایک کردار کہتا ہے کہ 'لکھنے والوں کے بارے میں ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے کہ کل واردات زندگی کے پہلے بیس سال میں پیش آ چکتی ہے ، باقی مشاہدہ ہوتا ہے ۔ یہ قول ہم سب کے حسبِ حال ہے ۔' سب کے حسبِ حال ہو یا نہ ہو ، غالب کو اپنی شاعری کا بہت سا مسالا اس عمر کر پہنچنے تک مل چکا تھا ۔

۸

مولوی فضلِ حق اور معاصر شعرا

ذوق ، مومن اور شیفتہ کا کلام شاہد ہے کہ وہ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید اور ان کی تحریکِ جدوجہاد سے ذہنی اور جذباتی وابستگی رکھتے تھے - اسی بنا پر انھیں مولوی فضلِ حق کے بعض عقاید ، فلسفیانہ تصورات اور سیاسی مسلک سے شدید اختلاف تھا ، جو ہر اعتبار سے اس مسلک کی عین ضد تھے - اختلاف تو ان امور میں غالب بھی ان سے رکھتے تھے ، مگر کچھ ان سے دیرینہ ربط ضبط ، کچھ ان کے رعب اور کچھ اپنے مزاج کی رنگا رنگی کی رعایت سے ، ان کے بعض خیالات کی بھی انھوں نے اپنے کلام میں ترجمانی کی ہے - اس باہمی فکری 'بعد کے باوجود ، راہ و رسم ، کسی نہ کسی نوعیت کی ، سب ان سے رکھتے تھے - اس میں ان کی شعر و ادب سے دل بستگی کے علاوہ ، ان کے ذاتی اور خاندانی

علم و فضل[1] اور ، اس زمانے کے لحاظ سے، منصبی وجاہت کو بھی دخل تھا[2] - یہ ظاہرداری کے مراسم شاعروں کے دل میں خود کھٹکتے تھے ، چنانچہ انھوں نے ان کی توجیہ بھی کی ہے اور ان پر تعریض بھی -

ذوق نے ان کا عذر یہ پیش کیا ہے :

روشن ضمیر ملتے ہر اک نیک و بد سے ہیں

ہم کو کیا یاں راہ پر ہے ، یا کوئی گم راہ ہے؟
اپنی سب سے راہ ہے ، اور سب سے یاد اللہ ہے

---

[1] 'مولانا ، مخدومنا مولوی فضلِ حق' خلفِ مولوی فضلِ امام نے تحصیل علومِ عقلیہ اور نقلیہ کی اپنے والد ماجد سے کی - جمیع علوم و فنون میں یکتاے روزگار ہیں ، اور منطق اور حکمت کی تو گویا انھیں کی فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے -' ''آثارالصنادید''

'در علمِ منطق و حکمت و فلسفہ ، ادب و کلام و اصول و شعر فایق الاقران - استحضار فوق‌البیان داشت - نظمش زاید بر چهار ہزار اشعار خواہد بود -' ''تذکرۂ علماے ہند''

[2] ''مولوی فضلِ حق ، معقول ، خیرآبادی ، جو اس زمانے میں حاکمِ اعلیٰ شہر دہلی کے سر رشتہ‌دار اور علمِ منطق کے پتلے، اور افلاطون و سقراط و بقراط کی غلطیوں کے تصحیح کرنے والے تھے ، مولانا شہید کے سخت مخالف ہو گیے- بہ وجہ ہونے اہل کارِ انگریزی کے ، مولوی فضلِ حق کا بڑا رعب اور دبدبہ شہر دہلی میں تھا - خود بادشاہ بھی ان کی خاطرداری کرتے تھے . . .'

''سوانحِ احمدی''

تعریضی شعر یہ ہے :

واقف ہیں ہم کہ حضرتِ دل ایسے شخص ہیں
اور پھر ہم ان کے یار ہیں ، ہم ایسے شخص ہیں!

'یار' کے لفظ سے گمان ہوتا ہے کہ یہ چوٹ غالب پر ہے ، جن کے ان سے خصوصی تعلقات تھے -

خود غالب کی توجیہ یہ ہے کہ دوستی سے مکمل ہم رنگی اور یک آہنگی لازم نہیں آتی :

ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا
ممکن نہیں یک زبان و یک دل ہونا

میں تجھ سے اور مجھ سے تو پوشیدہ :
ہے مفت نگاہ کا مقابل ہونا'

اپنے اور دوسروں کے ظاہر اور باطن کے فرق کی طرف غالب نے کیی جگہ اشارہ کیا ہے :

کوی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے :
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

' متقابل ہے مقابل میرا
غالب

مولوی فضلِ حق کا مزاج :

مولوی فضلِ حق مزاج کے بڑے ترش اور تند اور زبان کے بڑے کڑوے کسیلے تھے - اس کی شکایت ان کے ملنے والے سب شاعروں نے کی ہے :

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ 'تو کیا ہے ؟'
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے !

گرمی سہی کلام میں ، لیکن نہ اس قدر :
کی جس سے بات ، اس نے شکایت ضرور کی

غالب

کب وہ گزرتے ہیں سرِ لاف و گزاف سے
جن کی کہ آشنا ہے زباں لام و کاف سے

(روے سخن اگلے شعر سے واضح ہو جاتا ہے :

لکھتا ہے شیخ مسئلۂ وحدتِ وجود
لیکن دوی عیاں ہے قلم کے شگاف سے)

ذوق

ہر وقت ہے دشنام ، ہر اک بات میں طعنہ

ناصح ہے عیب جوی و دل آزار اس قدر
گویا ثواب ہے سخنِ ناصواب میں !

مومن

غیض و غضب کے عالم میں تو انھیں نہ اپنی زبان پر قابو رہتا تھا ، نہ قلم پر[1] - اس کی انتہای اشتعال انگیز مثال ان کے ایک عربی قصیدے کے یہ شعر ہیں جو مدت ہوی مجھے مولوی راغب بدایونی سے علی گڑھ میں حاصل ہوے تھے - مولوی صاحب کو ، جو ان دنوں یونیورسٹی میں دنیات پڑھاتے تھے ، خیرآبادی خانوادے سے نسبتِ ارادت تھی[2] - میری درخواست پر انھوں نے

---

[1] ناصح ، تری زباں ترے بس میں نہ ہو ، تو پھر
انصاف کر ، کہ دل پہ مرا زور کیا چلے !

مومن

شاہ اسماعیل بھی زبان اور قلم دونوں کے دھنی اور دونوں سے تیر و تفنگ کا کام لینے میں بڑے شیر تھے ، اور مولوی فضلِ حق پر تو کوی ممکن وار نہیں جو انھوں نے نہ کیا ہو ، مگر یہ بالعموم کسی نہ کسی اصول پر مبنی ہوتا تھا ، یا کوی نہ کوی تادیبی پہلو رکھتا تھا - تاہم اس سے ان کے لہجے کی درشتی کا پورا جواز بہم نہیں پہنچتا -

[2] مولوی محمد فضلِ حق مولف کے نانا ، مولوی محمد فضلِ حکیم ، کے چچا تھے -

ان پر ایک نوٹ بھی دیا تھا ، جو اشعار اور ان کے ترجمے کے ساتھ میں بجنسہ نقل کرتا ہوں :

مولانا اسماعیل شہید نے ''تقویۃ الایمان'' میں مسئلۂ شفاعت اور توسل کے سلسلے میں یہ لکھا تھا کہ اللہ چاہے تو ایک آن میں کروڑوں امثال آنحضرت کے پیدا کر دے ۔ علامہ فضلِ حق نے اس کے جواب میں ایک رسالہ 'تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ' لکھا ۔ حضرت شہید نے جواب الجواب میں رسالہ 'یک روزی' لکھا ۔ اس کے جواب میں علامہ نے ایک اور تقریر لکھی جو آخرِ رسالہ 'تحقیق الفتویٰ' میں درج ہے ۔ اس کا جواب حضرتِ شہید نے پنجاب کے سفر کے بعد لکھنے کا وعدہ کیا جو مشیتِ الٰہی سے پورا نہ ہوا ۔ جب علامہ ٹونک گیے ، تو ملا سید حیدر علی نے اس فتوی کا جواب لکھا ، جس کا رد علامہ کے ایک شاگرد نے لکھا ، جو مولانا سلیمان اشرف مرحوم نے 'امتناع النظیر' کے نام سے چھپوایا ۔ ملا حیدر علی نے علامہ کی ہجو میں دو شعر لکھے تھے ، جن کے جواب میں انھوں نے ایک قصیدہ ۱۱۲ اشعار کا لکھا ۔ ملا حیدر کا شعر تھا :

اَتَہْجُوْ عَالِمًا بِرًّا تَقِیًا

وَ عِنْدَاللہِ فِیْ ذَاکَ اِنْتِقَامٗ

کیا تو ایک نیک ، متقی عالم کی ہجو کرتا ہے ؟ اور اللہ کے نزدیک یہ موجبِ انتقام ہے -

علامہ نے جواب میں یہ اشعار لکھے :

اَتَمْدَحُ جَاهِلًا شَرًّا شَقِيًّا
تَدَارَكَهُ مِنَ اللهِ انْتِقَام

کیا تو ایک جاہل ، شریر ، بدبخت کی مدح کرتا ہے جس سے اللہ نے انتقام لے لیا ؟

پھر گیارہ اشعار کے بعد لکھا :

غَوِی فَاخْتَارَ کُفْرَ النَّجْدِ دِيْنًا
فَدَانَ لَهُ مِنَ الْجَمْعِ فِئَام

وہ ایک گمراہ شخص تھا ، جس نے نجد کے کفر کو اپنا دین ٹھہرانا پسند کیا - کچھ احمقوں کی جماعت اس کے تابع ہو گئی -

وَ سُوْقُ نِفَاقِهٖ نَفَقَتْ فَبَاعُوا
الْهُدٰی وَ يَاتُوْا طِغَام

اس کے نفاق کا بازار گرم ہوا ، اور لوگوں نے ہدایت کو بیچ ڈالا اور وہ رذیل اور کمینے ہو گیے -

وَ شَايَعَهٗ اِلٰی اَرْضٍ وَ خَامٍ
وِ خَامُ سَلْفَةٍ نَكَصُوْا وَ خَاسُوْا

ایک ناموافق آب و ہوا والی سرزمین کی طرف اس کے ساتھ ایسے لوگ چل پڑے جو خیر سے دور تھے -

يُسَمِّي الْجُهْدَ فِي الطَّغْوٰی جِهَادًا
فَصَارَ اِلَيْهِ مِنْ رَجْمٍ جُمَامٗ

اس نے اپنی سعیِ ضلالت کو جہاد کے نام سے موسوم کیا ، سو شیاطین کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہو لی -

بِذَا الْكَيْدِ اِقْتَنٰی مَالًا كَثِيْرًا
فَكَانَ لَهٗ بِذَا الْكَيْدِ اغْتِنَامٗ

اس مکر و فریب سے اس نے بہت سا مال جمع کر لیا ، اور اس کی غرض ہی مالِ غنیمت حاصل کرنا تھی -

اَرٰی عَطْشٰی سَرَابًا مِنْ بَعِيْدٍ
فَحَفُّوْا حَوْلَهٗ هِيْمًا وَّ حَامٗ

اس نے پیاسوں کو دور سے سراب دکھایا ، سو اس کے گرد بہت سے سر پھرے پیاسے چکر لگانے لگے -

پھر حضرت شہید کی علمی تہی مایگی کو اس شعر میں ظاہر کیا ہے :

اَضَاعَ الْعُمْرَ فِیْ عَوْمٍ وَّ نَوْمٍ
وَ لَمْ یَکُ مِنْہُ بِالْعِلْمِ اِھْتِمَامْ

اس نے ساری عمر تیرنے[۱] اور سونے میں گزاری ، اور اسے علم سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔

پھر بتایا ہے کہ نہ وہ اول کے معنی سمجھتے ہیں ، نہ خاتم کے ، اور علما نے قرآن و حدیث کے جو معنی سمجھے اور بیان کیے ہیں ، بلا دلیل ان کی مخالفت کرتے ہیں ۔

ان اشعار پر ، شاہ صاحب کے عقیدت مند تو الگ رہے ، ہر معقول شخص کو جتنا طیش آئے کم ہے ۔ ان ناگفتہ بہ اشعار کو نقل کرنا یوں ضروری سمجھا گیا کہ ان سے نہ صرف اس عہد کے بلکہ بعد کے شاعر (اقبال سمیت) سخت مشتعل ہوے ہیں ، اور جو ناواجب الزامات ان میں شاہ صاحب پر جڑے گیے ہیں ، ان کا جواب ہر شاعر نے اپنے اپنے طریقے سے (اور بعض اوقات ترکی بہ

[۱] 'آپ (شاہ اسماعیل) تین تین دن دریا میں پڑے رہتے تھے ۔ ۔ ۔ جب طلبہ جمع ہو جاتے تھے ، تو کنارے پر آ کے سبق پڑھا دیا کرتے تھے ۔ اس کثرت سے پانی میں رہنے نے آپ کو 'جل مانس' کا لقب دلوا دیا تھا ۔ ۔ ۔ مولانا دریاے جمن کی راہ سے دہلی سے آگرہ اور آگرہ سے دہلی کیی بار ہو آے ۔' ''حیاتِ طیبہ'' ۳۱

ترکی ، مولوی صاحب ہی کے لب و لہجے میں) بار بار اپنے کلام میں دیا ہے ۔

فضلِ حق اور مومن :

مومن جہاد اور داعیِ جہاد کے مخالفوں کو ، جن کے سرغنہ مولوی فضلِ حق تھے ، کس نظر سے دیکھتے تھے ، اس کے بارے میں انہوں نے کوی لگی لپٹی نہیں رکھی :

گہ کہتا ہے 'جنوں' عشق کو ، گہ 'کفر و حرام' :
جہل کرنے کو پڑھے تھے مرے ناصح نے علوم !

یہ چند منافقِ سراپا بدعت
ہے کفر و ضلال و فسق جن کی طینت

بتلاتے ہیں 'بدعتی' امامِ حق کو
گویا کہ جہاد ہے خلافِ سنت !

ہم سمجھے ہیں معنیِ حقیقی ، یعنی
حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہلِ تقلید

توحیدِ وجودی سے بھی ، جس کے مولوی صاحب قایل تھے ، مومن اختلاف رکھتے تھے :

توحیدِ وجودی میں جو ہے کیفیت
ڈرتا ہوں یہ حیلہ خود پرستی کا نہ ہو

پنے بعض اشعار میں مومن نے مولوی صاحب کے ایسے گستاخانہ فقروں کو جواباً الٹایا ہے جو انھوں نے شاہ صاحب کی موعظانہ سرگرمی پر کسے ہیں:

'کوی سنتا ہی نہیں : بکتا ہے کیوں دیوانہ وار ؟'

سنا اس نے مرا نالہ : اثر بھی کچھ ہوا شاید
کہ دشمن کہہ گیا : 'بے فایدہ کیوں غل مچاتا ہے ؟'

سچ ہے ، کافر تری تقریر سے کیوں کر نہ جلیں ؟
شعلۂ آتشِ دوزخ ہے زباں ، اے واعظ !

کیا شاد کام ہوں ، کہ وہ ہے تلخ کام تر
میری جو شورشوں نے عدو کو مزا دیا !

مومن کو خود اس قسم کے اشعار کے بے مزا ہونے کا اندازہ تھا :

ہجوِ ملیح غیر سمجھ کر اٹھاے لطف :
خوش حرفِ بے نمک سے بھی ہم دل فگار ہیں

البتہ 'ناصح' کے جواب میں ، جو ان کی شاعری میں مولوی صاحب کا دوسرا روپ ہے ، کچھ ایسے شعر بھی ہو گیے ہیں جن میں مومن

نے لطف کا کوی نہ کوی پہلو نکال لیا ہے :

نہ مانوں گا نصیحت : پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات پر ناصح تمھارا نام لیتا تھا ؟

مولوی صاحب کے نزدیک جہاد کا انجام ہلاکت : مومن کی نظر میں بشارت:

فرماتے ہیں : 'وصال ہے انجامِ کارِ عشق'
کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سنا دیا !

ناصح ، کفِ افسوس نہ مل ، چل ، تجھے کیا کام
پامال کریں گے وہ مجھے ، یا نہ کریں گے ؟

(ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں
یوں کرتے ہیں ، گویا نہ کریں گے !)

مولوی صاحب کی شاہ صاحب سے بد دل کرنے کی کوشش کا تیز جواب :

چاہتا ہے کہ دل اس تنگ قبا سے پھٹ جاے
میرے ناصح کا ہے دنیا سے نرالا اخلاص !

مومن ، اس زہدِ ریای سے بھی کیا بدتر ہے
اس 'بتِ دشمنِ ایماں' سے ہمارا اخلاص ؟

مولوی صاحب سے قطع تعلق کرنے اور عداوت پر فخر :

میں ترکِ وفا سے بھی وفادار ہوں مشہور :
کیں تجھ سے جو ، اے دشمنِ اربابِ وفا ، ہے

میں کینے سے بھی خوش ہوں ، کہ سب یہ تو کہتے ہیں :
اس فتنہ گر کو لاگ ہے اس مبتلا کے ساتھ

(سید صاحب اور شاہ صاحب کے 'مبتلا' : مومن ؛ 'فتنہ گر' : مولوی صاحب)

مولوی صاحب کا خوابِ غفلت سے جگانے والوں پر عتاب :

اس کی گلی ہے : نالۂ زنجیر ، غل نہ کر :
یاں پاؤں جاگتے ہیں کوی جا کے خواب میں!

ان نالہ ہاے شب کا اثر صبح دیکھیو
آیا خلل گر اس ستم آرا کے خواب میں !

مولوی فضلِ حق سے شاعروں کے اختلاف کی ایک بنیادی وجہ ان کی انگریز دوستی بھی تھی - وہ اس زمانے میں ان کے وابستۂ دامن تھے ، اور جب ان کے سامنے انگریزوں کی چیرہ دستیوں کا تذکرہ چھڑتا اور ان کی شکایت کی جاتی ، تو وہ کبھی تو سن کر چپ سادھ لیتے، مگر اکثر ان کے جواز میں دلیلیں تراشتے - مومن ان کی

ان دونوں حرکتوں سے جلتے تھے :

آوازِ گنبد اس سے شکایت عدو کی تھی

گرمِ جوابِ شکوۂ جورِ عدو رہا :
اس شعلہ خو نے جان جلای تمام رات !

فضلِ حق اور ذوق :

ذوق نے افلاطون کو فلسفہ طرازی کا نشان بنا کر سید صاحب اور شاہ صاحب کے گفتار و کردار ، علم و عمل کی یک جای کے مقابلے میں مولوی فضلِ حق کی مجرد علمیت اور جدوجہاد سے گریز پر یہ محاکمہ کیا ہے :

علم جس کا عشق ، اور جس کا عمل وحشت نہیں
وہ فلاطوں ہے تو اپنے قابلِ صحبت نہیں[1]

ہوش کا دعویٰ ہے بے ہوشوں کو زیرِ آسماں :
خم نشیں ہیں ، مثلِ افلاطوں ، سب اس خم خانے میں

---

[1] عمل گر ہے تو کیفیت ہے ، ورنہ علم خالی کیا ؟
نہ پایا قطرۂ مے ، مل گیا گر خم فلاطوں کو

ناسخ

بل بے میرے ساغرِ سرشارِ وحشت کا نشہ !
چھپ گیا خم میں ، مری صورت فلاطوں دیکھ کر[۱]

یہ 'خم' انگریزوں کا 'سایہ' عاطفت' ہے -

علم کی درماندگی :

علم سے ہو نہ کبھی چارۂ آزار نصیب

درسِ توحید سے لو، ایک شفا کا نسخہ :
بحث میں علت و معلول کے ہے عقل علیل

ذوق نے مولوی صاحب کی تحریکِ جہاد کی مخالفت پر کچھ نرم اور کچھ گرم چوٹیں کی ہیں :

منظورِ چشمِ یار ہے سب عینِ مصلحت :
پوچھے بلا کشوں سے کسی کی بلا صلاح !

اے ذوق ، جا نہ ہوش و خرد کی صلاح پر :
جو عشق دے صلاح ، وہی ہے بجا صلاح

۱ از اہلِ اعجازِ جنوں سے عقل کا افسوں ہوا

آتش

مردار ہیں ، وہ طایرِ سدرہ ہی کیوں نہ ہوں
تیرِ نگہِ یار کی جو دور زد سے ہیں[1]

جا ان لباسیوں کے نہ ظاہر لباس پر
عاری قبائے ہوش و عبائے خرد سے ہیں

کچھ ایسے اشعار بھی ہیں جن میں مولوی صاحب کی بدکلامی کے جواب میں اسی قسم کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے :

نشۂ علم میں سر مستِ غرور و نخوت

آدمیت اور شے ہے ، علم ہے کچھ اور چیز :
کتنا طوطے کو پڑھایا ، پر وہ حیواں ہی رہا

رہا ٹیڑھا ، مثالِ نیشِ کژدم :
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

---

[1] جو شعر سید صاحب اکثر پڑھا کرتے تھے ، ان میں یہ بھی تھے :

در مسلخِ عشق جز نکو را نہ کشند
لاغر صفتانِ زشت خو را نہ کشند

گر عاشقِ صادقی ، ز کشتن مگریز :
مردار بود آن ، کہ او را نہ کشند

جھوٹ ہی جانو کلام اس رہ زنِ ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آے اگر قرآن کا

یہ حزیں کے اس شعر پر مبنی ہے :

زاہد چو کند جامہ ز مصحف ، مفریبید :
اے سادہ دلان ، خرقۂ سالوس ہمان است

فضلِ حق اور شیفتہ :

شیفتہ نے دو غزلوں کے چند شعروں میں سید صاحب اور مولوی فضلِ حق کو اپنا مخاطب بنایا ہے ۔ ان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ دونوں کی نسبت وہ کس قسم کے جذبات رکھتے تھے :

آج ہی تیری جگہ کچھ سینہ و دل میں نہیں :
مثلِ تیرِ غمزہ ، ظالم ، دل نشیں تو کب نہ تھا؟

جستجو میں سرمۂ تسخیر کے ہم کب نہ تھے ؟
چشمِ افسوں ساز سے سحر آفریں تو کب نہ تھا ؟[1]

ناصح و واعظ کے مطعوں ، اے صنم، ہم کب نہ تھے؟
آفتِ جاں و بلاے عقل و دیں ، تو کب نہ تھا ؟

---

[1] یہ کس کی چشمِ فسوں گر نے کی فسوں سازی ؟
طلسمِ جادوے بابل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا ، حضرتِ ناصح ؟
طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو !

دوسرے مصرعے میں وہ 'صفات' بیان کی ہیں جو سید صاحب اور شاہ صاحب سے منسوب کر کے مولوی صاحب انہیں 'مطعون' کرتے تھے -

دو شعروں میں مولوی صاحب کی تند و تیز مخاصمت کا کھلم کھلا ذکر کیا ہے :

آج ہی کیا آگ ہے ؟ سرگرمِ کیں ،تو کب نہ تھا ؟
شمع ساں ، مجبورِ خوئے آتشیں تو کب نہ تھا ؟

آج ہی ہر بات پر بے وجہ کیا رکتا ہے تو ؟
اے ستم گر ، بر سرِ پرخاش و کیں تو کب نہ تھا ؟

اس کے علاوہ بھی شیفتہ نے مولوی صاحب پر سخت چوٹیں کی ہیں :

ہر کام فلسفی کا سفاہت کے ساتھ ہے
ہر بات منطقی کی مراؤ جدال ہے

اربابِ حکمتِ نظری کو عمل نہیں :
اہلِ کلام کو ہوسِ قیل و قال ہے

سید صاحب اور شاہ صاحب کی تحریک سے فکری اتفاق اور مولوی صاحب سے اختلاف :

جو قیس کی روش تھی ، وہی اپنی راہ ہے :[1]
دونوں سلیم فکر ہیں کیوں اختلاف ہو ؟

قیس کو جو 'خفیف العقل' کہیے
رائے اس شخص کی سدید نہیں

فارسی میں بھی 'گفتارِ بوعلی' پر 'طریقۂ مجنوں' کو ترجیح دی ہے :

صد گونہ اعتراض بہ گفتارِ بوعلی است :
تعریض بہ طریقۂ مجنون نہ کردہ کس

'طریقۂ مجنوں' کا ساتھ شیفتہ کس حد تک دینے کو تیار تھے ، یہ انھوں نے بڑی صاف گوی سے واضح کر دیا ہے :

دل دیں گے ، مال دیں گے ، مگر جان ، سو بخیر!
بیہودہ ہے وہ شخص جو سرگرمِ لاف ہو

'سرگرمِ لاف' کی زد میں اس وقت کے سب ہی شاعر آ گیے ، جو اس ضمن میں اپنی جاں نثاری کا ڈنکا پیٹتے رہے -

آتش نے ان سب کے بلند بانگ دعووں کو یک قلم جھٹلا دیا ہے :

آتش ، برا نہ مانیو : حق حق جو پوچھیے
شاعر ہیں ہم : دروغ ہمارا کلام ہے

---

[1] وہی مذہب ہے اپنا بھی جو قیس و کوہ کن کا تھا :
نئی راہ افترا ہے : کب بھلا مومن نے بدعت کی ؟

شاہ صاحب کی عارضی زبان بندی پر شاعروں کا ردِ عمل

مہر صاحب ''سید احمد شہید'' میں میرزا حیرت دہلوی کی ''حیاتِ طیبہ'' کی بابت لکھتے ہیں :

'یہ اصل میں شاہ اسماعیل شہید کی سیرت ہے - - - یہ کتاب تاریخ نہیں ، بلکہ افسانہ ہے - - - یہ کتاب سراسر ناقابلِ اعتماد ہے -'

جن امور کی انھوں نے وضاحت کی ہے ، ان کے بارے میں تو یہ واقعی 'سراسر ناقابلِ اعتماد' ہے البتہ ایک معاملہ اس میں ایسا درج ہے جو پہلی بار میری نظر سے گزرا تو میں نے بھی اسے مولف کا طبع زاد سمجھا - مگر جب غالب ، ذوق ، مومن اور شیفتہ چاروں کے کلام سے اس کی تصدیق ہو گئی تو ، بعض ڈرامای جزیات کو چھوڑ کر ، چار و ناچار اسے صحیح ماننا پڑا - یہ شاہ اسماعیل کی عارضی زبان بندی کا واقعہ ہے - پہلے اس کی پوری روداد میرزا حیرت کی زبانی سنیے :

مولوی فضلِ حق صاحب اپنی عالی دماغی ، جودت طبع اور علوم عربی (معقول) میں قابلیتِ تامہ رکھتے تھے . . . ان کی لاثانی معقولی قابلیت اور قانونی دماغ نے مجبور کیا کہ وہ ملازمت انگریزی

کریں۔۔۔اس سررشتہ داری میں انھیں وہ دبدبہ اور شوکت و قوت حاصل تھی جو اس زمانے میں ڈپٹی کمشنر کو ہے۔ آپ کے مکان پر اہلِ مقدمہ کا دربار لگا رہتا تھا اور زندگی نہایت عزت اور آرام سے بسر ہوتی تھی۔۔۔

جب مولانا شہید کے وعظ پر نیے نیے حاشیے یار لوگوں نے چڑھائے، اور شہر میں خواہ مخواہ ایک تلاطم برپا ہوا تو منطقی صاحب بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔۔۔آپ کو اپنی سرکاری قوت کی مخالفانہ آزمایش کا پہلا موقع شہید پر ملا۔۔۔ ریزیڈنٹ کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ مولانا شہید کے وعظ سے امن میں خلل پڑنے کا خوف ہے۔۔۔

جب مختلف مضامین پر وعظ ہوئے تو لوگوں میں۔۔۔ایک شورش سی پھیل گیی۔۔۔اب انھوں نے (انگریزی) عدالت کی طرف رجوع کرنی شروع کی، کیونکہ اکبر شاہ کی طرف سے تو صاف جواب مل چکا تھا۔ مگر عدالت میں جانے سے پہلے انھیں ضرور ہوا کہ وہ مولوی فضل حق صاحب سے مشورہ کر لیں کہ کیا تدبیر کرنی چاہیے۔ مولوی منطقی صاحب ریزیڈنٹ کے بڑے منہ چڑھے معتبر تھے اور وہ ان ہی کے کہنے پر زیادہ چلتا تھا۔ جب یہ لوگ سررشتہ‌دار صاحب کے پاس پہنچے اور ساری کیفیت عرض کی تو وہ آب دیدہ ہوکے کہنے لگے کہ 'اسمعیل دینِ محمدی کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہنے گا۔' یہ مولوی منطقی صاحب کا پہلا جملہ تھا۔ جو

انھوں نے پیارے شہید کی نسبت استعمال کیا - عوام الناس نے پھر یہ فریاد کی کہ 'وہ صوفیوں کو بر ملا گالیاں دیتے ہیں اور ہم سنتے ہیں - کیا کریں ؟ آپ کچھ مدد کریں ، ورنہ سارے مسلمان اس پر آمادہ ہیں کہ شہر سے جلا وطن ہو جاییں -'

مولوی فضلِ حق صاحب پہلے ہی شہید کی طرف سے خون کے گھونٹ پی رہے تھے اور دانت پیس رہے تھے - انھیں اپنی کام یابی کی یہ فال نیک معلوم ہوی اور انھوں نے فوراً اپنے منشی سے ایک عرضی عام مسلمانوں کی ناراضی کی صاحب ریزیڈنٹ کو لکھوای اور اس پر پندرہ سو دستخط کراے اور وہ عرضی ریزیڈنٹ کو ان الفاظ میں لکھ کے دی :

'حضور، میں کیی بار عرض کر چکا تھا ، آپ نے توجہ مبذول نہیں فرمای - دیکھیے معاملہ طول پکڑتا جاتا ہے - کیا عجب کہ ذرا سی بے توجہی پر فوجی قوت کی ، بلوا رفع کرنے کے لیے ، ضرورت ہو - اس عرضی میں ، جس پر پندرہ سو مسلمانوں کے دستخط ہیں ، صرف مولوی اسماعیل کے وعظ روکنے کی التجا کی گیی ہے - اب حضور کو اختیار ہے ، چاہے جو کچھ اس میں کارروای کریں -'

یہ سنتے ہی ریزیڈنٹ کے ہوش اڑ گیے اور اس نے اس عرضی کو کیی بار بہ غور دیکھا اور یہ الفاظ زبان پر لایا : 'تعجب ہے کہ شاہ عبدالعزیز کا بھتیجا ایسا فسادی ہو !' مولوی فضلِ حق

صاحب نے دوسری تدبیر یہ کی کہ سو پچاس آدمی اپنے ساتھ لے گیے اور انھیں سکھا دیا تھا کہ 'جس وقت صاحب نیچے کی طرف دیکھیں تم واویلا و بکا کرنا اور جو کچھ تمھیں بیان کرنا ہوگا، اس میں چوکنا نہیں۔' غرض یہ ہی ہوا۔ مولوی منطقی صاحب کی مراد برآی اور کوتوال کے نام حکم بھیج دیا گیا کہ آیندہ سے مولوی اسماعیل صاحب وعظ نہ کہنے پائیں۔ ادھر خود مولانا شہید کے پاس بھی ایک حکم نامہ بھیج دیا کہ 'تمھیں سرکار کمپنی کے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی اور تمھارے وعظ سے چونکہ اس میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے روک دیا گیا۔ تاحکمِ ثانی تم عام طور پر وعظ نہیں کہہ سکتے۔' چالیس دن تک وعظ بند رہا...

آخر سوچتے سوچتے شاہ اسماعیل صاحب نے اسی وجہیں ریزیڈنٹ کو لکھ کے بھیجیں اور ثابت کیا کہ اگر میرا وعظ بند رہے گا، تو یہ خرابی واقع ہوگی۔ جوں ہی ریزیڈنٹ نے پیارے شہید کی درخواست کو پڑھا، آنکھیں کھل گئیں... فوراً سرشتہ دار صاحب طلب کیے گیے۔ جوں ہی وہ حاضر ہوے، ریزیڈنٹ نے کہا... 'بڑے افسوس کی بات ہے، مولوی فضل حق صاحب، کہ آپ نے چالیس دن تک شاہ اسماعیل صاحب کا وعظ بند رکھا۔ میری رائے میں یہ بالکل غلط کارروای ہوی ہے اور ایسے بڑے مولوی کے ساتھ ناجایز برتاؤ کیا گیا ہے۔ ابھی حکم لکھ دو کہ وعظ کھولا جاے اور جو کوی مزاحم ہوگا، اسے قانونی سزا دی

جائے گی ۔' یہ سنتے ہی مولوی منطقی صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گیے ، پیروں کے نیچے سے زمین نکل گیی . . . اب یہ تو مجال تھی نہیں کہ ریزیڈنٹ کی کچھ تردید کرتے اور اسے اونچ نیچ سمجھاتے ، بھکاتے . . . ریزیڈنٹ نے بعد ازاں کوتوال کے نام دوسرا حکم جاری کیا ، اور لطف یہ ہے کہ مولوی منطقی صاحب ہی نے وہ حکم لکھا . . .

جب تین چار روز گزر گیے تو مولانا شہید کو بڑا تردد ہوا کہ ہاں نا کا کچھ جواب نہیں آیا . . . اس تردد کو مٹانے کے لیے آخر شاہ صاحب نے یہ ارادہ کیا کہ خود ریزیڈنٹ سے ملیں اور اس سے گفتگو کریں ۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد ریزیڈنٹ نے خود یہ الفاظ کہے : 'مولوی صاحب' ہمارے سرشتہ دار کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا حکم میں نے جاری کر دیا تھا ، مگر جب آپ نے واجبی اور معقول وجہیں لکھیں تو میں نے اسی وقت حکمِ ثانی لکھوا دیا تھا کہ وعظ قدیمی طور پر جاری کیا جائے اور کوی مزاحم نہ ہو ۔ غالباً آپ وعظ فرماتے ہوں گے ۔' مولوی اسماعیل صاحب نے اس حکم سے اپنی لاعلمی ظاہر فرمای ۔ اس پر وہ حیران ہوا اور اس نے تیزی سے کہا : 'شاید آج چھٹا روز ہے کہ اس حکمِ ثانی کے صادر ہونے کا میں قطعی حکم دے چکا ہوں ۔ کیا وجہ ہے کہ فضلِ حق نے اس کی تعمیل نہیں کی ؟' شاہ صاحب نے فرمایا : 'جو دستخطی عرضی میرے خلاف گزری

تھی ، اس کی سچائی کا مولوی فضلِ حق صاحب کی اس بے نظیر عداوت سے اندازہ ہو سکتا ہے ۔' فوراً ایک برق انداز روانہ کیا گیا کہ بہت جلد فضلِ حق کو لائے ۔ چنانچہ منطقی صاحب تشریف لائے اور شاہ صاحب کو دیکھتے ہی . . . سمجھ گیے کہ آج خیر نہیں ہے . . . ناملایم زجر و توبیخ ریزیڈنٹ نے منطقی صاحب کی کی . . . نتیجہ یہ ہوا کہ فضلِ حق صاحب تین مہینے کے لیے معطل کیے گیے ، اور وہ دونوں احکام فوراً جاری ہوگیے ۔' (٦٨-٧١)

زباں بندی کی رو داد :

(شاعروں کی زبانی)

اب ہم اس واقعے کی تایید میں مومن، شیفتہ ، ذوق اور غالب کی شہادت اسی ترتیب سے پیش کرتے ہیں ۔

غمازی پر تعریض :

غیر سے سرگوشیاں کر لیجیے : پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہاے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

رازِ نہاں ہمارا اغیار تک نہ پہنچا :
کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا ؟

غیروں پہ کھل نہ جاے کہیں راز، دیکھنا !
میری طرف بھی ، غمزۂ غماز ، دیکھنا !

کیا کیا دل نے کہ آنکھوں سے کہا رازِ نہاں!
ایسے غماز کو کوئی بھی خبر کرتا ہے؟

فرنگیوں کے خیر خواہ جاسوس کا اندیشہ نہ ہو تو ان کے مظالم کے خلاف جی کھول کے آواز اٹھائی جائے:

فریادِ بے گناہ کشی جا بجا کروں
گر وہمِ جاں نثاریِ پیغام بر نہ ہو!

جاسوسی پر لعنت ملامت:

منہ کو نہ سیا، ناصح، کی بخیہ گری اتنی!
لوں میں بھی ترے لتے؟ ہیں! پردہ دری اتنی!

کر چکے سلکِ درِ اشک کا مذکور، کہ ہم
آج غمازوں کے منہ، دیکھیو تو، بھرتے ہیں!

زباں بندی کے اسباب پر غور اور اس کی خلاف ورزی کا جذبہ:

اے شورِ جنوں، ڈر ہے زباں بند نہ ہو جائے
گر آئے لبوں پر مرے زنداں کی شکایت

کس واسطے، اے شمع، زباں کاٹتے ہیں لوگ؟
کیا تو نے بھی کی تھی شبِ ہجراں کی شکایت؟

مشامِ غیر میں پہنچی ہے نکہتِ گلِ داغ :
یہ بے سبب نہیں بندی ہوا کے آنے کی

زباں بندی پر پیچ و تاب :

کیا مجھ میں دم بھی لینے کی طاقت نہیں رہی ؟
کیوں شورِ نالہ ہاے عزا بار کم ہوا ؟

اب کیجیے آہِ تاب گسل برجفا کے ساتھ :
جب جان سے گزر گیے ، پھر در گزر نہ ہو !

پابندیوں کے باوجود ، شاہ صاحب اور ان کے ہم نوا شاعروں کی شورش افزای :

کس ضبط پر شرار فشاں ہے فغانِ شمع :
اک برق تھی ، جو لال نہ ہوتی زبانِ شمع !

شیفتہ :

وعظ بند کرانے کے لیے ریزیڈنٹ سے شکایت :

دشمن سے ہے میرے دلِ مضطر کی شکایت
کیوں کر نہ کروں شوخیِ دل بر کی شکایت ؟

کیوں بوالہوسوں سے دلِ عاشق کا گلہ ہے ؟
غیروں سے بھی کرتا ہے کوی گھر کی شکایت؟

غیر سے حرفِ تمنائے جفا کہتے ہو !
کس سے کہتے ہو؟ تمھیں خیر ہے؟ کیا کہتے ہو!

('حرفِ تمنائے جفا'، یعنی درسِ جد و جہاد)

نقضِ امن کا خطرہ ظاہر کرکے وعظ رکوانے کی ناواجب کوشش :

متاعِ دانش و دیں کی ضرور ہے تعلیم :
کہاں بے ادبی ہے سخن اماں کے لیے

وعظ کے خلاف محضر پر مولوی صاحب کا احتیاطاً دستخط نہ کرنا :

غرض یہ ہے کہ مکر جاییں ، گر پڑے حاجت
کہ مہر نامے یہ کرتے نہیں نشاں کے لیے

مسجد میں وعظ بند کرانے والے کے حق میں 'دعاے خیر' :

نہ مے کدے میں ترانہ ، نہ خانقہ میں سماع :
دعاے خیر ہے اس آفتِ جہاں کے لیے[1]

اس کاوشِ بے جا میں بالآخر ناکامی کا منہ دیکھنا :

سنی اکابرِ ایواں سے آخر آیۂ یاس :
غلط تھی پہلی ہی کوشش خطِ اماں کے لیے

پابندیوں کے باوجود ، اعلاء کلمۃ الحق :

ہمارے ساتھ ہیں وہ موشگافیاں ، کہ نہ پوچھ !
یہ نکتہ بس ہے، کہ آفت ہے نکتہ داں کے لیے !

یہ ضبطِ راز کی تعلیم ، شیفتہ ، بے جا :
زباں ہم کو ملی ہے اگر بیاں کے لیے

جفاے شحنہ ہے منظور ، پر نہیں منظور
خلافِ شیوۂ رندانِ بادہ خوار[2] مجھے

---

[1] نے شور ہاے و ہوے ، نے دشنہ و کوے :
در بزمِ وعظ از عشق در سے مکر نہ باشد ؟

تنہا ہمین نہ عیبم ، کز دوست می گریزم :
با دشمن است راہم : از من تبر نہ باشد

حسرتی

[2] کارِ رندان ہمہ جان بازی و خون آشامی ہست

حسرتی

غمازی کی بنا پر فضلِ حق سے کدورت :

افشائے رازِ عشق میں ضرب المثل ہے وہ :
کیونکر غبار دل میں نہ رکھیں صبا سے ہم ؟

ریزیڈنٹ کے عتاب پر خوشی :

کیا غیر پر بھی شعلۂ برقِ غضب پڑا ؟
ٹھنڈک سی آج کچھ مرے دل کی جلن میں ہے

ذوق :

وعظ کی گرم بازاری کے رشک سے اس کے مطالب کی چغلی :

حق تو یوں ہے، یہ انانیت بڑی غماز ہے :
قصہ پہنچایا زبانِ دار پر منصور کا

کس نے پہنچایا ؟ کیوں پہنچایا ؟ قصہ کی نوعیت کیا تھی ؟ قصہ گو کون تھا ؟ ان سب سوالوں کا جواب اس شعر میں موجود ہے -

یہ بہتان کس نے افشائے محبت کا یہاں باندھا
کہ، بعد از مرگ، تو نے منہ کو میرے، بدگماں، باندھا

'بہتان' تو یہ نہ تھا، مگر افشائے راز سے ریزیڈنٹ کو زبان بندی کا بہانہ مل گیا، جو یہ نہیں چاہتا تھا کہ مردہ قبر میں کروٹ لے -

مسجد میں جوشیلے وعظ کے دوبارہ اجرا پر جوش و خروش :

نسیم کیا ہے ، کہ روضے میں تفتہ جانوں کے
نہ گل ہو باد سے آوازِ صور کی قندیل

ہمارے کعبہٴ دل میں ہمیشہ روشن ہے
کسی کے بابِ کمالِ ظہور کی قندیل

غالب :

یہ معاملہ مولوی صاحب سے تعلقات کی بنا پر غالب کے لیے خصوصاً نازک تھا[1]، اور وہ اس سے چشم پوشی کے لیے بھی تیار نہ تھے ، اس لیے اس کا ذکر انھیں بڑے ترچھے طریقے سے کرنا پڑا ۔

مولوی صاحب کا ریزیڈنٹ کو ایسی عرضی پیش کرنا جو شاہ صاحب کی رسوای کا موجب ہو :

عرض خود برد ، کہ رسوایِ ما خیزد از او

---

[1] غالب ، از راہِ مصلحت ، تحریکِ جہاد کی مخالفت میں اس ڈر سے بھی مولوی فضلِ حق کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے کہ کہیں وہ چغلی نہ کر دیں :

تا کرے نہ غمازی ، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم زباں اپنا!

یہ وہی 'دشمن' ہے ، جس کے علی الرغم ، غالب نے خود کو 'شہیدِ وفا' بھی کہا ہے ۔

اُسے یہ کہہ کر شاہ صاحب کے خلاف بھڑکانا کہ یہ بڑے شعلہ مزاج ہیں ، خدا جانے کیا کہہ اور کر گزریں :

طفل است و تند خوے : نہ بینم چہ می کند!

ایک اور مصرع پہلودار ہے: اسے شاہ صاحب کے متعلق مولوی صاحب کی رائے بھی سمجھا جا سکتا ہے ، جو انھیں 'فتنہ' اور 'بلا' قرار دیتے تھے ، اور اس ضمن میں مولوی صاحب کی فتنہ انگیزی پر غالب کی چوٹ بھی :

فتنہ خوے است : نہ دانم چہ بلا خیزد از او!

اس ہنگامے میں شاہ صاحب کی بجاے 'شیخِ شہر' کی رسوای اور خجالت :

بہ شہر شہرتِ حسنِ تو ، فتنہ انگیخت
کہ شیخِ شہر خجالت ز شہر یار کشد

'شہر یار' جس سے شیخ صاحب کو ذلت اٹھانی پڑی ریزیڈنٹ تھا ، جو دلی کا اصل حاکم تھا ۔

غالب نے اس ناگوار واقع کا آزادیِ اظہار کے پہلو سے بھی جائزہ لیا ہے ۔

زبان بندی کی وجہ سے حاجت مندوں کی پرسشِ احوال نہ کر سکتا :

بہ بندِ پرسشِ عالم نہ می توان افتاد
توان شناخت ز بندے کہ بر زبان افتاد

مظلوم کو فریاد سے روکنے کی زیادتی :

زندانیے اگر طلبد وایہ ز شاہ
بند از عسس نہ توان بر زبان نہاد

ایک شعر میں جاسوسی پر بڑی چبھتی ہوی تعریض ہے ، اور 'ناحق' سے جاسوس کی نشان دہی بھی کر دی ہے :

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق :
آدمی کوی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا ؟

---

[1] اس واقعے کو آتش نے یوں بیان کیا ہے :

نہ سنی یار نے اک بات سخن سازوں کی :
رہ گئے کھول کے منہ مفسدہ پرواز اپنا

زباں بندی پر خواجہ صاحب کا ردعمل یہ ہے :

پر کترنے سے تو صیاد چھری ہی پھیرے :
قصہ کوتاہ کرے حسرتِ پرواز اپنا !

بہ رنگِ شمع ، ہم دل سوختوں نے بزمِ عالم میں
زباں کھولی ، نہ لیکن بات کرنے کا محمل پایا
آتش

غالب نے اپنا مسلک بڑی 'حق گوی و بے باکی' سے واضح کیا ہے:

حاشا کہ ستایم رقمِ قاضی و مفتی!
حاشا کہ پزیرم عملِ شحنہ و عامل!

رنجِ صاحب دلان روا نہ بود:
بندِ اہلِ زبان نہ می خواہم

اس اصول کی تائید، تمام مزاحمتوں کے باوجود، وہ ساری عمر کرتے رہے:

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوے

غالب اور فضلِ حق کے فکری اور شخصی تعلقات

مولانا فضلِ حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے۔۔۔ چونکہ مولانا کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی، انھوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمائش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو، جس میں ان کے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید، اور خاص کر امتناعِ نظیرِ خاتم النبیین کے مسئلے کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کرو۔ اس مسئلے میں مولانا اسماعیل شہید کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے، ممتنع بالذات نہیں ہے؛ یعنی آں حضرت کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے، نہ اس لیے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ برخلاف اس کے، مولانا فضلِ حق کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے اور جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا، اسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا۔۔۔

چونکہ مرزا نے (اس) مسئلے کے بارے میں کسی قدر مولانا کی رائے کے خلاف لکھا تھا۔ اس پر مولانا سخت ناراض ہوے۔۔۔

مولانا نے فرمایا کہ 'یہ تم نے کیا بکا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں ؟ نہیں ، بلکہ اگر لاکھ عالم خدا پیدا کرے ، تو بھی خاتم النبیین ایک ہی ہوگا - پس اس مضمون کو مثنوی میں سے بالکل نکال ڈالو ، اور جس طرح میں کہتا ہوں ، اس طرح بیان کرو -' مرزا کو نہ وہابیوں سے کچھ خصومت تھی اور نہ ان کے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا[1]، بلکہ صرف دوست کی رضاجوی مقصود تھی - انھوں نے مولانا کے حکم کی فوراً تعمیل کی ؛ جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے اس کو تو اسی طرح رہنے دیا ، مگر اس کے آگے چند اشعار اور اضافہ کر کے کلام کو . . . مربوط کر دیا . . . اوپر کے بیان سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا کہ مرزا کی طبیعت میں کتنی سلامت روی تھی ، اور اعوجاج سے کس قدر ان کا ذہن ابا کرتا تھا . . . . جس طرح ایک ٹیڑھی چیز نلکی میں آ کر سیدھی

---

[1] یہ بات خواجہ صاحب نے حکومتِ وقت کی 'وہابیوں' سے خصومت کی بنا پر ، از راہِ 'مصلحت اندیشی' لکھی ہے ، ورنہ وہ خوب جانتے تھے کہ مرزا صاحب ان 'وہابی' عقیدوں کے جو شاہ اسماعیل رکھتے تھے ، دل و جان سے قایل تھے - اس پر ان کا سارا کلام شاہدِ ناطق ہے - تعجب ہے کہ پھر بھی شیخ محمد اکرام سے یہ روشن حقیقت پوشیدہ رہی :

'شاہ صاحب اور مرزا صاحب کے خیالات کی راہیں مختلف تھیں . . . ان دونوں تحریکوں (ذہنی اور مذہبی) کا جو اثر مرزا پر ہوا ہوگا ، وہ تو غیر محسوس اور کسی حد تک قیاسی ہے' -

"آثارِ غالب"

ہو جاتی ہے ، اسی طرح مرزا کی راست بیانی نے اس ٹیڑھی رائے کے تمام بل نکال ڈالے ، اور بغیر اس کے کہ مرزا کو وہابیوں کی حمایت منظور ہو ، جو بات ٹھیک تھی ، وہ ان کے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑی ۔ پھر اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے ، وہ مولانا کے جبر سے لکھا ہے ، اس کو مرزا کے اصلی خیالات سے کچھ تعلق نہیں ۔

"یادگارِ غالب"

یہی بات مولانا ابوالکلام آزاد نے مہر صاحب کی "غالب" میں ان الفاظ میں کہی ہے :

'مولانا شہید نے "تقویۃالایمان" میں لکھ دیا ہے کہ اگر خدا چاہے تو ایک پل میں کڑوڑوں آں حضرت صلعم کے امثال پیدا کر دے ۔ یہ بات ان (مولانا فضلِ حق) پر بہت شاق گزری ، اور معقولات کی رنگ آمیزیوں سے ایک تقریر اس کی رد میں لکھی ۔ دعویٰ یہ کیا کہ نظیر خاتم النبیین کا پیدا ہونا ممتنع بالذات ہے ، اور پھر ، قدرت اور مشیت کا فرق فراموش کر کے ، سارا معاملہ مشیت کے فعل میں لے گیے ۔ ساری تقریر محض جدل و مناظرہ کا ایک گورکھ دھندا تھی ۔ یہ مسئلہ اس درجہ بے معنی تھا کہ مرزا صاحب کا ذہن اس کو قبول نہ کرسکا' (۲۷۸)

اس مسلک کے باب میں دو شاعروں نے اپنا اپنا عقیدہ بڑی شدت سے بیان کیا ہے:

ہوا تجھ سا، نہ ہوسکتا ہے: میرا ہے یہی ایماں
نہ مانو مسئلہ ہرگز کسی زندیق و مرتد کا

شہیدی

ترا ثانی، بہ امکانِ وقوعی، ہو نہیں ہو سکتا
نفی امکانِ مطلق کی مگر ہے قولؔ مرتد کا

عبدالرحمن دہلوی

مولوی فضلِ حق نے غالب کا آردو کلامِ انتخاب کرنے کے سلسلے میں جو 'خدمت' انجام دی، اس پر غالب کا ردعمل کیا تھا؟ اس کا اندازہ ایک تو یوں لگایا جا سکتا ہے، غالب نے اپنے مسترد کلام کو تلف ہونے سے کسی نہ کسی جتن سے بچا لیا۔ انتخاب کی کاٹ چھانٹ سے ان پر کیا گزری، یہ خود ان کی زبان سے سنیے:

دودِ چراغ در شب و خونِ جگر بہ روز
سی سال خوردم، و فلکش رایگان نہاد

یا قوت چید گر ز بساطم، سفال خواند
ور خود پلاس داد بہ من، پرنیان نہاد

از شہر تے کہ سزدِ جگر کا وی ِ من است
بر جانِ من سپاسِ ہزار ارمغان نہاد

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں 'فلک' سے روے سخن کس طرف ہے ، ایک اور مصرعے میں لفظ 'پیش کار' سے واضح ہو جاتا ہے :

دانم کہ آسمان بہ زمین پیش کارِ کیست

اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب کو مولوی صاحب کی مربیانہ خود پسندی کی روش سخت ناگوار تھی ۔ میری دانست میں اس مصرعے کی ضمیر بھی انھی کی طرف راجع ہے :

بدگمان و نکتہ چین و عیب جویش دیدہ ام

اور اس مصرعے کے مخاطب بھی وہی ہیں :

از نکتہ چینی در گزر : فرہنگ و ادراکش نگر!

غالب بعض ہم عصروں کی نظر میں

ذوق اور غالب :

غالب اور ذوق کی باہمی چشمک جواں بخت کے سہرے اور

آنچہ در گفتار فخرِ تست ، ان ننگِ من است

تک محدود نہ تھی[1] - تفصیل میں پڑنے کا تو یہ موقع نہیں ، دونوں کی ایک دوسرے پر چند چوٹوں اور ان کے محرکات کی سرسری تشریح کی جاتی ہے -

ذوق سے بیزاری :

طبعِ ست ، جزبہ ذوقِ تو ، نا گشتہ منسبط

وہ چہ خوش بودے ، کہ بودے ذوق برباد خودم !

خون می خورم از ذوق . . .

زیست بے مرگِ ذوق خوش نہ بود

---

[1] آن یکے کہ گمانِ کمالے ، کہ نہ داشت ، پند اشت کہ روے سخن سوے اوست

غالب

ذوق کی مقبولیت پر رشک :

بازیٔ خورِ فریب ہے اہلِ نظر کا ذوق

ذوقِ فکر غالب را بردہ ز انجمن بیرون

برنجم، غالب ، از ذوقِ سخن: چہ خوش بودے اگر بودے
مرا لختے شکیب ، و پارۂ انصاف یاران را !

اس 'رنج' کی تشریح انھوں نے خود کی ہے :

ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

بسنج تا ز تو برسن بران محل چہ گزشت :
نہ خواندہ آمدنِ من در انجمن یاد آر

ز من ، پس از دو سہ تسلیم ، یک نگہ ، وانگہ
ز خود ، پس از دو سہ دشنام ، یک سخن یاد آر

ملالِ خلق ۔ و نشاطِ رقیب در ہر حال :
تحریوِ خویش بہ تحسینِ تیغ زن یاد آر

بہادر شاہ ظفر اور ان کے 'خاقانیِ ہند' کی بدسلوکی کا بدلہ انھوں نے ان اشعار میں لیا ہے :

بس کہ ہر دم رود از زمزمۂ خویش ز خویش :
خواجہ داند کہ دل آویز فغانے دارد

بالد بہ خویش خواجہ ، چو گوی سخن ورش
غافل کہ این ترانہ بہ بہتان برابر است

نے ہر شتر سوار بہ صالح بود بہال
نے ہر شبان بہ موسیِ عمران برابر است

گفتی کہ این و آن بود از نطق مایہ دار :
این در شمارِ شیوہ نہ باآن برابر است

نے ہر ترانہ سنج نکیسا نوا بود
نے ہر سخن سرائے بہ سحبان برابر است

اپنی ناقدری کو بد ذوقی پر محمول کہا ہے :

گیرم کہ ہر گیاہ برد ز ابر و باد فیض :
خر مہرہ کے بہ سنبل و ریحان برابر است ؟

مانا کہ موضوعِ کلام ان کا اور ذوق کا بڑی حد تک ایک ہی تھا ، مگر اسلوبِ سخن دونوں کا اپنا اپنا تھا ، جس میں تفریق و تمیز انھوں نے ایک کو 'خر مہرہ' اور دوسرے کو 'سنبل و ریحان' کہہ کے کی ہے ۔ اس جذبی اور فنی برتری کے باوجود ، شومیِ اعمال سے ، وہ ان بزرگوں کی زجرو توبیخ ، قہر و عتاب کا نشانہ بن گیے جن کے وہ عقیدت مند اور قصیدہ خواں تھے ، اور ذوق کو ان

کی قدر دانی کا شرف حاصل رہا :

کین ہاے آشکار ، کہ سر جوشِ نازِ اوست
در ذوق با نوازشِ پنہان برابر است

یہ 'نوازشِ پنہاں' ذوق پر آخری مغل کی نہیں ، بلکہ تحریکِ جدوجہاد کے ایک نقیب پر اس کے داعیوں ، بالخصوص شاہ اسماعیل کی ہے ، حالانکہ ، اپنی تمام انسانی کمزوریوں کے باوجود ، غالب اس 'نوازش' کا خود کو ان سے کہیں زیادہ حق‌دار سمجھتے تھے -

غالب کو اس موضوع کے حسن و خوبی میں تو کلام نہیں جو دونوں شاعروں میں مشترک ہے ، مگر ایک تو انھیں ہم طرحی ذوق تو کیا ، کسی شاعر کی بھی گوارا نہیں :

ذوقِ مستی ز ہم آہنگیِ بلبل خیزد :
مفگن آواز بر آوازِ کلاغِ دمِ صبح !

دوسرے کہاں یہ موضوع اور کہاں ذوق !

روان فداے تو ، نامِ کہ بردہ ای ، ناصح !
زہے لطافتِ ذوقے ، کہ در بیانِ تو نیست !

('ناصح' کے لفظ سے ٹپکتا ہے کہ روے سخن ، ذوق کے ساتھ ، مولوی فضلِ حق کی طرف بھی ہے ، جن کی* زبان پر ہر وقت سید صاحب اور شاہ صاحب کا ذکر رہتا تھا ، مگر غالب کو ان سے

بدگمان کرنے کی خاطر ، کس کس برای سے ! ایک شعر میں اپنے دل کو یہ تصور کر کے دلاسا دیا ہے کہ 'نظر' خواہ ذوق کی طرف ہو ، محسوس انہیں یہی ہوتا ہے کہ توجہ کا مرکز وہ خود ہیں ، اور ذوق کے 'دعوی ذوق شہادت ، کو محبوب خاطر میں نہیں لاتا :

از او باور نہ دارد دعوی ذوق شہادت را :
نگاہش با رقیب ، و خاطرش باماست ، پنداری

اب ذوق کے کچھ ایسے شعر درج کیے جاتے ہیں ، جن میں انہوں نے اشارہ کیا ہے کہ وہ غالب کی در پردہ چوٹوں کو خوب سمجھتے ہیں :

وہ صریحاً تو کہہ نہیں سکتے
کہتے ہیں کچھ کنایتوں میں مجھے

بزم میں ذکر مرا لب پہ وہ لائے تو سہی !
وہیں معلوم کروں ، ہونٹ ہلائے تو سہی !

گرم ہو کر آتا ہے منہ پر مرے طفل سرشک :
دیکھو کیا ، اے چشم تر ، ابتر یہ لڑکا ہوگیا !

(اس میں نوجوان غالب کی وارستہ وضعی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے)

ترکی بہ ترکی :

کرتے ، جوں کوہ ، نہیں ہم تو سخن میں سبقت
پر وہ کچھ ہم سے سنے گا جو کہے گا ہم کو

اس شعر کے بعد کچھ جنسی نوعیت کی چوٹیں کی ہیں ، گو بظاہر انھیں خود اوڑھا ہے ۔

غالب کی سید صاحب اور شاہ صاحب سے عقیدت اور ان کے اسلوبِ زندگی میں تضاد پر ذوق نے کئی جگہ طنز و تعریض کی ہے :

بادۂ صاف میں آیا ہے کہاں سے تنکا ؟
عکسِ مژگاں ترا ، مے کش ، ہے خسِ جامِ شراب

ذوق ہے ایک رندِ شاہد باز :
اس کو کیا دخل پارسای میں !

اس چشمِ مست کے ہیں خراباتیوں میں ہم
تقوٰی کجا و زہد کجا و کجا صلاح !

پوشیدہ ان نگاہوں سے ، سرخوش ہیں رات دن :
شرب الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

اس میں غالب کا فرنگیوں سے میل جول بھی آ گیا ۔

تحریکِ جدوجہاد سے 'اسد' کے ادعاے وابستگی پر تعریض :

زیبا ہے ، ذوق ، خرقۂ درویش مرد کو :
نامرد کے لیے نہیں برقع یہ شیر کا

دیتی ہے طاقتِ پرواز یہ کیفیتِ مے :
اس ہوا میں ہے بطِ مے، کہ اڑے بے پر و بال

یہ تعریض غالب کے اس مصرعے پر مبنی ہے :

دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

شاہ اسماعیل سے جو جذباتی علاقہ غالب نے اپنے دل میں قایم کر رکھا تھا ، ذوق کے اشاروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سے واقف ہیں :

دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو :
آینہ خاک صاف ہے ! صورت پرست ہے

اس رنگ سے ہوا وہ طلب گارِ دیدِ یار :
صاف آینے کا نقشہ ندیدوں میں مل گیا

(کیا جانے تیغِ عشق کی لذت کو بوالہوس
گو ، جوں ملخ ، وہ حلق بریدوں میں مل گیا)

نہ پہنچا گردنِ جاناں تلک ، اور ٹوٹ کے ، ہائے!
پڑا گلے میں مرا دستِ آرزو میرا

ہمیشہ میں ہوں اسی داوگھات میں ، اے ذوق!
کہ رام ہو وہ غزالِ پلنگ خو میرا

غالب کی رندانہ بے اعتدالی :

کل جو اک پگڑی ہوی تھی مے کدے میں رہنِ مے
ذوق ، وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو!

ہوس ناکی :

تھا قدِ رعنا کبھی ، پر اب ہوس کے بوجھ سے
جھلملاتا سا ہے اک شعلہ نفس کے بوجھ سے

شیفتہ اور غالب

غالب کے ہم عصروں میں شیفتہ سے بڑھ کر ان کا پایہ شناس کوی نہ تھا ، اور وہ ان سے اخلاص و مودت کا رشتہ بھی رکھتے تھے ۔ اس کے باوصف ، اُن کے مزاج کی بعض متنوع و متضاد خصوصیتوں اور کیفتیوں کی طرف انھوں نے بھی تعریضی اشارے کیے ہیں :

در دیرِ مغان بتِ خود آرائے ہست
خود بینے و خود سرائے و خود رائے ہست

اندر نظرش یکے ست مستی و عفاف :
تو بہ شکنے و تو بہ فرمائے ہست

بدمستیاں کبھی ، کبھی مستوری و عفاف
دستور ہے طبیعتِ نا مستقیم کا

تم لوگ بھی غضب ہو ، کہ دل پر یہ اختیار:
شب موم کر لیا ، سحر آہن بنا لیا !

من تشنہ و سیراب ز صہبائے خودم :
من کعبۂ خویشم و کلیسائے خودم

باغیرِ خودم سروکارے نیست :
من عاشق و معشوقِ خود آرائے خودم

عشق بازی ہائے مانند پردہ دارِ رازِ دوست
پردہ چون برخاست، ظاہر شد کہ خود جانانہ ایم

گہے در صحنِ مسجد، گہ در مے خانہ ہارفتم :
سرِ شوریدہ دارم : بہ ہرجائے ز پا رفتم

چو عشقم می برد از رہ ، بجائے می برد راہم :
چو عقلم می نماید راہ ، در راہِ خطارفتم

اس کردار سنجی کے علاوہ ، شیفتہ نے غالب کے 'شیوۂ عشق' اور بعض دوسرے اشغال کی تہذیب و اصلاح بھی کرنی چاہی ہے :

در شہر حکایتِ مے آشا می ہست
در پیرو جوان شہرتِ خودکامی ہست

گفتم بہ تو آنچہ بود، وین خود دریاب
بد نامیِ تست ، یا نکو نامی ہست

ساقی ، بہ فشردۂ درونی
آمیختنِ شراب تا کے ؟

تما تما ہے نہایت خلافِ شیوۂ عشق :
غلط ہے شوق ہمیں گریہ ہائے رنگیں کا

دیوانہ میں نہیں کہ 'انا لیلیٰ' لب پہ آئے :
باتیں خلافِ وضع ہیں اہلِ ادب سے دور

مطبوع ہم اندازِ زلیخا نہیں رکھتے

کام جوی ، اور دعویٰ عشق کا ؟
یار ہی یاں مدعا ہے یار سے

شیفتہ کو غالب کی مزاج شناسی میں کتنا دخل تھا ، اس کا ثبوت ان کی بعض ترکیبوں سے بھی ملتا ہے (یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں ان کا اپنا مزاج کس حد تک جھلکتا ہے) :

حسرتِ تقصیر : شوقِ تعزیر : کیشِ جفا : طلب گارِ جفا : شکرِ ستم : سایلِ آزار : لذتِ آزار : محوِ لذتِ دشنام : کمہ' لطف : بے دادِ التفات : بے تابِ روے آتشیں' : تمناے زخمِ کاری : لذتِ زخمِ جگر : آرزوے قتل

' 'اک نگارِ آتشیں رخ'
غالب

آتش اور غالب

غالب کے کچھ معمولاتِ زندگی اتنے خلافِ معمول تھے کہ لوگوں کو انھیں کریدنے ، اور بعض کو اسی قبیل کے واردات خود اپنے اوپر بالواسطہ یا غایبانہ طاری کرنے ، میں مزا آتا تھا ۔ جن کی رسای غالب کے کلام تک تھی ، ان کے لیے ایسے مشاغل کا کھوج لگانا چنداں دشوار نہ تھا ، چونکہ غالب نے اپنے کسی تجربے یا کیفیت پر ، خواہ وہ عام ہو یا آن ہی سے مخصوص ، پردہ نہیں ڈالا ، بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اپنی دعوتِ رسوای کو خود آشکار کیا ہے :

گسستِ پود و تارِ پردۂ ناموس را نازم
کہ دامِ رغبتِ نظارہ شد رسوا نگاہان را

شاعر خاص طور سے ایک دوسرے کی چبھتی رگوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں ۔ اور اگر کوی چٹ پٹی بات ان کے ہاتھ لگ جاے تو اسے 'اپنی زبان میں' خوب چٹخارے لے لے کر اچھالتے ہیں ۔ آتش نے کہا ہے :

ہم شاعروں کا حلقہ ہے عارفوں کا :
نا آشنائے معنی صورت نہیں ہے کوی

یہ 'عارف' زندگی کے ہر اچھے برے پہلو کا عرفان رکھتے ہیں - غالب کے بارے میں یہ مسالا آتش نے کچھ تو خود غالب کے کلام سے حاصل کیا ، اور کچھ باتیں ان تک ، سید صاحب اور شاہ صاحب اور ان کے واقفِ حال معتقدوں کے ذریعے ، اس وقت پہنچیں جب ان کے رواں دواں قافلے کا قیام کچھ عرصے کے لیے لکھنؤ میں ہوا -

اس کا اشارہ اس شعر میں موجود ہے :

سنیں گے قصۂ یوسف زبان سے اس کی
کوئی ہماری طرف سے جو کارواں نکلا

'قصۂ یوسف' سے شاہ صاحب کی نسبت غالب کے زلیخاوش جذبات کی طرف اشارہ کیا ہے -

غالب سے ان بزرگوں کی پرخاش جن معاملات پر مبنی تھی ، ان میں سے کچھ یہ تھے :

نوجوان میرزا کا سید صاحب سے پیمانِ یک رنگی و وفا کیشی کر کے منہ موڑنا ؛ اپنی رندانہ اور آزادانہ روش پر کھلم کھلا جمے رہنا ؛ شاہ اسماعیل سے اپنی شیفتگی کے اظہار میں ان کے

جمال و جلال ، اور اپنے جسم و جاں ، کو شوخ چشمی سے پہلو بہ پہلو جگہ دینا؛ تحریکِ جدوجہاد سے اثر پذیری اور ہم‌نوای کا دعوی کرنا ، اور ساتھ ہی آس کے سب سے بڑے معاند ، مولوی فضلِ حق سے خصوصی تعلقات برقرار رکھنا ، اور فرنگی سرکار کی خیر خواہی کا دم بھرنا ۔

غالب کی زندگی کا کوی گوشہ نہیں جس کا آتش نے سراغ نہ لگایا ہو اور اسے اپنا موضوعِ سخن نہ بنایا ہو ۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ غالب ان کی نیم ڈرامای شاعری کا مرکزی کردار ہیں ، اور ان کے شخصی و شعری مزاج اور زبان و بیان کو آتش نے ہر سطح کی تعریض ، طنز ، تضحیک کا نشانہ بنایا ہے ۔ 'غالب شکنی' کے ہر پہلو میں خواجہ صاحب کو میرزا یگانہ چنگیزی پر شرفِ تقدم حاصل ہے ۔

آتش نے شاہ صاحب سے غالب کے ادعاے شیفتگی اور ان کی اپنی لا آبالی روشِ زندگی میں جو زمین آسمان کا بل تھا، اس پر سخت کڑی چوٹیں کی ہے :

نہ ہو آس لیلیِ وحشی کا دلِ دیوانہ محو :
بیدِ مجنوں سے کہاں پیوند نخلِ طور کا !

وحشت آ گیں ہے فسانہ مری رسوای* کا :
عاشقِ زار ہوں اک آہوے صحرای کا

پانوں زنداں سے نہ نکلا ترے سودای کا :
داغ ہی دل میں رہا لالۂ صحرای کا

یہ ہوا ظاہر انا لیلیٰ مجنوں سے ہمیں :
اپنا دیوانہ تھا : اپنے واسطے آوارہ تھا

شانِ عشق اولیٰ ہے : مجنوں دودسانِ عشق سے
ناخلف ، ناقابل و نالایق و ناکارہ تھا

شاہدِ حسن کی بے دادگری سے ہے یقیں
پاے بت کو جو چھوے ، دستِ برہمن ٹوٹے

دور سے کوچۂ دل بر کو کھڑا تکتا ہوں :
نہ تو دیوار کا تکیہ ہے ، نہ در کا پہلو

اثر کرتی نہیں تعلیم تیرہ روزگاروں کو :
آدھر ٹیڑھی ہوی،شانے نے کی وہ زلف ادھر سیدھی

آتش ، غالب اور شاہ اسماعیل :

غالب کی طرح ، آتش نے بھی شاہ اسماعیل کی حرارت سے تپشِ اندوز ، ان کے رنگ و بو سے مسحور ہونے اور اسے انھیں

اپنے فکر و جذب کا مرکز و محور بنانے کا اظہار کیا ہے :

کون سا دل ہے نہیں کشتہ جو حسنِ گرم کا ؟
بزمِ عالم میں ہے تو، گنجِ شہیداں میں چراغ

دماغ اپنا بھی ، اے گل بدن ، معطر ہے
صبا ہی کے نہیں حصے میں آی بو تیری

ہے جو حیرانِ صفاے رخ حلب میں آینہ
بوے زلفِ یار سے آہوے ختن میں مست ہے

آینۂ خیال کو منظور تو رہا
جب سامنا ہوا ، تری تصویر سے ہوا

خیالِ یار مرے شعر کا خیال رہا

غالب کا کلام شاہ صاحب سے ان کے قلبی تعلقِ خاطر کے سوز و ساز اور ذہنی وابستگی کے اتار چڑھاو کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں چھوڑتا ۔ آتش نے بھی بعض اشعار میں ان کی نسبت غالب کا سا اندازِ احساس و بیان اختیار کیا ہے ۔ میرا اندازہ ہے کہ ان میں خود آتش سے زیادہ غالب ہی کے شوق و مستی کا عکس جلوہ فگن ہے ۔ اس خیال کو تقویت آتش کے ان نقلی اشعار سے بھی ہوتی ہے جو صریحاً غالب کے مماثل اشعار پر

مبنی ہیں :

جلتی ہے شوقِ آتشِ رخسارِ یار میں :
ہے شمع سوختہ اسی چشم و چراغ کی[1]

خیالِ یار نے جو نقش اپنا اس میں بٹھلایا
دلِ مشتاق پر عالم ہوا یوسف کے زنداں کا[2]

یہ شعر غالب کی اس حقیقی کیفیت سے 'خالی ہے جس کا تعلق ایک شدید جذبے کے باقی ماندہ تاثر سے ہے :

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے :
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

آتش نے اپنے اس شعر کا خیال اور جذبہ :

تصور ہر نفس ہے پیشِ چشم اس روے روشن کا :
نگہبان برق کو میں نے بنایا اپنے خرمن کا

---

[1] تاتفِ شوقِ تو انداختہ جان درتنِ شمع
شرر از رشتۂ خویش است بہ پیراہنِ شمع
غالب

[2] اس تاثر کے دھیمے پڑنے کی حسرت بھری کسک نے ایک اور جگہ یوں اظہار پایا ہے :

سنبھلنے دے مجھے ، اے نا امیدی ، ! کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے !

غالب کے

انجمن بے شمع ہے ، گر برق خرمن میں نہیں

سے لیا ہے ۔

ایذا دوستی بھی غالب کے مزاج کے ان پہلوؤں میں ہے جن تک آتش کی تیز بین نظر پہنچی ہے ۔ اسے انھوں نے اپنی نفسی کیفیت کے پردے میں بیان کیا ہے ، یا ممکن ہے وہ خود بھی اس کیفیت میں شریک ہوں :

لذتِ زخم سے محروم نہ رکھے قاتل

ہزار جان تصدق ہے زخم کاری پر !

زخم کی ایذا سے جوہر کھل گیا شمشیر کا

وہ زخمِ تیغِ عشق ہوں میں روزگار میں
منہ سے لگے ہیں جس کے نمک داں نئے نئے

رنج اٹھانے میں زبس میں نے مزا پایا ہے :
زخم کے واسطے رکھتا ہوں نمک داں تیار

محبت میں مزا آتا ہے ایذائیں اٹھانے سے :
اسی کو ہم نے چاہا جو حسین بیداد گر دیکھا

خوب صورت کی پسند آتی ہے جلادی مجھے

ایک مدت سے ہوں آفت طلب،اے گردشِ چرخ!
کوی معشوق مجھے آگ بگولا دکھلا

ایک ناقد کو غالب کے بعض اشعار میں آتش کی گونج سنای دی ۔ اصل صورت ، میری دانست میں ، اس کے بر عکس ہے ۔ آتش کے ان اشعار کو توجہ سے پڑھا جاے جو غالب سے ملتے ہیں ، تو پتا چلتا ہے کہ ان میں کہیں غالب کا چربہ اتارنے کی کوشش کی گیی ہے ، کہیں خاکہ اڑانے کی ، کہیں تعریض ان کی زبان پر ہے اور کہیں مفہوم پر ۔ اس قبیل کے اشعار غالب کے اشعار کو سامنے رکھ کر ہی کہے جا سکتے تھے ۔ اسی تاثر کے ثبوت میں ہم دونوں کے چند 'ہم مضمون' شعر درج کرتے ہیں :

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

دل دوستیِ بت کا نہ پابند ہو ، یا رب !
دشمن کا بھی دب جاے نہ پتھر کے تلے ہاتھ!

* * *

درد منت کشِ دوا نہ ہوا :
میں نہ اچھا ہوا ، برا نہ ہوا

درد منّتِ عشق جو یائے دوا ہوتا نہیں :
تندرستی سے یہ بیمار آشنا ہوتا نہیں

* * *

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا :
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

ہمیشہ منہ کے اوپر مردنی سی چھای رہتی ہے :
نہیں زندوں میں ہم اس دن سے تم پر جب سے مرتے ہیں

* * *

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں ، کہ ہے
پر گل ، خیالِ زخم سے ، دامن نگاہ کا !

گل ہائے زخم سے ہوں شہادت طلب نہال

عشرت کدہ ہے تیغ سے قاتل کی قتل گہ :
زخموں کی بدھی ملتی ہے پھولوں کے ہار سے

* * *

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا

کفِ افسوس مل مل کر گریباں چاک کرتا ہوں

*　*　*

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پانو سے ہے دو قدم آگے

پیچھے ہٹا نہ کوچۂ قاتل سے اپنا پانو:
سر سے تڑپ کے چار قدم آگے ڈھڑ گیا!

*　*　*

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی

نہیں کھلتا کسی طرح سے پھر
عیب پوشی کفن سے ، بہتر ہے

*　*　*

ضعف سے، اے گریہ، کچھ باقی مرے تن میں نہیں:
رنگ ہو کر اڑ گیا ، جو خوں کے دامن میں نہیں

جوشِ جنوں نے فصدوں سے مطلق کمی نہ کی:
سیروں لہو ہمارے بدن سے نکل گیا

*　*　*

مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

پھسلتی ہیں نگاہیں یار کے رخسار پر کیا کیا !

*　*　*

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ مارے :
اس کی خطا نہیں ہے ، یہ میرا قصور تھا

غریب کو نہ کریں قتل ، خط کو پرزے کریں
میرا گناہ ہے : قاصد کا کچھ گناہ نہیں

*　*　*

طوطی کی طرح آینہ گفتار میں آوے

کس طرح طوطی کو کرتا ہے سخن ور آینہ !

*　*　*

شاہدِ مطلقِ ہستی کی کمر ہے عالم :
لوگ کہتے ہیں کہ ہے ، پر ہمیں منظور نہیں !

اس شعر میں غالب نے مولوی فضلِ حق کے فلسفہ بود و نبود پر تعریض کی ہے - ایسے فلسفیانہ مسایل سے آتش کی بیگانگی

ان پھس پھسے اشعار سے ظاہر ہے :

شاعر نہیں ہے ، ہیچ مداں ہے کہے جو ہیچ :
ہستی کو اس کمر کی ہے کہنا عدم غلط

سمجھتے ہم کمرِ یار کو نہیں بے ہیچ
اگرچہ ہیچ ہو وہ روزگار کے نزدیک

غالب نے تشنہ کاموں سے بڑے دردمندانہ انداز میں دل سوزی کا اظہار کیا ہے :

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے ، یا رب !
اک آبلہ پا وادیِ پر خار میں آوے[1]

اس پر آتش نے اپنے دو شعر مبنی کیے ہیں :

بلا سے مجھ کو ایذا ہو ، پر ، اے جوشِ جنوں ، پہنچے
زبانِ خارِ صحرا کو نہ صدمہ تشنہ کامی کا

پھوٹ کر آبلوں نے خشک زبانیں تر کیں :
تم سے شرمندہ میں ، اے خارِ مغیلاں ، نہ گیا

---

[1] بر دلِ تشنہ لبِ بادیہ سوزد دلش از مہر

غالب

'ہوسِ بال و پر' کی ناکامی پر غالب نے بڑا حسرت ناک پیرایہ اختیار کیا ہے :

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں :
بارے اب ، اے ہوا ، ہوسِ بال و پر گئی !

آتش نے بال و پر کے بغیر ہوا میں اڑنے کی کوشش پر دبی تعریض کی ہے :

اڑتی پھرتی ہے ہماری خاک ہمراہِ صبا :
بے پر و بالی میں بھی اپنی وہی پرواز ہے

غالب نے ایک شعر میں ، جوان کے ذوقِ ظرافت کا بڑا شگفتہ نمونہ ہے ، (نکیرینِ ارضی و سماوی کی یک طرفہ کارروای کے خلاف دہای دی ہے :

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق :
آدمی کوی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا ؟

اس کا حلیہ آتش نے یوں بگاڑا ہے :

جو چاہیں لکھ لیں کاتبِ اعمال چار دن :
دیکھوں گا روزِ حشر میں کاغذ حساب کا

غالب نے ، حسنِ عمل سے محرومی کے باوجود ، خیالِ حسن کی بدولت ، جنت کی ہوا اور روشنی تک اپنی رسای کی صورت نکالی ہے :

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال :
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

ان کے اس حسنِ تلافی کی مٹی آتش نے یوں پلید کی ہے :

کھودی گیی کوچے میں ترے قبر ہماری :
دروازہ کھلا اپنے لیے باغِ جناں کا !

غالب کے اردو میں فارسی محاورہ برتنے اور مغلق اسلوب اختیار کرنے کے بارے میں آتش وہی راے رکھتے تھے جو استاد ذوق[۲] ، آغا جان عیش اور بعض دوسرے 'اہلِ زبان' کی تھی :

سب جانتے ہیں ترک کی ہندی زباں نہیں

شعر گوی میں مری طبع کو دقت ہے پسند[۱]

---

[۱] سخنِ سادہ دلم را نہ فریبد
نکتہ' چند ز پیچیدہ بیانے بہ من آر

غالب

[۲] سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوی بات ، ذوق ، اس کی :
کوی جانے تو کیا جانے ؟ کوی سمجھے تو کیا سمجھے ؟

سمجھتا اہلِ عالم میں زباں کوی تو میری بھی :
خدایا ، کاش میں پیدا ہوا ہوتا گنواروں میں !

آتش نے غالب کی زبان و بیان پر جو تعریضی کلام مبنی کیا ہے ، اس کے کچھ نمونے دیے جاتے ہیں :

شیشہ‌ٔ مے سے کوی میری زبانی کہہ دے :
خوش نہیں آتی ہے یہ پنبہ دہانی تیری !

ساقی کے دور کھنچنے سے رکتا ہے دم مرا :
انگور سے خوش آتا ہے کھنچنا شراب کا

ساقی ، معاف رکھ مجھے ساغر کشی سے تو

آتشِ پنہاں اس آبِ اشک میں آمیز ہے

پا بہ گل بے خودیِ شوق سے میں رہتا تھا

حسرتِ لبِ دمِ شمشیرِ قاتل میں ہوا

جانے موے تن ، اے کاش ، میں گردن ہوتا !

نوجوانی میں غمِ عشق نہ بڑھنا معلوم !

ز بس تھے اس کے صغیر و کبیر دیوانے !

دلِ دیوانہ ز بس عشقِ صنم رکھتا تھا !

صوتِ حزیں نصیبِ گلوے بریدہ ہے :
آتش حلال کرتی ہے بانگِ درا مجھے !

خار خارِ دل غنیمت جانتا ہوں عشق میں :
زلف دودِ آہ کی آراستگی کا شانہ ہے

تشنگی کرتی جو مشتاقِ دمِ خنجر مجھے
آبِ آہن شیرِ دایہ کی حلاوت مانگتا

گردن نہ خم ہو ، شمع صفت ، گو جہانیاں
تن پر سے میرے کریں سر کو لاکھ بار دور

دایرے میں عشق کے جس نے کہ مارا ہے قدم
صفحۂ ہستی میں وہ ، پر کار ساں، گردش میں ہے

جسم ساں ، ممکن نہیں ہے پیرہن میں آبلے

دل کو برشتگی سے ہو حاصل شگفتگی

کھلے گی حسن کی قلعی جو کوی قبح ہیں آینا

سودائے زلفِ یار کی سر میں ہوا نہ رکھ

دیدہ و دل فرشِ پاانداز مہماں کیجیے

خود گم ہے وہ بت عاشقِ خود گم سے زیادہ

اپنے کلام کے بارے میں غالب کی پیش گوی :

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است :
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

ان کے اس دعوے کی تضحیک :

بعد شاعر کے ہو مشہور کلامِ شاعر
شہرہ البتہ کہ ہو مردے کی گویای کی !
('البتہ کہ !')

غالب اور فضلِ حق کے تعلقات پر تعریض

محبت میں کمی آئی نہیں فضلِ الٰہی سے :
نیاز اپنا وہی ہے ، ناز وہ ہرچند کرتے ہیں

نیازِ خادمانہ ہے وہی فضلِ الٰہی سے :
بتوں کی نازبرداری جو آگے تھی، سو اب بھی ہے

یہ چوٹ ہے 'فضلِ الٰہی' سے غالب کی ، اور دونوں کی بتوں سے ، نیازمندی پر - (یہی بات ایک اور پیرائے میں کہی ہے :

دن رات کھیلتے ہیں باہمِ قمارِ الفت :
وہ ہم سے جیتتے ہیں ، ہم آن سے ہارتے ہیں)

یہ 'بت' انگریز اور سکھ ہیں جو ملک پر حاوی ہو گیے ہیں - ان کی کارستانیوں اور زیادتیوں کو جماعتِ مجاہدین کس نظر سے دیکھتی تھی ، وہ اس شعر سے ظاہر ہے :

بتوں کے ناز سے دکھ دکھ کے پک گیے ہیں دل :
وہ کون ہے کہ خدا سے جو داد خواہ نہیں ؟

مولوی فضلِ حق کی صحبتِ شطرنج اور حلقۂ فقر و فنا کا موازنہ :

بازیِ عشق جز اندوہ و غم و رنج نہیں :
کھیل لے ہر کوی جس کو ، یہ وہ شطرنج نہیں

دل سے آتی ہے محبت کے جوے میں یہ صدا :
جان پر کھیلنے والوں کو شش و پنج نہیں¹

سالکِ راہِ محبت کو پس و پیش نہیں :
دوربیں نہیں میں ، مصلحت اندیش نہیں

کہا جاتا ہے کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ناسخ کے حسب نسب پر چوٹ کی گیی ہے :

وہ بزم یہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں :
ہمارے گنجفے میں بازیِ غلام نہیں

اس کی تصدیق خواجہ صاحب کے ایک اور مصرعے سے بھی ہوتی ہے :

خواجہ کو ہیں غلام کے عیب و ہنر کھلے

---

¹ اگر بازی عشق کی بازی ہے ، جو چاہو لگا دو : ڈر کیسا ؟
گر جیت گیے تو کیا کہنا ! ہارے بھی تو بازی مات نہیں
فیض

(ناسخ کے زعمِ پہلوانی پر بھی انھوں نے تعریض کی ہے :

مرد سے بہتر ہے نامِ مرد : سچ ہے یہ مثل
پہلوانی ہے سو ہے ، رستم کی ، آتش ، دھاک ہے

جواب رکھتا نہ گیسوے یار کشتی میں
بلا کے پیچ یہ کرتا ، جو پہلواں ہوتا !

میرا اندازہ ہے کہ ناسخ کے علاوہ ، آتش کے مدِ نظر وہ لوگ بھی تھے جو اپنی غلامانہ ذہنیت کی بنا پر جدوجہاد سے گریز کرتے تھے ۔

تحریک سے غالب کی روگردانی پر چوٹیں :

عہد کرتے تو ، تری طرح ، نہ پھرتے ، اے یار !
اپنے دل سے نہ نکلتی جو سپاہی ہوتی

حالِ پیری کسے معلوم جوانی میں تھا ؟
کیا سمجھتا تھا میں دو دن میں بدل جاوں گا[1]

طالعِ بد کے اثر سے ، یہ یقیں ہے مجھ کو
تیری حسرت ہی میں ، اے حسنِ عمل ، جاوں گا

---

[1] کبھی کچھ ہے تلون سے ، کبھی کچھ ہے :
مزاجِ یار بھی نیرنگ سازی میں زمانہ ہے

آتش

'طالعِ بد' سے اشارہ ہے غالب کا اس ضمن میں مولوی فضلِ حق کے اثرات کی طرف ۔

قوتِ عمل سے تو سب شاعر یکساں عاری تھے ، اور 'حسنِ عمل' سے بھی انہوں نے کچھ ایسا بہرۂ وافر نہیں پایا تھا ، مگر اس کے باوجود ، ایک دوسرے کی بے عملی پر چوٹیں کرنے سے وہ نہیں چوکتے تھے ۔

ان اشعار میں آتش نے غالب کے سید صاحب اور شاہ صاحب سے پیمان وفا باندھنے ، اور پھر اُسے توڑنے کی طرف اشارہ کیا ہے :

بتِ خانہ چھوڑا : باز آے بت سے :
وہ شہر بھولا : وہ شاہ بھولا

شرطِ وفا کی کس بے وفا سے !
آتش سا عارف آگاہ بھولا

'آتش' یہاں سید صاحب اور شاہ صاحب کے قایم مقام ہیں ۔ غالب نے، جو اپنی کمزوریوں پر تعریضی نظر ڈالنا جانتے تھے، یہی ماجرا یوں باندھا ہے :

سادہ پرکار ہیں خوباں ، غالب !
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں !

زور 'ہم' پر ہے : ہم ان کی سادہ پرکاری کو خوب سمجھتے ہیں : اس کا جادو ہم پر نہیں چل سکتا ۔

مسلکِ صلح کل :

گوارا یاں دلِ دشمن کی بھی شکست نہیں

ناقص ہے دوست داری میں ، کامل نہیں ہے تو
دشمن سے بھی غبار اگر دل میں رہ گیا

دل کی کدورتیں اگر انساں سے دور ہوں
سارے نفاق گبرو مسلماں سے دور ہوں

کون چھینے بت کو ، توڑے برہمن کے دل کو کون ؟
اینٹ کی خاطر کری کافر ہی مسجد ڈھائے گا !

قبولِ خاطرِ مردم ہو ، توتیا کی طرح :
عزیز تیری کریں شیخ و برہمن مٹی

شاہ راہِ ہستیِ موہوم میں وہ چال چل
اپنی آنکھوں کو بچھا وہیں دوست دشمن زیرِ پا

اس مسلک پر بلا امتیاز عمل کرنے کا یہ نتیجہ بھی آتش نے جتا دیا ہے :

سرخ رویاں تک تو ، آتش ، خاکساری نے کیا :
صورتِ نقشِ قدم ، ہے اپنا مدفن زیرِ پا

دشمن سے دوستی پر تعریض :

بلا سے مجھ کو ایذا ہو پر، اے جوشِ جنوں، پہنچے
زبانِ خارِ صحرا کو نہ صدمہ تشنہ کامی کا

قدم مردانگی سے ہم نے مارا دوستداری میں :
کیا ہشیار غافل پا کے اکثر ہم نے دشمن کو!

تحریکِ جدوجہاد (مولوی فضلِ حق کے نقطۂ نظر سے)

پھوڑنا سر کا ہوا حجت کمالِ عشق پر !

سر کو، ناداں، کوئی کہسار سے ٹکراتا ہے؟

سعیِ لاحاصل مداوائے مریضِ عشق ہے :
تھامنا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا

اس مشقت سے اسے خاک نہ ہوگا حاصل :
جاں عبث جسم کی بیگار لیے پھرتی ہے

کچھ نہ حاصل ہووے، کیسی ہی مشقت کیجیے :
عشق بازی کام ہے بیگار کے مزدور کا

کچھ سوا اس کے علاجِ وحشتِ عاشق نہیں :
موت سی زنجیر یا مرقد سا زنداں چاہیے !

گردن ہی اپنی دوش پر اپنے وبال ہے
کیا چھین کر حریف کی تلوار توڑیے !

بے پر مجھے فلک نے کیا تو بجا کیا :
لازم ہے بالِ مرغِ گرفتار توڑیے

اے دلِ دیوانہ ، صابر کو خدا رکھتا ہے دوست :
اُف نہ کر : داغِ حسنیانِ پری پیکر اٹھا !
('حسنیانِ پری پیکر' : انگریز)

۹

اقبال کے فکرِ سخن کا ایک مصدر :

تحریکِ جدوجہاد :

اقبال نے اپنے 'حدِ ادراک سے باہر عشق و مستی ، کے دو سرچشموں کی صراحت کی ہے :

می نہ دانی عشق و مستی از کجاست ؟
این شعاعِ آفتابِ مصطفیٰ ست[1]

پیرِ رومی ، مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

نےِ آن نے نوازِ پاک بازے
مرا با عشق و مستی آشنا کرد

---

[1] 'اقبال کی شاعری اسلام ، پیغمبرِ اسلام' اور ملتِ اسلامیہ کی محبت میں ایک نعت ، ایک قصیدہ ، ایک مرثیہ ، ایک شہر آشوب ، ایک مسلسل غزل ، ایک طویل نظم ہے ،
محمد ہادی حسین : ''شاعری اور تخیل''

اس 'عشق و مستی' کی تفسیر خود

پیرِ روم ، آن صاحبِ ذکرِ جمیل
ضربِ او را سطوتِ ضربِ خلیل

کی زبان سے سنیے :

دورِ گردون را ز موجِ عشق دان :
گر نہ بودے عشق ، افسردے جہان

عشق است در آسمان بریدن
صد پردہ بہ ہر نفس دریدن

عشق جو شد بحر را مانندِ دیگ :
عشق ساید کوہ را مانندِ ریگ

عشق بشگافد فلک را صد شگاف
عشق لرزاند زمین را از گزاف

در رخِ عشق نگر ، تا صفتِ مرد شوی
پیشِ سردان منشین ، کزدمِ شان سرد شوی

چیست مستی ؟ بندِ چشم از دیدِ چشم

چیست مستی ؟ حسّ با مبدل شدن

اقبال عشق و مستی سے جو مراد لیتے ہیں ، اس کا نچوڑ یہ ہے :

جمالِ عشق و مستی نے نوازی :
جلالِ عشق و مستی بے نیازی :

کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر :
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

ان دونوں باطنی موثرات کا اعتراف اقبال نے بار بار کیا ہے ، اور ان کی شہادت سے ان کا کلام سر تا سر معمور ہے - مگر کلام کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس کے کارفرما عمل تک ان کے خیال میں کوی نہیں پہنچا :

سراپا معنیِ سر بستہ ام :
نگاہِ حرف بافان بر نہ تابم

سخنے تازہ زدم ، کس بہ سخن وا نہ رسید :
جلوہ خون گشت ، و نگاہے بہ تماشا نہ رسید

ہزار قافلہ بیگانہ وار دید ، و گزشت
دلے کہ بہ بیند بہ اندازِ محرمانہ ، کجاست ؟

کس ازین نگین شناسان نہ گزشت برنگینم
بہ تو می سپارم او را ، کہ جہان نظر نہ دارد

یہ وہ کلام ہے جس میں ، کچھ 'دستورِ زبان بندی' کی پابندیوں اور کچھ شعری روایت کے اقتضا سے ، مرموز اسلوب برتا گیا ہے ، مگر اس سے اس کی دھار اور تیز ہو گیی ہے :

تو گوی طایرِ ما زیرِ دام است
پریدن بر پر و بالش حرام است

ز تن بر جستہ تر شد معنیِ جان :
فسانِ خنجرِ ما از نیام است

یہ شیوہ ، اپنی پختہ صورت میں ، ''پیامِ مشرق'' کی غزلوں میں نمودار ہوتا ہے ، اور اقبال کی 'سخن سازی و انجمن آرای' سے بیزاری کے بعد بھی ، ان کی 'فاش گوی' کے پہلو بہ پہلو ، جاری رہتا ہے - اس کے مافیہ کی صریح نشان دہی نہیں کی گیی ، مگر ان کچھ کھلے ، کچھ ڈھکے اشاروں کنایوں پر نظر رکھی جاے جن میں یہ ادا کیا گیا ہے تو اس کے مصدر تک پہنچا جا سکتا ہے - ان اشاروں سے پتا چلتا ہے کہ موضوع مجاہدوں اور شہیدوں سے تعلق رکھتا ہے :

سرِ مزارِ شہیدان عنان در کش
کہ بے زبانیِ ما حرفِ گفتنی دارد

چونکہ اسے کھل کر بیان کرنا قرینِ مصلحت نہ تھا ، مجبوراً در پردہ اظہار سے کام لیا گیا ہے :

پردہ بر گیرم ، و در پردہ سخن می گویم :
تیغِ خون ریزم ، و خود را بہ نیامے دارم

روئے سخن کس طرف ہے ، اس کے اشارے سوالیہ پیرائے میں کیے گیے ہیں :

در چمن قافلہ[1] لالہ و گل رخت کشود
از کجا آمدہ اند این ہمہ خونین جگران ؟!

این کیست کہ بر دل آوردہ شبخونی
صد شہرِ تمنا را یغما زدہ ترکانہ ؟

اس سوال کا جواب ایک اور شعر میں موجود ہے :

سیلے کہ تو آوردی ، در شہر نہ می گنجد
این خانہ بر اندازے در خلوتِ ہامون بہ

یہ 'سیل' اسیر خاں کے بچے کھچے لشکریوں کا ہے جو اس کا کارخانہ درہم برہم ہونے کے بعد دہلی پہنچے -

---

[1] با صبا در چمنِ لالہ سحر می گفتم
کہ شہیدانِ کہ اند این ہمہ خونین کفنان ؟
حافظ

ان 'خونین جگروں' کے پیشوا کا اتا پتا یوں دیا گیا ہے :

اے حلقۂ درویشاں ، وہ مردِ خدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستا خیز ؟

جو ذکر کی گرمی میں شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز ؟

ان اوصاف میں تصرفِ نگاہ ، جسے اقبال 'نگہ کی تیغ بازی' بھی کہتے ہیں ، بالخصوص قابلِ توجہ ہے :

از ما بگو سلامے آن ترکِ تند خو را
کاتش زد از نگاہے ، یک شہرِ آرزو را[1]

---

[1] ایک شارح کا ذہن 'ترکِ تندخو' سے اتاترک کی طرف گیا :
'ہنگامی کہ اتاترک خلافتِ اسلامی را ، کہ استقرارِ آن در جہان یکی از بزرگ ترین ارمان ہای اقبال بود ، و تمام مسلمانانِ ہند برآن آرزو کوشش می‌گردند ، اقبال این احساسِ درد آور را بہ قالبِ تغزل چنان سرود -'

(دکتر سید محمد اکرم : ''اقبال در راہِ مولوی''
یہ شہرِ آرزو ، در حقیقت دہلی ہے ، جس کی تسخیر پر سید احمد شہید کے اصل منصوبے کی کامیابی کا دارو مدار تھا - امیر خاں کی سپر افگنی کے بعد ان کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ اپنی منتشر قوت کو از سرِ نو منظم کریں - اس غرض سے وہ دہلی پہنچے اور وہاں انھوں نے شاہ عبدالعزیز کی سرگرم حمایت اور مولوی عبدالحی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

لاہوتیان اسیرِ کمندِ نگاہِ او
صوفی ہلاکِ شیوۂ ترکانہ‘ دل است

ز نگاہِ سرمہ سائے بہ دل و جگر رسیدی
چہ نگاہِ سرمہ سائے! دو نشانہ زد بہ تیرے!۱

ان ’لاہوتیوں‘ میں جنھیں ، انھوں نے اپنے ’شیوۂ ترکانہ‘ کا نشانہ بنایا ، ایک کی طرف اشارہ ان کے اس شعر میں موجود ہے :

یہ فیضانِ نگاہ تھا یا کہ مکتب کا تصرف تھا ؟
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی ؟

اس تیرِ بے خطا کا دوسرا ہدف و اللّٰہی خاندان کے ایک اور چشم و چراغ ، مولوی عبدالحی تھے -

---

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

اور شاہ اسماعیل کی دعوتِ فکر و عمل سے عوام و خواص کے دل و دماغ میں غیرت ، حمیت اور تہور کی آگ بھڑکائی - اقبال کا ’سلام‘ ان ہی کے لیے ہے :

از نوائے می توان یک شہر دل در خون نشاند
’نکہے کہ از دعویِ گرم خونی
بہ دل در رود ، از جگر سربرآرد
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی :
دونوں کو اک نظر میں رضا مند کر گیی
غالب

اپنے صید افگن سے ان ہی دونوں کے پر سوز و سرور جذب و شوق پر یہ اشعار مبنی ہیں :

تپید یک دم ، و کردند زیبِ فتراکش
خوشا نصیب غزالے ، کہ زخمِ او کاری ست !

نخچیرِ محبت کا قصہ نہیں طولانی :
لطفِ خلشِ پیکاں ، آسودگیِ فتراک

اقبال کو اپنی اس محرومی پر بڑی حسرت اور تاسف ہے کہ اس قسم کی واردات خود انھیں پیش نہ آئی :

آہوے زار و زبون و ناتوان :
کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہان

اب ہم پھر ان سوالوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اقبال نے اپنے جذب و فکر کے بارے میں خود اٹھائے ہیں :

درون سینۂ ما سوزِ آرزو ز کجا ست ؟
سبو ز ماست ، ولے بادہ در سبو ز کجاست ؟

جنونِ ما ز کجا، شورِ ہائے و ہوز کجاست؟!

دل کیا ہے؟ اس کی قوت و مستی کہاں سے ہے؟
کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تختِ کَے!؟

' تہی از ہائے و ہوئے خانہ بودے
گلِ ما از شرر بیگانہ بودے

نہ بودے عشق و این ہنگامۂ عشق
اگر دل، چون خرد، فرزانہ بودے

'دل' اور 'خرد' کی تصریح آگے آتی ہے۔

لامکاں کے سناٹے کا ذمہ دار اقبال نے خود خالقِ کائنات کو ٹھہرایا ہے:

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے، یا رب؟ لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

شوق کے ہنگامے؟ نوریوں کے نہیں، آدمِ خاکی کے دم قدم سے بپا ہوے۔

' زندہ کن باز این محبت را، کہ از نیروے او
بوریائے رہ نشینے در فتد با تختِ کَے

مجددِ الفِ ثانی جہاں گیر کو سجدۂ تعظیم نہ کرنے کے جس واقعے کی طرف یہ اشارہ ہے، اس کی صراحت اردو میں کر دی گئی: 'وہ صاحبِ اسرار'

گردن نہ جھکی جس کی جہاں گیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

فقر را نیز جہان بان و جہان گیر کنند

کہاں سے تو نے، اے اقبال، سیکھی ہے یہ درویشی؟

ان سوالوں کا جواب ، جو کلام کے اندر سے نکلا ، یہ ہے کہ اس 'مستی و قوت'، اس 'شورِ ہائے و ہو'، اس 'درویشی' کا ایک منبع ، موروثی اثرات اور فیضان کے دوسرے سرچشموں کے علاوہ ، حریت کے مجاہدِ کبیر ، سید احمد شہید کی ذات اور ان کی اصلاح و تجدید ، جد و جہاد کی تحریک ہے - 'مردانِ حر' کی اس انقلاب آفریں سرگرمی کے در پردہ نقیب اور 'امینِ راز' غالب ، ذوق ، مومن ، شیفتہ ، آتش اور بعض دوسرے شاعروں کی طرح ، اقبال بھی ہیں ، جنھوں نے اس کے فعال مسلک کی تصریح بار بار کی ہے :

ہمین نکتہ کشایندۂ اسرارِ جہان است :
ملک است تنِ خاکی ، و دین روحِ روان است

تن زندہ و جان زندہ ز ربطِ تن و جان است
باخرقہ و سجادہ و شمشیر و سنان خیز !

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چون پختہ شوی ، خود را برسلطنتِ جم زن

فقر :

چیست فقر ، اے بندگانِ آب و گل ؟
یک نگاہِ راہ بین ، یک زندہ دل

فقر کارِ خویش را سنجیدن است
بر دو حرفِ لااله پیچیدن است

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا ست
ما امینیم : این متاعِ مصطفی ست

فقر بر کرّ و بیان شبخون زند
بر نوامیسِ جهان شبخون زند

فقر چون عریان شود زیرِ سپهر
از نهیبِ او بلرزد ماه و مهر

فقرِ عریان گرمیِ بدر و حنین
فقرِ عریان بانگِ تکبیرِ حسین

با سلاطین در فتد مردِ فقیر
از شکوهِ بوریا لرزد سریر

او جنون می افگند سوے سپهر
وارهاند خلق را از جبر و قهر

می نه گیرد جز به آن صحرا مقام
کاندرو شاهین گریزد از حمام

قلبِ او را قوت از جذب و سلوک
پیشِ سلطان نعرۂ او : 'لاملوک !'

فقرِ مومن چیست ؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیرِ او مولا صفات

غیرت ہے طریقتِ حقیقی :
غیرت سے ہے فقر کی تمامی

تکیہ بر حجت و اعجازِ بیان نیز کنند
کارِ حق گاہ بہ شمشیر و سنان نیز کنند

گاہ باشد کہ تہِ خرقہ زرہ می پوشند
عاشقان بندۂ حال اند ، و چنان نیز کنند

چون جہان کہنہ شود ، پاک بسوزند او را
وز ہمان آب و گل ایجادِ جہان نیز کنند

عالم ہے فقط مومنِ جان باز کی میراث :
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

کب تک رہے محکومیِ انجم میں مری خاک ؟
یا میں نہیں ، یا گردشِ افلاک نہیں ہے !

اگر آپ بھی اسے تسلیم کرنے میں ، کہ روے سخن کس کی طرف ہے ، کچھ تامل ہو تو کلام میں اور داخلی شہادت کی کوی کمی نہیں ۔ اقبال کہتے ہیں :

یوسفِ گم گشتہ را باز کشودم نقاب

اس 'یوسف' کی شناخت اس سیاق و سباق میں کی جا سکتی ہے جو انھوں نے اس غرض سے فراہم کیا ہے :

درین صحرا گذر افتاد شاید کاروانے را :
پس از مدت شنیدم نغمہ ہاے ساربانے را

اگر یک یوسف از زندانِ فرعونے برون آید
بہ غارت می توان دادن متاعِ کاروانے را

یہ وہی قافلہ ہے جس کے 'امیر' کو اس کے حقیقی میرِ کارواں نے پیہم جد و جہد کی تلقین کی :

امیرِ قافلہ ای ، سخت کوش و پیہم کوش
کہ در قبیلہؑ ما حیدری ز کراری ست

سید صاحب آخری وقت تک امیر خاں کو سمجھاتے رہے کہ وہ انگریزوں کے عہد و پیمان کے چکمے میں نہ آے اور ان کے آگے ہرگز ہتیار نہ ڈالے، مگر وہ بد توفیق اپنی 'دونی ہمت' کے باعث اس بارِ گراں اٹھانے کی تاب نہ لا سکا جو اسے تفویض

کیا جا رہا تھا[1] :

تو مردِ میداں ، تو میرِ لشکر :
نوری حضوری ، تیرے سپاہی

کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی
یہ بے سوادی ! یہ کم نگاہی !

سید صاحب کا مسلکِ فکر و عمل اس جذبے کے عین مطابق تھا ، جو اقبال کے دل و دماغ میں فرنگی اثر و رسوخ کے خلاف بھرا ہوا تھا - چنانچہ شاید ہی کوی اور درس ہو جو انھوں نے اتنی بار ، اتنے مختلف پیرائے میں دہرایا ہو -

کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں جو ایک بار ہو چکا ، وہ پھر نہیں ہوتا ، مگر عجیب اتفاق ہے کہ ایک ایسی ہی صورت اٹھارہ سو ستاون میں رونما ہوی - جب 'باغیوں' کے ہاتھ سے دہلی نکل گی اور اس پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا ، تو ان کے سپہ سالار بخت خاں نے بہت ہاتھ پاوں مارے کہ کسی طرح بہادر شاہ پس پا فوج کے ہمراہ ہولیں ، تاکہ ان کے زیرِ سایہ اودھ میں جنگ جاری رکھی جا سکے ، جہاں حضرت محل ابھی انگریزوں

---

[1] دھمکی میں مر گیا جو ، نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

غالب

سے بہ سر پیکار تھیں ، مگر وہ اپنے نحیف و نزار جسم و جان و دماغ کی وجہ سے زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کی جاسوسی کے جال میں پھنس گیے ، اور اس کا انھیں عبرت ناک خمیازہ بھگتنا پڑا ۔ اقبال کے بعض اشعار میں سید صاحب کے مجاہدانہ رشد و ہدایت کے علاوہ ، بخت خاں کے مجاہدانہ مشوروں کی بھی گونج ملی ہوئی ہے ۔ بخت خاں اسی استعمار دشمن فولادی سلسلے کی ایک کڑی تھا جسے 'وہابی تحریک' کہا جاتا رہا ہے ۔

بہ پاے خود مزن زنجیرِ تقدیر :
تہِ این گنبدِ گردان رہے ہست

اگر باور نہ داری ، خیز و دریاب
کہ چون پا واکنی ، جولان گہے ہست

در سفر از پانشستن ہمتِ مردانہ نیست

بہ این بہانہ بہ دشتِ طلب زپانشین
کہ در زمانۂ ما آشناے راہے نیست

درین رباطِ کہن چشمِ عافیت داری ؟
ترا بہ کشمکشِ زندگی نگاہے نیست

ترا ، نادان ، امیدِ غم گساری ہا ز افرنگ است؟
دلِ شاہین نہ سوزد بہرآنِ مرغے کہ در چنگ است

ز افرنگی صنم بیگانہ تر شو
کہ پیمانش نہ می ارزد بہ یک جو

سپر از دست مینداز کہ جنگ است ہنوز

خنک مردان کہ سحرِ او شکستند
بہ پیمانِ فرنگی دل نہ بستند

مشو نومید و با خود آشنا باش
کہ مردان پیش ازین بودند ، و ہستند

گر ز مکرِ غربیان باشی خبیر
روبہی بگذار ، و شیری پیشہ گیر

چیست روباہی ؟ تلاشِ ساز و برگ
شیرِ مولا جوید آزادی و مرگ

یہ ٹیپو سلطان کی کڑک دار آواز کی بازگشت ہے ۔

چو موج ، مستِ خودی باش ، و سر بہ طوفان کش :
ترا کہ گفت کہ بنشین و پا بہ دامن کش ؟

بہ قصدِ صیدِ پلنگ از چمن سرا بر خیز
بہ کوہ رخت کشا ، خیمہ در بیابان کش

از سرِ تیشہ گزشتن ز خرد مندی نیست :
اے بسا لعل کہ اندر دلِ سنگ است ہنوز !

اے کہ آسودہ نشینی لبِ ساحل ، بر خیز
کہ ترا کار بہ گرداب و نہنگ است ہنوز

'نہنگ'[1]
نہنگ گرو گوبند سنگھ کے زمانے سے سکھ فوج کے سرفروش

---

[1] لقمہ' کامِ نہنگیم : از مزارِ ما مپرس !
غالب

ایک فارسی شعر میں غالب نے اپنے آپ کو اس خفیہ تیاری میں جھونکنے کا ذکر کیا ہے جو سید صاحب سکھوں کے خلاف جہاد کے سلسلے میں کر رہے تھے ، اور اعتراف کیا ہے کہ وہ اس دینی و دنیوی ہنگامے کی تاب نہ لا سکے :

بہ خلوت خانہ' کامِ نہنگِ لا زدم خود را :
ستوہ آمد دل از ہنگامۂ غوغاے مطلب ہا

مبادا ، ہمچو تارِ سبحہ ، از ہم بگسلد ، غالب !
نفس ، با این ضعیفی ، بر نہ تابد شورِ 'یا رب' ہا

سپاہی شمار ہوتے تھے ۔ اس نشان سے غالب نے ان سے مقابلے کی سنگین مشکلات کی طرف اشارہ کیا ہے :

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ :
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

(کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک!)

سید صاحب کی مہم آزادی کے 'قید و صید نہنگاں' کا معرکہ مختلف وجوہ سے ناکام ہوا :

تاثیر آہ و نالہ مسلم ، ولے مترس :
مارا ہنوز عربدہ باخویشتن بسے ست

غالب

اقبال ، ہزیمت کے حوصلہ شکن پہلو سے منہ موڑ کر ، اس جذبے کو ابھارتے ہیں جو اس جد و جہد کا محرک تھا :

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا ؟

اقبال کسی خوف و خطر کو خاطر میں نہیں لاتے ۔ وہ کسی ایسے دریا میں کشتی کھینے کے قایل نہیں جس میں مگرمچھ نہ ہوں ۔ ان کے مرشد نے فرمایا :

من ماہیِ نہنگم ، و عالم آرزو ست

مرید نے اسی جذبے کے مطابق کہا :

دریاے تو دریا ست کہ آسودہ چون صحرا ست
دریاے تو دریا ست کہ ، افزوں نہ شدہ کا ست

بیگانۂ آشوب و نہنگ است ، چہ دریا ست !
از سینۂ چاکش ، صفتِ موجِ رواں ، خیز

ترا بحر پرسکوں ہے : یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے ، نہ طوفاں ، نہ خرابیِ کنارہ

نہنگِ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد :
نہنگِ مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

شاہ اسماعیل اور فضلِ حق :

دہلی میں تحریکِ اصلاح و جہاد کے سب سے پر کشش اور ولولہ انگیز داعی شاہ اسماعیل ، اور اس کے سب سے جید حریف

مولوی فضل ِ حق خیر آبادی تھے - علوم ِ متداول پر عبور ، شعر و ادب میں درک ، بحث و جدل میں زبان و بیان کی تیزی و طراری میں تو یہ دونوں ایک دوسرے کے ہم سر و ہم پلہ تھے - مگر ان کے افکار و اشغال میں قطبین کا تفاوت تھا - مولوی فضل ِ حق کو الٰہیات اور منطق کے مجرد مسایل و مباحث[1] سے طبعی مناسبت تھی ، اور 'فلسفہ' ذات و صفات' کی موشگافیوں میں ، جنھیں اقبال نے 'الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات ، ٹھہرایا ، ان کا دماغ خوب لڑتا تھا ، اور اس میدان میں انھوں نے بڑا نام پیدا کیا تھا - ان افکار و اشغال کو شاہ اسماعیل کس نظر سے دیکھتے تھے ، اس کا اندازہ ان کی 'ایضا الحق الصریح فی احکام المیت و الضریح' کے اس اقتباس سے ہو جائے گا جس کا نشانہ صریحاً مولوی فضل ِ حق ہی ہیں -

باید دانست کہ مسئلہ' وحدت ِ وجود و شہود و مبحث ِ تنزلات ِ خمسہ و صادر و تجدد ِ امثال و کمون و بروز ، و امثال ِ آن از مباحث ِ تصوف ، و ہم چنین مسئلہ' تجرد ِ واجب و بساطت ِ او تعالی بہ حسب ِ ذہن ، یعنی از زمان و مکان و جہت ، و ماہیت و ترکیب ِ عقلی ، و مبحث ِ عینیہ ، و زیادت ِ صفات ، و تاویل ِ متشابہات ، و اثبات ِ رویت بلا جہت و محاذات ، و اثبات ِ جوہر ِ

---

[1] مرا از منطق آید بوے خامی :
دلیل ِ او دلیل ِ نا تمامی
اقبال

فرد ، و ابطالِ ہیولٰی و صورت و نفوس و عقول یا بالعکس ، و کلام در مسئلۂ تقدیر ، و کلام و قول بہ صدورِ عالم بر سبیلِ ایجاب، و اثباتِ قدمِ عالم ، و امثالِ آن ہم از قبیلِ بدعاتِ حقیقیہ است ، اگر صاحبِ آن عتقاداتِ مذکورہ را از جنسِ عقایدِ دینیہ می شمارد ، و الا درین جزوِ زمان در بدعاتِ حکمیہ البتہ مندرج است - - - (ص ۴۴)

استغراقِ ہمہ در تحصیلِ تبحرِ علومِ الٰہیہ ، بہ تتبعِ مسایلِ غریبۂ علومِ عربیہ ، کہ در فہمِ کتاب و سنت ، کہ منبائے آن بر محاوراتِ عرفیہ است ، نہ بر لطایفِ شعر ، چندان دخل نہ می دارد ، و مثل تدقیقِ زاید در دقایقِ منطقیہ و الٰہیات و طبیعاتِ فلسفیہ ، و تعمقِ زاید در قواعدِ اصولیہ و کلامیہ و اسفار فقیہہ ، و مہارتِ ابوابِ دانش مندی از فنِ مناظرہ و جدل و بابِ توجیہ و طرق - - - کہ محبیانِ دانش مند بہ عمل می آرند ، و درمیانِ امثالِ خود بہ آن تفاخر می نمایند - - - ہمہ از قبیلِ بدعاتِ حکمیہ است (ص ۵۰) از ہمہ فنونِ دانش مندی و صنایعِ فضیلت نمای بیزاریم -

کتب خانۂ اشرفیہ ، دہلی

فضلِ حق اور غالب : فکری اختلافات اور ہم رنگی :

مذہبی عقاید میں مولوی فضلِ حق پرلے درجے کے کٹر اور روزمرہ زندگی میں ہر قسم کے رسم و رواج ، بلکہ توہمات تک کے

شدت سے قایل اور پابند تھے' ۔ غالب نے اسی قبیل کے اہلِ علم و دانش پر تعریض کی ہے :

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں ؟
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

'اے آن کہ از قدم و حدوثِ عالم' سخن رانی ، یک رہ بہ حلقہ' آزادگان در آے ، و این راز بہ یگانہ بنیان درمیان نہہ ، تادانی کہ عالم خود در خارج وجود نہ دارد ۔ نوی و کہنگی درمیان چون تواند گنجید ؟ ہمان ذاتِ اقدسِ مقدس ، کہ صفات عینِ اوست ، و عالم از وے ، چون پر تو از سہر ، جدا نیست ۔ در ہر عالم از اعیانِ ثابتۂ تا صورِ محشورہ از خویش بر خویش جلوہ گستر

' مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں :

'والدِ مرحوم نے معقولات کی تکمیل مولانا فضلِ حق کی خدمت میں کی تھی ۔ اثناء درس میں اکثر ان کا تذکرہ آ جاتا تھا فرماتے تھے :

''میں نے ایسا خوش تقریر انسان عمر بھر نہیں دیکھا ۔ مجلس کی تقریر اور درس و علم کی تقریر ، دونوں میں بے مثل تھے ۔ لیکن جہاں تک مذہبی عقاید و اعمال کا تعلق ہے ، ان کا مشرب رسم پرستی و بدعت نوازی کا تھا ، اور اس باب میں نہایت غلو رکھتے تھے ۔'

(مہر : ''غالب'' طبعِ چہارم ، ۶۷۸)

است - - - اگر حق ہستیِ محض است ، و حقا کہ این اندیشہٴ حق است ، ما سوی اللہ معدوم چون نہ بود ؟'

''سہرِ نیمروز"

'حقا کہ این اندیشہٴ حق است' میں غالب نے اشارہ کیا ہے کہ یہ تصور مولوی فضلِ حق کا ہے - ان کے وحدت الوجودی مابعد الطبیعی نظریے کی رو سے دنیا و مافیہا کی کوی حقیقت نہ تھی - عالمِ شہود کو وہ ، غالب کے لفظوں میں ، ایک 'سیمیا کی سی نمود' سمجھتے تھے - غالب نے ان سے متاثر ہو کر اپنے اردو اور فارسی کلام میں 'وجودِ بے بود' کے ان تصورات کی ترجمانی بھی کی ہے ، اور کہیں کہیں دبی زبان سے ان پر تعریض بھی -

پہلے ترجمانی کی کچھ مثالیں دونوں زبانوں سے پیش کی جاتی ہیں :

عالم تمام حلقہٴ دامِ خیال ہے

ہر چند کہیں کہ ہے ، نہیں ہے

جز نام نہیں ہستیِ اشیا مجھے منظور

'عالم کا وجود محض برائے نام ، وہمی اور غیر حقیقی ہے - وہ خارج میں معدوم ہے'- 'اعیانِ ثابتہ نے وجودِ خارجی کی ہو تک نہیں سونگھی' - ابن عربی ''فصوص الحکم"

۷۲۹

نکتهٔ چند سر ایم ز وجوب و امکان :

صورِ کون نقش است و هیولی صفحه
صفحه عنقا ست ، چه گوی ز نقوش و الوان ؟

ز وہم نقشِ خیالے کشیده ای ، ورنه
وجودِ خلق ، چو عنقا ، به دهر نایاب است

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشته ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشته ایم

دهر سراب ست ، وجودِ تو کو ؟

ہرچه از پرده ہویدا ستے
نقش و نگارِ پرِ عنقا ستے

ہستیِ اشیا که غبارِ فنا ست
پرده کشاے اثرِ سیمیا ست

خلق ، کہ از وہم نمودیش ہست
وہمِ تو دانست کہ بودنش ہست

گل و بلبل و گلستان نیز ہم
مہ و انجم و آسمان نیز ہم

نمودے ست کان را بود بود ، ہیچ
زیان ہیچ و سرمایہ و سود ہیچ

بہ عرضِ شناسایے ہرچہ ہست
بہ وہم است پیدایے ہرچہ ہست

خیالے در اندیشہ دارد نمود
بہان شیبِ غیب است بزمِ شہود

اب کچھ ایسے شعر سنیے جن میں اس پادر ہوا مفروضے پر تعریض کا پہلو نکلتا ہے :

ہستی ہے ، نہ کچھ عدم ہے ، غالب !
آخر تو کیا ہے 'اے نہیں ہے' ؟

ہستیِ شاہدِ مطلق کی کمر ہے عالم :
لوگ کہتے ہیں کہ ہے ، پر ہمیں منظور نہیں !

خطے بر ہستیِ عالم کشیدیم از مژہ بستن :
ز خودر فتیم ، وہم با خویشتن بردیم دنیا را

'جلوہ گاہِ شہود' کے بارے میں ان موہوم خیالات کا صاف رد بھی غالب کے کلام میں موجود ہے :

راز زین دیدہ وران جوے کہ از دیدہ وری
ہرچہ در دیدہ عیان است ، نگاہش دارند

راستی از رقمِ صفحہٴ ہستی خوانند
نقشِ کج بر ورقِ شہ پرِ عنقا بینند

برد از یاد کہ دنیا ست نمودِ بے بود
این دل افروز نمودے کہ ز دنیا بینند

نہم از عید فرا پیشِ نگہ آینہ
کاندران آینہ پیدایے اشیا بینند

شاہ اسماعیل نے بھی اس مسئلے پر ''عبقات'' میں 'خوش اعتقادوں کی توحید ،' کے عنوان سے اپنا خیال ظاہر کیا ہے - اسے ہم جناب مناظر احسن گیلانی کے اردو ترجمے میں دیتے ہیں ، جو کچھ تشفی بخش معلوم نہیں ہوتا :

'بعض اوقات عوام کا یہ گروہ اپنے نزدیک یہ باور کیے رہتا ہے کہ کثرت کا یہ تماشا جو نظر آ رہا ہے ، یہ صرف نظر کا

دھوکا اور احساس کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی یہ باتیں صرف سفسطہ اور محض مغالطے پر مبنی ہیں۔ در حقیقت یہ ان لوگوں کے مسلک کو قبول کر لینا ہے۔ جنھیں اصطلاحاً عنادیہ کہتے میں، یعنی جن کے نزدیک جو کچھ بھی نظر آ رہا ہے، وہ کچھ نہیں ہے، حتیٰ کہ خود بھی کچھ نہیں ہیں، اور جو کچھ وہ بول رہے ہیں، وہ بھی کچھ نہیں ہے۔ بہرحال، عوام کے اس خوش اعتقاد گروہ کی عقیدت و محبت جو حضراتِ صوفیہ سے یہ رکھتے ہیں، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اپنی عقیدت و محبت کی بنیاد پر جس خیال کو اپنے اندر انھوں نے قایم کر لیا ہے، یعنی عالم اور اس کی کثرتوں کو صرف نظر و حس کا مغالطہ اور دھوکا قرار دینا، یہ ایک غلط عقیدہ ہے۔'

جو مخلوط روش غالب کے کلام میں مولوی فضلِ حق کے بود و نبود کے نظریے کے بارے میں ملتی ہے، وہی ان خیالات کے بارے میں پای جاتی ہے جو مولوی صاحب جہاد کے بارے میں رکھتے تھے۔ یعنی کبھی ان خیالات کی ترجمانی اور کبھی تردید۔ تردید کی متعدد مثالیں کئی جگہ دی جا چکی ہیں۔ یہاں ہم صرف کچھ ایسے شعر درج کرتے ہیں جن میں تاریخی حقایق کو تسلیم کرنے اور بے سود تگ و تاز سے باز رہنے کی تلقین کی گیی ہے۔

عنان گسیختہِ بے راہہ تاختن تاچند ؟

در دستِ دیگرے ست سفید و سیاهِ ما :
با روز و شب به عربده بودن چه احتیاج ؟

از پیچ و تابِ آز ستوهند سر شان :
انگشتِ زینهار شمر بر لوائے را!

نه سوزد برخودم دل ، گر بسوزد برق خرمن را
که دانم آنچه از من رفت ، حقِ خوشه چین باشد

از برزه روان گشتن قلزم نه توان گشتن

کاروبارِ موجِ با بحر است : خود داری مجوے :
در شکستِ خویش بے اختیار افتاده ایم

بیهوده امیدِ اثرے را چه کند کس ؟
تا دشنه نه باشد ، جگرے را چه کند کس ؟

گو چرخ دشمنی مکن و بخت سرکشی
خود خواهشِ محال به حرمان برابر ست

باں وہاں ، نیستم محال طلب :
نو بہار از خزان نہ می خواہم

بہ رنج از پے راحت نگاہ داشتہ اند :
ز حکمت است کہ پاے شکستہ در بند است

قفس و دام را گنا ہے نیست :
ریختن در نہادِ بال و پر است

مولوی فضلِ حق نے جو رویہ تحریکِ جد و جہاد کے باب میں اختیار کیا ، وہ ان کے

آن کارگہِ وہم ز پیدائے اشیا

کے مابعدالطبیعی تصور کا منطقی نتیجہ[1] تھا ۔ اس تصور کی عملی دلالت

---

[1] نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود :
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

دوسرے مصرعے سے ایک مفہوم تو یہ نکلتا ہے :

دو روزہ راہ بہ ہر رنگ می توان پیمود :
بلند و پست ، سرافرازی و نگون ساری

مگر اس کا روے سخن اگر جد و جہاد کے مخالفوں کی طرف موڑ دیا جائے ، تو معنی یہ ہو جائیں گے کہ معرکۂ حق و باطل در پیش

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کا نچوڑ غالب کے اس مصرعے میں آ گیا ہے :

حاصلِ آن است ازین جملہ نہ بودن ، کہ مباش !

اس کے سیاسی مضمرات بھی غالب نے کھول دیے ہیں :

خلق اگر روم و گر روس گیر
ہرچہ ، بجز حق ، ہمہ معدوم گیر

یعنی ، چاہے کوی طاقت ساری دنیا پر اپنا تسلط جما لے ، تم ٹس سے مس نہ ہو - دوسرے مصرعے میں خفی تعریضی پہلو یہ ہے کہ اس نمودِ بے بود میں اگر کوی وجود بے بود نہیں اور حقیقت رکھتا ہے ، تو وہ صرف (فضلِ) حق کا ہے -

مولوی صاحب کے اس سبق کی کاٹ کہ

نیست غیر از سیمیا عالم ، بہ سودایش مپیچ

غالب نے یوں کی ہے :

ہستی ایزد را ، و عالم سیمیاے ایزدی ست
لاجرم ہر ذرہ را آن فرہ در سیما ستے

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)

ہو تو نشیب و فراز ، فتح و شکست کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے:

در عشق بود تفرقہ سود و زیان ہیچ

در تماشا گاہِ جمع الجمع بر وفقِ وجود
قطرہ ہا سرچشمہ و سر چشمہ ہا دریا ستے

اُن کے 'خلق' کو عنقا قرار دینے کے جواب میں غالب نے کہا :

کہ حق است محسوس و معقول خلق

اور ڈرتے ڈرتے پھر یہی عقیدہ دہرایا :

ہمہ محسوس بود ایزد ، و عالم معقول
غالب ، این زمزمہ آواز نہ دارد ، خاموش !

اسی عقیدے کی رو سے انھوں نے تاکید کی کہ

حق را ز خلق جوے . . . .

اور خود اپنے شعری مافیہ کو خلق کے حقیقی ہونے پر مبنی کیا :

ز اصلِ خلق سرایم سخن بہ پردۂ ساز

یہ عمل اُن کے اس خیال کے عین مطابق ہے کہ 'اثرہاے وجود است خیال' اور

اندیشہ جز آینہ' تصویر نما نیست

شبلی نے غالب کے اس خیال سے اتفاق کیا ہے :

'اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تخیل کے لیے معلومات و

مشاہدات کی ضرورت نہیں ، یا ہے تو بہت کم ، کیونکہ تخیل کا عمل واقعی موجودات پر نہیں ، وہ خیالی باتوں سے ہر قسم کا کام لے سکتی ہے ؛ اس کی عمارت کے لیے محالات کا مصالحہ اسی طرح کام آ سکتا ہے جس طرح ممکنات کا؛ وہ ایک چھوٹی سی چیز سے سینکڑوں ، ہزاروں خیالات پیدا کر سکتی ہے - چنانچہ ان شعرا نے جنھوں نے واقعات یا مشاہدات کو ہاتھ نہیں لگایا ، خیالات کا گوناگوں عالم پیدا کر دیا . . . لیکن یہ خیال نہایت غلط ہے . . . اولاً تو کوئی خیال مشاہدات اور واقعات کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا؛ جن چیزوں کو ناممکن کہتے ہیں ، ان کا خیال بھی درحقیقت ممکن ہی کے مشاہدے سے پیدا ہوا ہے . . . تخیل جس قدر باریک ، متنوع ، کثیرالعمل ہوگی ، اسی قدر اس کے لیے مشاہدات کی زیادہ ضرورت ہوگی۔'

''شعرالعجم'' ۴ ، ۴۳-۴۱

حالی نے شعری عمل کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھا ہے :

'ان کو [جن کی فطرت میں شاعری کا ملکہ ہوتا ہے] خارج سے اپنی شاعری کا مصالحہ فراہم کرنے کی ضرورت اس قدر ہوتی ہے جس قدر کہ بیے کو اپنے گھونسلے کے لیے پھوس اور تنکوں کی باہر سے لانے کی ضرورت ہوتی ہے' ورنہ وہ سلیقہ جو الفاظ اور خیالات کی ترتیب اور انتخاب کے لیے

درکار ہے، وہ اپنی ذات میں اس طرح پاتے ہیں جس طرح کہ بیا گھونسلا بنانے کا ہنر اور سلیقہ اپنی ذات میں پاتا ہے۔'

''مقدمۂ شعر و شاعری''

غالب کی 'خوے دل نوازی' کی ایک مثال ڈاکٹر مختارالدین آرزو نے ''احوالِ غالب'' میں ''تذکرۂ غوثیہ'' کے حوالے سے نقل کی ہے:

'ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی سرور' مصنف ''فسانۂ عجایب'' لکھنؤ سے آئے مرزا نوشہ سے ملنے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ 'مرزا صاحب' اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے؟' کہا: ''چہار درویش'' کی۔' میاں رجب علی بولے: 'اور ''فسانۂ عجایب'' کی کیسی؟' مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے: 'لاحول ولاقوۃ! اس میں لطفِ زباں کہاں؟ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔' اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گیے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا: 'ظالمو، پہلے سے کیوں نہ کہا؟' دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے (سید غوث علی شاہ قلندر کے) پاس آئے۔ یہ قصہ سنایا اور کہا کہ 'حضرت' یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہوگیا۔ آئیے آج ان کے مکان پر

چلیں اور کل کی مکافات کر آییں - ہم اُن کے ہمراہ ہو لیے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے - مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرای کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ 'جناب مولوی صاحب' رات میں نے ''فسانہ' عجایب" کو جو بہ غور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں ؟ نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے - میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوی ، نہ آگے ہوگی ، اور کیونکر ہو ؟ اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا -'

اس خاص امر میں غالب کی روش کچھ کچھ یٹیس سے ملتی جلتی ہے - یٹیس نے اقرار کیا ہے کہ اسے اپنے مخفی خیالات کا بھی ، جن کا وہ اپنے دل میں انتہای شدت سے قایل ہوتا تھا ، انکار کرنے یا مذاق اڑانے میں کوی تامل نہ ہوتا تھا - ایک اور جگہ پھر یہی بات کہی ہے :

'میں فطری طور سے ایک ملنسار شخص ہوں ، اور بات چیت کی تلاش میں ادھر آدھر گھومتا پھرتا ہوں ، اور ڈر یا خوشنودی کی خاطر ، اپنے عزیز ترین معتقدات سے مکرنے کے لیے تیار رہتا ہوں -'

(''آپ بیتی" ۱۴۹)

غالب کی اس فکری رنگا رنگی ، جذباتی تعلق اور بے تعلقی پر اقبال کا یہ مصرع صادق آتا ہے :

کہے باحق در آمیز ، گہے باحق در آویزد
کبھی فضلِ حق کی ہاں میں ہاں ، کبھی ان کی کاٹ !!

فضلِ حق اور اقبال :

اس لاینحل گتھی میں اگرچہ اقبال بھی الجھے رہے کہ

وجود است این کہ بینی ، یا نمود است؟

اور ان کے خیالات مختلف اوقات میں بدلتے رہے ، مگر ایسے مجرد

---

۱ غالب نے اسی قسم کے ایک اعتراض کا یہ جواب دیا :

'میں جو ایک جہت اختیار کروں تو دوسری جہت والوں کو ، کہ وہ بھی اشخاص کثیر اور سب فاضلِ تحریر ہیں ، کیا جواب دوں ، اور ان کے دلایل کو کن دلایل سے رد کروں ؟'

(''مجموعہ'' نثرِ غالب اردو ، ۳۲۶)

غالب نے اپنی روش سے ہم رنگ پاکر ، صفیر کے اس شعر کی داد دی ہے :

کبھی ہوں گرم ، کبھی سرد ، حسبِ موقع و وقت :
صفیر ، آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

حکمی مسایل کا عملی حل بھی انھوں نے نکالا ہے :

بہ ضربِ تیشہ بشکن بیستون را

حکیمان را درین اندیشہ بگزار
شرر از تیشہ خیزد یا ز سنگ است

یہ وہی حقیقت آگیں مسلک ہے جس کی تلقین رومی نے کی ہے :

نفی بہرِ ثبت باشد در سخن
نفی بگزار و ثبت آغاز کن

نیست این و نیست آن ، ہین ! وا گذار
آنک آن ہست است ، آن را پیش آر

اے مزور ، چشم بکشا و ببین
چند گوی : 'می نہ دانم آن و این؟'

از وبائے زرق و محرومی بر آ
در جہانِ حی و قیومی در آ

تا 'نہ می بینم' 'ہمی بینم' شود
وین 'نہ دانم ہا' ت 'می دانم' شود

اصلاح و جہاد کی تحریک سے مولوی فضلِ حق کی تند و تلخ مخاصمت جن وجوہ پر مبنی تھی ، وہ مختصراً یہ تھیں : داعیانِ جہاد سے دینی عقاید اور دنیوی مصالح میں اساسی اختلاف اور ان کی نیت و مقاصد کے بارے میں انتہائی بدگمانی؛ منصبی وابستگی کی رعایت سے انگریزوں کی نیت اور مقاصد کے بارے میں انتہائی خوش فہمی؛ عملی پہلو سے تحریک کی بے سروسامانی کی بنا پر اسے ایک خوابِ پریشاں سمجھنا اور اس کی ناکامی کا یقینِ واثق؛ مصلحت اندیشی اور عافیت طلبی ۔

انگریزوں کی حکمت عملی پر مزید تدبر و تعمق کرنے کے بعد ان سے حسنِ ظن کا پردہ مولوی فضلِ حق کی آنکھوں سے اٹھ گیا ، اور میرا اندازہ ہے کہ اقبال کے ان اشعار میں ان کی اس قلبِ ماہیت کی طرف بھی اشارہ ہے :

فرنگ آخر ز عقلِ ذو فنون کرد :
دلِ خود کامِ خود از عشق خون کرد

ز اقبالِ فلک پیما چہ پرسی ؟
حکیمِ نکتہ دانِ ما جنون کرد

انگریزوں سے نفرت و حقارت کی جو چنگاری ان کے دل و دماغ میں بھڑکی ، اس کی شہادت ان کے رسالے 'الثورۃالہندیہ' اور ایک عربی قصیدے سے ملتی ہے جو انھوں قید و بند کے عالم میں اپنے

خونِ جگر سے لکھے۔ اپنے قصیدے میں وہ انگریزوں کو 'سیاہ جگر، سفاک ، کثیف القلب' ، اور ان کے ہندوستانی خیر خواہوں کو ان کی تہ تک نہ پہنچنے پر 'احمق' کہتے ہیں ۔ ان کی خوں ریزی اور غارت گری اور بے حد و حساب ظلم و ستم کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں : 'میرا اس کے سوا کوئی قصور نہیں کہ مجھے ان سے محبت اور دل بستگی نہیں ، اور بات یہ ہے کہ ، نصِ قرآنی کی رو سے ، ان سے محبت کرنا کفر ہے ۔ کسی حق پرست انسان کو اس میں شک و شبہ نہیں ہو سکتا ۔'

اقبال فکری اور عملی یک رنگی کے معاملے میں اتنے سخت گیر ہیں کہ ان کی نظر میں سن ستاون کے عملی کفارے سے بھی مولوی فضلِ حق کی ابتدائی کج اندیشی اور کج روی کی خاطر خواہ تلافی نہ ہوئی :

بہل افسانہ' آن پا چراغے :
حدیثِ سوزِ او آزارِ گوش است

من آن پروانہ را پروانہ دانم
کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است

میرا اندازہ ہے کہ یہ 'پا چراغ' مولوی فضلِ حق ہی ہیں ، جن کا رویہ سن ستاون میں پوری طرح یک سو نہ تھا ، اور 'سخت کوش و شعلہ نوش پروانہ مجاہدِ آزادی' جنرل بخت خاں ہیں ۔

ان اشعار کی تلخ نکتہ چینی کا ہدف بھی وہی معلوم ہوتے ہیں :

بلند بال تھا ، لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سرِ محبت سے بے نصیب رہا

پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

غالب اور ان کے ہم عصروں نے ، جو سب کے سب بلا استثنا اس تحریک سے جذباتی اور فکری عقیدت رکھتے تھے ، مولوی فضلِ حق اور تحریکِ جہاد کے دوسرے سب مخالفوں کے ، اپنے اپنے طور پر ، جواب دیے ہیں ۔ ہم صرف ان الزامات کو لیتے ہیں جن کے جواب اقبال کے کلام میں ملتے ہیں ۔

الزام : 'لذتِ شبخون و یلغار' :

یہ ترکیب اقبال نے فرنگی استعمار کی غارت گری کے لیے استعمال کی ہے، مگر جہاد کے مخالف یہی الزام سید صاحب کی تحریک پر عاید کرتے تھے ۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن :
نہ مالِ غنیمت ، نہ کشور کشای

یہ جواب خود سید صاحب کے الفاظ میں دیا گیا ہے ۔

کارِ حق گاہ بہ شمشیر و سنان نیز کنند

چون جہان کہنہ شود ، پاک بسوزند او را

الزام :

بہ غارت می بری سرمایۂ تسبیح خوانان را[1]

جواب :

اگر یک یوسف از زندانِ فرعونے برون آید
بہ غارت می توان دادن متاعِ کاروانے را

غالب نے اس اعتراض کے جو جواب دیے ہیں ، ان میں سے کچھ یہ ہیں :

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا ؟
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے :
انجمن بے شمع ہے ، گر برق خرمن میں نہیں

غارت گریِ سودِ غمت را نازم

خرابیم ، و رضایش در خرابی ہاے ما باشد
ز چشمِ بد نگہ دارد خدا ما دوست کامان را !

اقبال کا ایک ذو معنی شعر ہے :

فریب ِ کش مکش ِ عقل دیدنی دارد
کہ میر ِ قافلہ و ذوق ِ رہ زنی دارد[1] !

اگر 'میر ِ قافلہ' میر احمد کو سمجھا جائے ، جنہیں اقبال نے ایک اور جگہ مرشد ِ 'شاہان ِ' ولی اللہی کی رعایت سے ، 'شاہوں کا شاہ' کہا ہے ، تو یہ مولوی فضل ِ حق کی اس تہمت کا جواب ہوگا کہ جہاد کے داعی سادہ لوح مسلمانوں کو فریب دے کر ہلاک کرا رہے ہیں ، اور عقل کا فریب اس دانشور کا سمجھا جائے گا جو ان پر یہ الزام لگاتا ہے ۔ اگر 'میر ِ قافلہ' کا روئے سخن امیر خاں کی طرف ہو ، تو یہ اشارہ ہوگا 'دانایان ِ فرنگ' کے فریب میں آ کر اس کے اپنے لشکر کا خون بہانے ، اسے درہم برہم کرنے اور 'عشق کی تیغ ِ جگر دار' (یعنی سید صاحب کے ہاتھوں تربیت پائی ہوئی چیدہ فوج) ان کے حوالے کرنے کی طرف[2] :

---

[1] نقاب دار کہ آیین رہ زنی دارد
جمال ِ یوسفی و فر ِ بہمنی دارد

غالب

یہ نقاب پوش رہ زن سید صاحب ہیں ۔

[2] اقبال نے اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ، ایڈیٹر 'عبرت' کے نام ۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ کے ایک خط میں لکھا ہے :

'امیر خاں پر آپ نے خوب مضمون لکھا ۔ خدائے تعالیٰ اس کے جانشینوں کو بھی ہدایت دے کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے دست کش رہیں ۔' (''اقبال نامہ'' ، ۱ ، ۵۷)

چو می بینی کہ رہ زن کاروان کشت
چہ پرسی کاروانے را چسان کشت

مباش ایمن ازان علمے کہ خوانی
کہ از وے روحِ قومے می توان کشت

یہاں اقبال ہلاکت کا الزام مجاہدین سے ہٹا کر ایسے عالموں پر لگا رہے ہیں جو اپنا علم و فضل قوم کو 'تیغ و سپر سے بیگانہ' کرکے اس کی روح سلب کرنے پر صرف کرتے ہیں ۔

الزام : تحریک کی بے سروسامانی :

جواب :

اگرچہ عقلِ فسون پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نہ باشی ، کہ عشق تنہا نیست

'کسے کہ کشتہ نہ شد ، از قبیلۂ ما نیست'

نظیری

غم مخور ، نادان ، کہ گردون در بیابانِ کم آب
چشمہ ہا دارد' کہ شنجونے بہ سیلابے زند

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا :
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ
چڑھتی ہے جب سان پر تیغِ خودی

عزمِ ما را ز یقین پختہ ترک ساز ، کہ ما
اندرین معرکہ بے خیل و سپہ آمدہ ایم

الزام : ایک 'خوابِ پریشاں'

جواب :

عشق ازین نغمہ در بستہ بروں تاختن است

مذہبِ زندہ دلاں خوابِ پریشانے نیست :
از ہمین خاک جہانِ دگرے ساختن است

اس کا ایک پہلو شاعر کے اپنے بظاہر غیر عملی تصورات کی توجیہ اور مدافعت ہے ۔

اقبال کے کلام میں کچھ اور بھی ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غالب اور مولوی فضلِ حق کی

ہم نشینی ، یا خود غالب کے بقول ، 'ہم دسی ِ عقل ِ ذو فنون' کو اچھا نہیں سمجھتے :

خرد بیگانہ ٔ ذوق ِ یقین است
قمارِ علم و حکمت بد نشین است

یہ صرف ان کی شطرنج و گنجفہ بازی کی بنا پر نہ تھا ۔ اصل وجہ تحریک ِ جد و جہاد کے نظری اور عملی پہلوؤں کے بارے میں مولوی صاحب کا شدید شک و شبہ تھا :

عقل را سرمایہ از بیم و شک است :
عشق را عزم و یقین لا ینفک است

عقل در پیچاک ِ اسباب و علل :
عشق چوگن باز ِ میدان ِ عمل

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے ؟
و رائے عقل ہیں اہل ِ جنوں کی تدبیریں

اس معاملے میں اقبال شاہ اسماعیل کے ہم خیال تھے ، جنھوں نے غالب کے عنفوان ِ شباب میں انھیں مولوی فضل ِ حق کے اثر سے چھڑانے اور اپنی تحریک میں کھینچنے کی پوری کوشش کی ۔ اس کی روداد دونوں کی تحریروں میں اشارةً و کنایتہً موجود ہے ۔ شاہ صاحب کی اس تبلیغی کاوش کی گونج اقبال کے ان شعروں میں

سنی جا سکتی ہے :

نشانِ راہ ز عقلِ ہزار حیلہ مپرس :
بیا ، کہ عشق کمالے ز یک فنی دارد

نہ رسد فسون گریِ خرد بہ تپیدنِ دلِ زندۂ
ز کنشتِ فلسفیاں در آ بہ حریمِ سوز و گدازِ من

این کارِ حکیمے نیست : دامانِ کلیمے گیر

شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش
حذر ز بیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست !

بگذر از عقل ، و در آمیز بہ موجِ یمِ عشق
کہ دران جوے تنک مایہ گہر پیدا نیست

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں :
راہ بر ہو ظن و تخمیں ، تو زبوں کارِ حیات

عشق اور عقل کے باب میں اپنے تصورات کی تشکیل میں اقبال نے شاہ اسماعیل اور مولوی فضلِ حق کی متضاد اور متحارب

راہ و روشِ فکر کو مدِ نظر رکھا ہے ۔ غالب کی طرح ، انھوں نے بھی مولوی صاحب کو افلاطون اور رازی کا نام دے کر مجرد اور نظری علم و فراست کی عمومی اور 'عقلِ ہزار حیلہ' اور 'عقل کی روباہی' کی خصوصی علامت بنایا ہے، اور جہاد کی مخالفت کی بنا پر ان کے مسلک پر بڑے تند و تیز حملے کیے ہیں :

گرچہ شاہینِ خرد برسرِ پروازے ہست
اندرین بادیہ پنہاں قدراندازے ہست

من این علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

بہ زورِ بازوے حیدر بدہ ادراکِ رازی را

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی :
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیِ ادراک

بر عقلِ فلک پیما ترکانہ شبیخوں بہ :
یک ذرۂ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ

مُرد چون شمعِ خودی اندر وجود
از خیالِ آسمان پیما چہ سود ؟

اقبال نے 'حرفِ رازی' کو 'زوالِ عشق و مستی' اور 'کلیمی' کو 'نامسلمانی خودی کی' کہا ہے۔ حکمت پر 'نامسلمانی' کا ٹھپا لگانا اور عقل کو 'زناری' کہنا اس رعایت سے بھی تھا کہ مولوی صاحب 'شبخونِ دلِ زناریاں' کے مخالف تھے، اور شاہ اسماعیل ان کی مصلحت پر مبنی دلیلوں کی کاٹ کرتے رہتے تھے:

زمان زمان شکند انچہ می تراشد عقل:
بیا، کہ عشق مسلمان و عقل زناری ست

عقل کی تکفیر کی ایک بنا یہ، اور دوسری مغربی تعلیم کے وہ اثرات اور مظاہر ہیں جنہیں اقبال غیر اسلامی یا غیر انسانی سمجھتے ہیں:

مکدر کرد مغرب چشمہ ہاے علم و عرفان را

مولوی صاحب کے علی الرغم، اقبال نے بھی، غالب کی طرح، سید صاحب اور شاہ صاحب اور ان کی 'تہِ خرقہ زرہ پوش'

---

۱ مومن نے اسی بنا پر کہا ہے:

مومن دیں دار نے کی بت پرستی اختیار:
ایک شیخِ وقت تھا، سو بھی برہمن ہو گیا

اس شعر میں غالب کی نظر میں وہ بھی تھے:

آیینِ برہمن بہ نہایت رسانده ایم:
غالب، بنا ں شیوۂ آزر کنم طرح

جماعت کو 'ہنگامہ' عشق' 'خون ریزی عشق' اور 'مرگ با شرف' کی 'یک رنگی و آزادی' کا جیتا جاگتا نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ جس 'دہر آشوب' و 'آزاد و ناصبور و جسور' عشق کی انھیں علامت بنایا گیا ہے ، اس کی 'گرمی سے ہے معرکہ' کاینات' :

لا کھ حکیم سر بہ جیب : ایک کلیم سر بہ کف

خود اقبال ایسی 'مرگ با شرف' کے کتنے آرزو مند تھے، اس کا اندازہ اس معنی خیز واقعے سے ہو جائے گا :

'آخری علالت کے دوران میں اقبال کو کچھ حلق کی تکلیف تھی ، کچھ درد کی ؛ اس حالت میں بار بار 'یا اللہ' کہتے - ایک مرتبہ بڑی دل سوزی کے لہجے میں فرمایا :

'مجھے صحت ہو جائے تو جہاد بالسیف کروں -'

(حکیم) قرشی صاحب نے کہا :

'آپ نے جو کچھ کیا ہے ، وہ جہاد بالسیف سے کم تو نہیں - یہ تو صرف مخالفین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ آپ نے کچھ نہیں کیا - ہم ان کے کہنے کو مطلقاً خاطر میں لاتے - آپ کی بے عملی ہزار عمل سے بہتر ہے -'

(سید نذیر نیازی : ''اقبال کے حضور'' ۲۸۲)

مگر اپنی بے عملی کا کانٹا آخر دم تک ان کے دل میں

کھٹکتا رہا ، اور ان کی آنکھیں کسی 'مردِ مجاہد' کو ڈھونڈتی رہیں :

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق :
افکار میں سرمست : نہ خوابیدہ ، نہ بیدار

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار

آن کہ شبخون بہ دل و دیدۂ دانایان ریخت
پیشِ نادان سپر انداختنش را نگرید !

یہ اشارہ ہے شاہ اسماعیل کے ، اپنی تمام علمی فضیلت اور قوتِ بحث و جدال کے با وصف ، رسمی علوم سے عاری سید صاحب کے گرویدہ اور حلقہ بگوش بننے کی طرف - اسی 'نادان' کے کمالات کی شان میں یہ اشعار بھی ہیں ، جن میں مولوی فضلِ حق جیسے حکمت کے پتلوں پر ایک 'بوئے اسد اللہی' رکھنے والے مردِ فقیر کی برتری جتای گیی ہے :

دو صد بو حامد و رازی نیرزد
بہ نادانے کہ راہ بین است

حکیمان را بہا کم تر نہادند :
بہ نادان جلوۂ مستانہ دادند

چہ خوش بختے ، چہ خرم روزگارے !
درِ سلطان بہ درویشے کشادند

(چو بہ کمال می رسد ، فقر دلیلِ خسروی ست)

اس جلوے کی ولولہ انگیزی اقبال نے بڑے ہیجان آور انداز میں بیان کی ہے :

چہ جلوہ ایست ، کہ دل ہا بہ لذتِ نگہے
ز خاکِ راہ ، مثالِ شرارہ ، بر جستند !

غلامِ ہمتِ بیدارِ آن سوارانم
ستارہ را بہ سنان سفتہ ، در گرہ بستند

یہ 'ستارہ' شاہ اسماعیل ہیں جنھیں سید صاحب نے مسخر کیا ۔ ان 'جلوہ مستوں' کے کارواں کے جرس کا شور آخر دم تک اقبال کے قلب و ضمیر میں گونجتا رہا :

مپرس از کاروانِ جلوہ مستان
ز اسبابِ جہان بر کندہ دستان

بہ جانِ شان ز آوازِ جرس شور
چو از موجِ نسیمے در نیستان !

یہ وہی کارواں ہے جس کا قافلہ سالار حجاز سے ضمیر کائنات میں ایک 'طرحِ نو' کا درسِ فکر و عمل لے کر لوٹا :

خضرِ وقت[1] از خلوتِ دشتِ حجاز آید برون :
کارواں زین وادیِ دور و دراز آید برون

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید برون

طرحِ نو می افگند اندر ضمیرِ کائنات
نالہ ہا کز سینۂ اہلِ نیاز آید برون

من بہ سیمائے غلاماں فرِ سلطان دیدہ ام
شعلۂ محمود از خاکِ ایاز آید برون

یہاں اقبال نے مجاہدین کی اور اپنی آواز ایک کر دی ہے ۔

سید صاحب ، سرسید اور اقبال :

سید نذیر نیازی نے ، جو اقبال کے آخری زمانے کے ایک محتاط راوی ہیں ، ان سے یہ بیان منسوب کیا ہے :

''جاوید نامہ'' میں بہت سی باتوں کا ذکر رہ گیا ۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ سید احمد (رائے) بریلوی اور سید احمد دہلوی

---

[1] خضرِ وقتے کُو کہ تعمیرِ خرابی ہا کند
زان کہ گنجے ہست پنہاں در تہِ دیوارِ ما ؟
نظیری

کی روحوں کو بھی اس میں جمع کر دوں ، لیکن خیال نہ رہا ۔'
''اقبال کے حضور'' ، ۶۴

سید احمد دہلوی کے بعض خیالات اقبال نے ایک ابتدای اردو نظم میں بیان کیے ہیں ، اور نیازی صاحب کے بقول ، ان کی نسبت ایک موقع پر انھوں نے یہ راے ظاہر کی :

'سرسید کے خیالات ، اور ان کے ماتحت انھوں نے جو اقدامات کیے، وہ تنقید سے بالا تر نہیں ۔ ان میں گفتگو کی گنجایش ہے ، لیکن یہ اقدامات ضروری تھے ۔ حالات کا تقاضا تھا کہ ایسا کوی اقدام کیا جاتا جس سے مسلمانوں کی توجہ وقت کے تقاضوں اور مستقبل کی طرف منعطف ہوتی ۔ سرسید کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے یہ اقدام کیا ۔ یہ اقدام بہر حال ضروری تھا'۔ ۲۸۵

بعض عقاید اور رسم و رواج کے بارے میں تو یہ دونوں بزرگ ایک سے یا ملتے جلتے خیالات رکھتے تھے ، مگر جدو جہاد کے باب میں دونوں کے فکر و عمل کی راہیں بالکل الگ تھیں ۔ یہ بات تو بعید از قیاس نہیں کہ دونوں کی روحوں کو جمع کرنے کی غرض ان کے بعض بنیادی تصورات پر باہمی مکالمہ یا 'محاورہ' کرانا ، یا براہِ راست ان کے مسالک کی ترجمانی کرنا ہو ۔ یہ طریقہ اقبال نے بعض اربابِ فن و دانش کے خیالات کی تفسیر و تشریح کے لیے استعمال کیا ہے

مگر یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ان کی نیت دونوں کے مسالک میں ، اتصال چھوڑ ، مفاہمت کا کوی پہلو نکالنا تھی - مختلف تاریخی صورتِ حال اور دوسرے عوامل کے تحت دونوں کے سیاسی اندازِ فکر میں کوی قدرِ مشترک نہ تھی ، اور اس کے عملی مضمنات میں کم و بیش وہی تفاوت تھا جو سید صاحب اور مولوی فضلِ حق کی ابتدای روش میں تھا - مولوی صاحب کے فکری اور سیاسی نظریات کے بارے میں اقبال نے اپنے تاثرات بڑے شد و مد سے ظاہر کر دیے ہیں - غور طلب بات یہ ہے کہ اگر انھیں ''جاوید نامہ'' کے دورِ پختگی میں سید احمد دہلوی کا ذکر کرنا یاد رہتا تو وہ اسے کس صورت میں کرتے - رہے دوسرے سید احمد ، تو اس باب کے آخر میں یہ انتہای وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تحریک اقبال کی شاعری کے ترکیبی موثرات میں شامل ہے -

ماخذ

ناقدوں کے حوالے اشاریہ میں ملیں گے

شاعر

آتش — کلیات (نول کشور، ۱۹۲۹)

اقبال — اسرارِ خودی (۱۹۱۵) : رموزِ بیخودی (۱۹۱۸) : پیامِ مشرق (۱۹۲۳) : بانگِ درا (۱۹۲۴) : بالِ جبریل (۱۹۳۵) : زبورِ عجم (۱۹۲۷) : جاوید نامہ (۱۹۳۲) : پس چہ باید کرد (۱۹۳۶) : مسافر (۱۹۳۶) : ضربِ کلیم (۱۹۳۷) : ارمغانِ حجاز (۱۹۳۸)

ذوق — دیوان، مرتبہ محمد حسین آزاد (لاہور، ۱۹۳۲)
کلیات، دو جلد، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی (لاہور، ۱۹۶۷)

شیفتہ و حسرتی — کلیات (نظامی پریس بدایون ۱۹۱۶)

غالب — نو دریافت بیاضِ غالب (نقوش، غالب نمبر (لاہور، ۱۹۶۹)
نسخۂ حمیدیہ، مرتبہ حمید احمد خاں (لاہور، ۱۹۶۹)
غالب کا منسوخ دیوان، مرتبہ مسلم ضیای (کراچی، ۱۹۶۹)
دیوانِ غالب اردو مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی (علی گڑھ، ۱۹۵۸)
دیوان غالب، مرتبہ حامد علی خاں (لاہور، ۱۹۶۹)
غزلیاتِ فارسی، مرتبہ سید وزیرالحسن عابدی (لاہور، ۱۹۶۹)

غزلیاتِ فارسی (تحقیقی نسخہ) ، مرتبہ سید وزیرالحسن عابدی (لاہور ، ۱۹٦۹)
قصاید و مثنویاتِ فارسی ، مرتبہ غلام رسول مہر (لاہور ، ۱۹٦۹)
قطعات ، رباعیات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مخمس ، مرتبہ غلام رسول مہر (لاہور ، ۱۹٦۹)
سبد چین ، مرتبہ سید وزیرالحسن عابدی (لاہور ، ۱۹٦۹)
پنج آہنگ ، مرتبہ سید وزیرالحسن عابدی (لاہور ، ۱۹٦۹)
مہرِ نیمروز ، مرتبہ عبدالشکور احسن (لاہور ، ۱۹٦۹)
خطوطِ غالب کامل ، مرتبہ غلام رسول مہر (لاہور ، ۱۹٦۲)
مجموعہ نثرِ غالب ، مرتبہ خلیل الرحمن داودی (لاہور ، ۱۹٦۷)

مومن — دیوان ، مرتبہ ضیاء احمد (الہ آباد ، ۱۹۳۷)
کلیات ، حصہ دوم ، مرتبہ کلب علی خاں فائق (لاہور ، ۱۹٦۰)
مجموعہ قصاید ، مرتبہ ضیا احمد (لکھنؤ ، ۱۹۲۵)
کلامِ فارسی ، قلمی (شیفتہ کلکشن ، علی گڑھ)

ناسخ — کلیات (نول کشور)

محرکینِ جہاد کی تحریریں

سید احمد شہید : مکتوبات (نفیس اکیڈمی ، کراچی)
شاہ اسماعیل شہید : تقویتہ الایمان
منصبِ امامت (آئینہ ادب ، لاہور)
بالضیاح الحق الصریح فی احکام المیت و الضریح (کتب خانہ اشرفیہ ، دہلی)
عبقات ، مترجمہ مناظر احسن گیلانی (حیدرآباد ، دکن)

سوانح

سید احمد خان: آثار الصنادید
محمد جعفر تھانیسری : تواریخِ عجیبہ یا سوانح احمدی
مختلف راوی : ارواحِ ثلاثہ (تیسرا ایڈیشن)
میرزا حیرت دہلوی: حیاتِ طیبہ
غلام رسول مہر: سید احمد شہید (لاہور ۱۹۵۲ء)
سید ابوالحسن علی : سیرتِ سید احمد شہید ، حصہ اول (لاہور، ۱۹۵۸ء)
عبدالشاہد خان شیروانی : باغی ہندوستان (بجنور ، ۱۹۴۷ء)

امیر خاں اور انگریز

سعید احمد اسعد (مترجم) : امیر نامہ اردو (۱۲۹۳)
مارکویس آف ہیسٹنگز کا ذاتی روز نامچہ ، دوسرا ایڈیشن (۱۸۵۸)
میجر جنرل سرجان مالکم : وسطی ہند کی یاد داشتیں ، جلد ۱ (۱۸۲۳)
ہندوستان کی سیاسی تاریخ ، جلد ۲ (۱۸۲۶)
ہنری ٹی پرنسپ : ہندوستان میں سیاسی اور فوجی کاروائیوں کی تاریخ
۱۸۱۳ - ۱۸۲۳ (۱۸۲۵ء)
جے بیلی فریزر : لیفٹننٹ کرنل جیمز سکنر کے فوجی سوانح ، جلد ۲
(۱۸۵۱)
آی ڈبلیو کے : سوانح و مراسلات چارلز ، لارڈ مٹکاف ، جلد ۱ (۱۸۵۸)
سی یو ایچیسن: صلح نامے ، معاہدے اور سندیں ، جلد ۳ (۱۸۶۲)

اشاریہ

ف

ق

ک

گ

م

تصحیح

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴ نوٹ	۸	قدر یار	قدرِ یار
۸ نوٹ	۲	رعایت ہے	رعایت سے
۱۱	۱۵	خلاو	خلاف
۱۳	۴	باس	پاس
۱۵	۵	اواے پرفنش	اداے پرفنش
۱۷	۱	عیقدت مند	عقیدت مند
۲۱	۵	مہا ہوا	بجھا ہوا
۴۳ نوٹ	۵	تیغ و دوم	تیغِ دودم
۵۵	۶	ازچہ	ارچہ
۵۹	۱۴	گزر افتد	گزار افتد
۶۴	۱	بھڑ جاتا	بھڑ جانا
۷۵	۱	کوہ و کن	کوہ کن
۱۳۸	۱	بحریک	تحریک
۱۵۰	۱۳	شوخیِ بخت	شومیِ بخت
۱۵۳	۵	ہے	ہے
۱۵۹	۲	اس ناوک	اس کے ناوک

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۰۹	۱	آزر فشانی	آذر فشانی
۲۰۹	۴/۷		

اس شعر کے مصرعوں کی صحیح ترتیب یوں ہے:

از آتشِ لہراسپ نشان می دہد امروز
سوزے کہ بہ خاکم ز تو در عظمِ رمیم است

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۱۳ نوٹ ۱		ہیں	میں
۲۱۳ نوٹ ۲	۲	نخچھیر	نخچیر
۲۱۴	۱۶-۱۳		یہ سطور ۲۱۵ کے نوٹ ۱ کا دوسرا حصہ ہیں
۲۱۷	۱۱-۱۰	یہ شعر ۲۱۶ پر غالب کے اشعار کے بعد ہونا چاہیے	
۲۲۴	۱۲-۱		یہ اشعار غالب کے ہیں
۲۳۰	۳	سید صاحب کا امیر خاں کے فریب میں آنا	غالب پر شاہ صاحب کی 'دل فریبی' کا انکشاف
۲۳۴	۵-۱		یہ اشعار آتش کے ہیں
۲۳۵			آخر تک اشعار آتش کے ہیں
۲۷۸	۱۸	بالا استعاب	بالاستعیاب
۳۰۶ نوٹ	۱	نہ مند	نہ فتد

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۱۰ نوٹ			یہاں میر کا یہ مصرع نقل ہونے سے رہ گیا اے عشق ، تیرے آگ لگانے کو عشق ہے!
۳۱۹ نوٹ	آخری	ابوعلی	ابوالاعلی
۳۲۷	۹	قابل	قایل
۳۳۰	۱۶	روومو کی ہے	رو و مو کی ہے
۳۳۰		آزرفشانم	آذر فشانم
۳۳۰	۱۱	پہ	بہ
۳۳۳	۲/۷	نوٹ کا نشان سطر ۷ کی بجائے سطر ۲ پر ہونا چاہیے	
۳۵۶	۳	پروازِ گلستان	پردازِ گلستاں
۳۵۶	۷	درام	دارم
۳۶۱	۵	آب دار است	آب دار تر است
۳۶۲	۳	داغِ تو	داغِ عشقِ تو
۳۷۰	۵		یہ مصرع پچھلے عنوان سے متعلق ہے
۳۷۴	۷	مینا ہے	مینائے
۳۸۰	۱-۵	ان اشعار کی جگہ صفحہ ۳۸۱ کے آخر میں ہے	
۳۹۰	۹	تابِ وحشت نبود	تابِ وحشت نبودم
۳۹۲	۵	خط	خطر
۳۹۹	۷	کاروای	کار روای
۴۰۲	۸	می نادو	می نازد
۴۱۴	۲	لذت ایجاز از	لذتِ ایجادِ ناز

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۲۶ نوٹ	۱	آخر نہ بود ایم	آخر نہ بودہ ایم
۴۲۸	۱۲	آوار درا	آوازِ درا
۴۳۲	۲	بادل خستگان	با خستگان
۴۳۸ نوٹ	۴	قیصر منعمان	قصرِ منعمان
۴۴۳	۱۱	'موجِ شراب' کا ذیلی عنوان ۴۳۱ کے شروع میں 'مے' کے عنوان سے پہلے ہونا چاہیے	
۴۵۹	۱۶	اثر اندزو	اثر اندوز
۴۹۷	۸	زیر قہرِ نگاہ	زیرِ قہرِ نگاہ
۵۰۰	۲	بھرائے	بھرہ اے
۵۰۱	۵	بہارِ دہر دہر	بہارِ دہر
۵۰۸	۱۴	یاد	باد
۵۲۸	۱۳	'امیر خسر' دہلوی	''امیر خسرو دہلوی''
۵۲۹	۸	جزمن	خرمن
۵۴۳	۹	غ : مدتے شد کہ ز آبلہ پائے نہ گذشت ص : مدتے شد کہ زدشت آبلہ پائے نہ گذشت	
۵۵۹ نوٹ	۴	توگو	توگوی
۵۶۰	۱۱	بسونِ لالہ زار	بسانِ لالہ زار
۵۹۲	۸	دردنی	درونی
۵۹۴	۹	ضنم	صنم
۵۹۵	۱۰	نخشش	بخشش
۵۹۶	۸	ققر	فقر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۰۷	۱	دو	اردو
۶۱۰	۱۲	سینۂ آزری	سینۂ آذری
۶۱۰	آخری	نظم و نثرِ تو	ز نظم و نثرِ تو
۶۱۱	۹	زسرِ تفرقۂ جمع	ز سرِ تفرقہ و جمع
۶۱۱	۱۰	سیرِ نفس و آفاق	ز سیرِ انفس و آفاق
۶۱۱	۱۳	محفلے	محفلے
۶۳۳ نوٹ	۲	علومِ عقلیہ و تقلیہ	علوم عقلیہ و نقلیہ
۶۳۴	۹	دنیات	دینیات
۶۴۲	۱	ہنے	اپنے
۶۴۶ نوٹ		زایل اعجازِ جنوں ہے	زایل اعجازِ جنوں سے
۶۵۹		نقص امن	نقضِ امن
۶۶۳	آخری	کر سکتا	کر سکتا
۶۷۲	۱	بازی ردِ خودِ فریب	بازی خورِ فریب
۶۷۲	۱۴	نحرارِ خویش	غریوِ خویش
۷۱۴ نوٹ	۱۰	؟	،
۷۱۶	۳	ایمنیم	امینیم
۷۱۶	۱۲	لززد	لرزد
۷۱۶	۱۳	غ : او جنون می افگند سوے سپہر ص : از جنون می افگند ہوے بہ شہر	
۷۱۸	۱	آپ	اب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۴۳			اس اقتباس کا حوالہ حاشیے پر درج ہونے سے رہ گیا عبدالشاہد خاں شروانی : ''باغی ہندوستان''
۷۵۲	۱	کلیمی	حکیمی
۷۵۲	۱۲		یہاں 'مرگِ باشرف' اور اقبال کا ذیلی عنوان درج ہونے سے رہ گیا